آزادی سے قبل جدید اُردو نظم کا سماجیاتی مطالعہ

پروفیسر ڈاکٹر ممتاز جہاں صدیقی

آزادی سے قبل

جدید اُردو نظم کا سماجیاتی مطالعہ

از

پروفیسر ڈاکٹر ممتاز جہاں صدیقی

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

© جملہ حقوق بحق مصنفہ محفوظ

AZAADI SE QABAL
JADEED URDU NAZM KA SAMAJYATI MUTALEA
by
Prof. Dr. Mumtaz Jahan Siddiqui

Year of Edition 2017
ISBN 978-93-86624-39-0
Price Rs. 250/-

نام کتاب : آزادی سے قبل جدید اُردو نظم کا سماجیاتی مطالعہ
مصنفہ : پروفیسر ڈاکٹر ممتاز جہاں صدیقی
سنہ اشاعت : ۲۰۱۷ء
قیمت : ۲۵۰ روپے
مطبع : روشان پرنٹرس، دہلی۔۶

Published by
EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
3191,Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6(INDIA)
Ph : 23216162, 23214465, Fax : 0091-11-23211540
E-mail: info@ephbooks.com,ephindia@gmail.com
website: www.ephbooks.com

انتساب

میرے اپنے والد عبدالغنی صاحب اور والدہ بسم اللہ بی

کے نام

جن کی شفقت اپنائیت اور محبت نے

مجھے زندگی کی سنگلاخ زمینوں پر

چلنے کا سلیقہ سکھایا

اُن کے بے لوث اور پاکیزہ طرزِ عمل نے

مجھ میں بے پناہ خود اعتمادی

اور

ثابت قدمی کا جذبہ پیدا کیا

انہی کے نام منسوب

پروفیسر ڈاکٹر ممتاز جہاں صدیقی

فہرست

پیش لفظ

انسانی زندگی جن حالات اور نشیب و فراز سے گذرتی ہے اس کا اثر شعر و ادب پر بھی پڑتا ہے۔ اس لئے ہر دور کی شاعری اپنا تاریخی اور زمانی پس منظر رکھتی ہے۔ معاشرے میں جب بھی کوئی تبدیلی رونما ہوتی ہے۔ تو ایک حساس تخلیق کار اُسے اپنی تخلیق کا موضوع بناتا ہے۔ شاعری فرد اور سماج کے درمیان ایک گہرا رشتہ ہوتا ہے۔ اسی طرح ، ماضی، حال اور مستقبل میں بھی ایک داخلی ربط ہوتا ہے۔ اور وہ ایکدوسرے کو متاثر بھی کرتے ہیں اور اثر انداز بھی ہوتے ہیں۔ کیونکہ ماضی کی تابناک کرنیں (اقدار اور روایات) ہی مستقبل کو سمت و رفتار عطا کرتے ہیں۔ جہاں سے مستقبل کے لئے راہ ہموار کی جاسکتی ہے۔

بقول ڈاکٹر ابواللیث صدیقی

”عصر حاضر کا کوئی نقش بظاہر کتنا ہی اچھوتا، نرالا نیا کیوں نہ ہو
اُس کی تہہ میں ماضی کے خطوط پنہاں ہوتے ہیں ....
چراغ سے چراغ جلتا ہے۔ تجربے سے تجربہ حاصل ہوتا ہے۔“[1]

شاعر یا ادیب بھی معاشرے کا پروردہ ہوتا ہے۔ اُس کے گرد و پیش کے حالات، واقعات اور سانحات سے متاثر ہو کر وہ اُسے الفاظ کے پیکر میں ڈھال کر عوام کے سامنے پیش کر دیتا ہے۔ جسے پڑھ کر اس کا قاری متاثر بھی ہوتا ہے اور وقت ضرورت اس پر تنقید و تبصرہ بھی کرتا ہے۔

اُردو زبان کی شاعری کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات سامنے آجاتی ہے کہ اُردو ادب کی ابتداء شاعری سے ہوئی۔ شاعری میں نظم، کو نمایاں مقام حاصل رہا ہے۔ کبھی وہ مثنوی، قصیدہ،

۱۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی تجربہ اور روایات ص نمبر ۵

مرثیہ، شہر آشوب وغیرہ کے نام سے جانی جاتی رہی۔ لیکن ۱۸۵۷ء کے بعد نظم اپنی علحیدہ شناخت تسلیم کرانے میں کامیاب نظر آتی ہے۔ خاص طور پر جب انجمن پنجاب کے مشاعروں کی داغ بیل پڑی۔ اور موضوعاتی مشاعروں کو اہمیت حاصل ہونے لگی۔

۱۸۵۷ء کے بعد نظم میں جن موضوعات کو بیان کیا جانے لگا وہ سماجی اور اجتماعی نوعیت کے تھے۔ جو خارجی واقعات اور حالات پر مشتمل ہوا کرتے تھے۔ اس لئے نظم کی اہمیت اور افادیت میں مزید اضافہ ہی ہوا۔ محمد حُسین آزاد، الطاف حُسین حالؔی وغیرہ نے اُسے زیادہ اہم بنادیا۔ انہوں نے اپنی موضوعاتی نظموں میں سماج اور سماجی مسائل کو ضروریات کے مطابق اپنی نظموں کے موضوع بنائے۔ یہی نظمیں بعد میں جدید نظم کے نام سے موسوم ہوئیں۔

جدید نظم کا شعور اپنے عہد اور عصری حیثیت اور بصیرت کے ساتھ متعارف ہوا۔ اس کے فروغ میں نئی تعلیم، اصلاحی تحریکوں اور ۱۸۵۷ء کے بعد ابھرنے والی نئی سوچ و فکر کار فرما تھی۔ اور تقریباً ۱۵۰ سال سے یہ سفر جاری ہے۔ لیکن نظم جدید نے جن سماجی مسائل کو بیان کیا سماج کو متاثر کیا اور جن کی وجہ سے سماج میں تبدیلی رونما ہوئی اس پر غور وفکر کرنے کے بعد ہی میرے ذہن میں یہ خیال پیدا ہوا کہ جدید نظم کا سماجیاتی طور پر جائزہ لیا جائے۔ کیونکہ ادب بھی ایک سماجی دستاویز ہے اور ادبی دستاویز کے بغیر سماج کا مطالعہ کرنے والا کوئی بھی فرد سماجی تکمیلیت سے محروم ہی رہے گا اس غرض سے میں نے ”آزادی سے قبل جدید اُردو نظم نگاری کا سماجیاتی مطالعہ“ اس عنوان پر تحقیقی کام کرنے کا بیڑہ اٹھایا۔ اور حتی الامکان یہی کوشش کی کہ جدید نظم نگاری سے متعلق مواد سے بحث کی جائے۔

اس تحقیقی مقالے کو درج ذیل پانچ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔۔ باب اوّل میں اُردو نظم کے فکری پس منظر پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ کیونکہ ہر شاعر اپنے عہد کا سماجی اداروں، معاشرتی اور تہذیبی اقدار کا پروردہ ہوتا ہے۔ وہ اپنی تخلیقات کا خام مواد بھی سماجی حالات سے ہی اخذ کرتا ہے۔ وہ سماج کو بدلنے اور اس کی بہتر تشکیل میں معاون و مددگار ثابت ہوتا ہے۔ وہ اپنی تخلیقات کے ذریعہ نیا شعور پیدا کرتا ہے۔ روح کو بیدار اور اخلاق کی اصلاح کرنے کی تلقین بھی کرتا ہے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان کی سماجی، معاشی اور سیاسی زندگی میں تبدیلی پیدا ہو چکی تھی۔ خاص طور سے مسلمانوں میں دو طرح کے لوگ موجود تھے ایک انگریزی حکومت سے ناراض تھے اور

دوسرے انگریزوں سے اچھے تعلقات بنانے کے لئے کوشاں افراد تھے۔ ثانی الذکر لوگوں کا ماننا تھا کہ وقت کا یہ تقاضہ ہے کہ سماج کو ترقی کی راہ پر لے جانا ہے تو اقتدار اور حکومت کے ساتھ تعاون ضروری ہے۔ اور انگریزی تعلیم حاصل کر کے ہی اقتدار میں شامل ہوا جا سکتا ہے۔ اس بات کو سر سیّد نے محسوس کیا اور اپنی قوم میں اس احساس کو عام کرنے کی تحریک چلائی۔ انگریزی تعلیم اور انگریزی ادب سے شناسائی نے اُردو ادب کو بھی متاثر کیا۔ مولانا محمد حُسین آزاد اور حالی نے اُردو شاعری کو جدّت سے روشناس کرایا اور دھیرے دھیرے یہ تحریک اُردو نظم نگاری کی تحریک بن گئی۔

ہندوستانی سماج میں بالخصوص مسلمانوں میں انگریزی حکومت کے خلاف ردّ عمل بھی جاری رہا۔ معاشی بحران اور تہذیبی اقدار کے مٹنے کا احساس شدت اختیار کرنے لگا۔ سماجی حالات تبدیل ہو رہے تھے۔ غلامی سے نجات حاصل کرنے کی جدوجہد زور پکڑنے لگی تھی۔ اخلاقی تنزل کے اصلاح کی کوشش بھی جاری تھی۔ انہی حالات نے جدید نظم نگاری کے لئے ماحول تیار کیا اس پس منظر میں جدید نظم نگاری کے آغاز و ارتقاء پر تحقیقی نظر ڈالی گئی ہے۔

باب دوّم میں آزادی سے قبل کے سیاسی سماجی اور ثقافتی حالات کا جائزہ لیا گیا ہے۔

یہ بات تو سبھی جانتے ہیں کہ ہندوستان کی قدیم تاریخ بادشاہوں، شہنشاہوں، امیروں، نوابوں کی حکمرانی سے بھری پڑی ہے۔ وقت حالات کے ساتھ ان حکومتوں کے عروج و زوال کی داستانیں بھی زبان زد ہر عام و خاص ہے جیسے جیسے حالات بدلتے گئے سوچ اور فکر میں تبدیلی آئی نئے معاشرے اور مسائل نے عوام کو متاثر کیا۔ ۱۸۵۷ء تک آتے آتے ہندوستان کے سیاسی، سماجی اور ثقافتی حالات میں زمین و آسمان کا فرق آ چکا تھا جنگِ پلاسی سے شروع ہونے والی انگریزی حکمرانی ۱۸۵۷ء کے بعد مستحکم ہو چکی تھی۔ انیسویں صدی کے آغاز سے ملک کی سیاست نے زبان و ادب کو متاثر کرنا شروع کر دیا تھا۔ تعلیمی اور سماجی اصلاحی تحریکیں سر ابھار رہی تھیں۔ سیاسی طور پر انگریزوں کا غلبہ تھا۔ جو ہندوستانی عوام پر طرح طرح کے مظالم ڈھا رہے تھے۔ ساتھ ہی ایک کے بعد دیگرے دیسی ریاستوں کو انگریزی حکومت میں شامل کر رہے تھے ہندوستان میں سیاسی عدم استحکام اور انتشار کی کیفیت طاری تھی فوجی بغاوت ہو رہی تھی تو کہیں اس بغاوت کو دبانے کے لئے ظلم و زیادتیوں کا راج تھا ہندوستانی عوام انگریزوں کے خلاف صف آرا ہو رہی تھیں سیاسی سازشیں رچی جا رہی تھیں۔ انگریز افسروں کی بے حرمتی کی جا رہی تھی تو اس سے نپٹنے کے لئے

انگریزوں نے پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو کی پالیسی اپنائی نسلی امتیاز کو بڑھاوا دیا۔ اور ہندو مسلمانوں میں نفاق پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک جو سماجی سیاسی اور ثقافتی حالات پیدا ہوئے جن مسائل نے سر ابھارا۔ اُس کا اثر اُردو نظم پر پڑا۔ اُردو نظم نگاری ان مسائل کو کہاں تک بیان کر پائی اس کا تجزیہ کیا گیا ہے۔

باب سوّم میں نظم کے معنی مفہوم اور فن سے بحث کی گئی ہے۔ اور شاعری کے ذکر کے ساتھ ہی مختلف اصناف شاعری کا تصور ابھرتا ہے۔ شاعری کے ساتھ ہی نظم کا لفظ یا نظم کی اصطلاح زبان پر آجاتی ہے جن پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ شعر کے لئے اس اصطلاح کا استعمال زمانے قدیم سے ہوتا چلا آرہا ہے۔ لیکن بعد میں ایک مخصوص صنف کے لئے اس کا استعمال ہونے لگا۔ نظم کے مفہوم سے متعلق تاریخی چھان بین کی جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ نظم فارسی زبان سے اُردو میں آئی اس کے لغوی معنی پرونا، ضبط میں لانا وغیرہ کے ہیں۔ اس کے علاوہ نظم کے معنی موزوں کرنا یا کسی چیز کو کسی چیز سے جوڑنے وغیرہ کے مفہوم میں بھی استعمال ہوتے ہیں۔ اگر لغت پر نظر ڈالی جائے تو سب سے پہلے مستند اُردو لغت فرہنگ آصفیہ میں اس لفظ کے معنی پرونا، موتیوں کو تاگے میں پرونا، لڑی، سلک، انتظام بندوبست وغیرہ کے ہیں۔ نظم عربی زبان کا لفظ ہے۔ اُردو میں کلام موزوں کے لغوی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ نظم نگاری کو با قاعدہ تحریک کے طور پر رائج کرنے میں محمد حسین آزاد کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔ حالی اور شبلی نے اُسے مزید بلندی عطا کی۔ اسمٰعیل میرٹھی چکبست اور اقبال نے اُسے عروج کی انتہائی بلندی پر پہونچایا اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔

نظم کا مفہوم دراصل خیال، لاشعوری محرکات، اسلوب وغیرہ سے ممیّز ہے۔ صحیح معنوں میں یہ تسلسل کا عمل ہے جو اپنے موضوع سے بحث کرتا ہے۔ دھیرے دھیرے نظم نگاری کے اصول وضوابط فنی لوازم اور موضوعات میں اضافہ ہوتا گیا۔ ۱۹۳۶ء کے بعد ترقی پسند تحریک نے جدید نظم نگاری کو جلا بخشی اور وہ اپنی علحیدہ شناخت بنانے میں کامیاب رہی اس باب میں نظم کا مفہوم فن اور ارتقاء سے متعلق بحث کی گئی ہے۔ باب چہارم میں اُردو نظم کے موضوعات کا جائزہ لیا گیا ہے۔

ہر ادب اپنے سماج و معاشرے کا پروردہ ہوتا ہے۔ نظم بھی اپنے وقت کے سماجی حالات

کی پیداوار ہے۔ سماجی ضرورتیں اور مسائل کو عوام کے سامنے لانے انہیں بیدار کرنے کا کام شاعروں اور ادیبوں نے کیا ہے۔ ہر دور کی شاعری میں مخصوص موضوعات بیان ہوئے ہیں۔ حکمرانوں کی تعریف میں قصیدے لکھے گئے مذہبی تقدس کے پیشِ نظر مرثیے نے فروغ پایا۔ سماجی ناانصافی اور انتشار نے شہر آشوب کو جنم دیا اور امیروں کی عیش کوشیوں نے غزل کی زلفوں کو سنوارا۔

انیسویں صدی کی فضاء اور حالات نے جدید نظم کی ابتداء کی اور فنی نزاکتوں کے ذریعہ اپنی شناخت بنائی۔ اس دور کے موضوعات نظم میں در آئے اس دور کی نظم کے موضوعات میں معاشرتی مسائل، قدرتی مناظر کی عکاسی، فطری جذبے، حب الوطنی، ہمدردی، تعلیم کی اہمیت، معاشی مسائل، آزادی کا جذبہ، ملکی شہروں کی عظمت، ہندوستانی رہنما، عام انسانی مسائل، غربت، افلاس، بے روزگاری وغیرہ کو بیان کیا گیا ہے اسی طرح نظم نگاری میں مختلف ہیئتوں کے تجربے بھی کیئے گئے جن سے نظم کی مختلف قسمیں وجود میں آئیں۔ مثلاً آزاد نظم۔ نظم معریٰ، ہائیکو، ترائیلے، دوہے، گیت، ثلاثی، پیروڈی وغیرہ اس باب میں مذکورہ تمام باتوں سے بحث کی گئی ہے۔

باب پنجم میں جدید نظم کے سماجی مطالعہ کا احاطہ کیا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ انسان سماجی حیوان ہے اس لئے انسان اور سماج کی معنویت اہمیت، افادیت مسلم ہے۔ فرد کے احساسات، جذبات، نظریات بھی کچھ سماج ہی کی مرہون منت ہیں۔ اور آدمی سے انسان بننے کا سفر وہ سماج ہی میں طے کرتا ہے۔ انسان کا وجود اور بقا سب کچھ سماج پر ہی منحصر ہے۔ ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک نظم نگاری کا سماجی نکتہ نظر سے مطالعہ کرنے پر یہ بات سامنے آتی ہے کہ غدر کے بعد جب حالات سنبھلنے لگے تو قوم کا شیرازہ بکھرا پڑا تھا۔ اس بکھرے ہوئے معاشرے کے تانے بانے کو سمیٹنا، نئے سماجی نظام کی بنیاد ڈالنا اور پھر اُسے استحکام بخشنا۔ مشکل کام تھا سر سیّد نے اس اہم کام کا بیڑہ اٹھایا۔ تعلیمی او اصلاحی تحریک چلائی اور شعر و ادب کو بے سمتی سے نکال کر حقیقت کی زمیں پر لا کھڑا کیا۔

انگریزوں کی نئی تعلیمی پالیسیاں، اصلاحات کی کوشیش سماجی ترقی کے ذرائع کو فروغ دینے میں مددگار ثابت ہوئیں۔ انگریزی ادب کی وجہ سے اُردو شعر و ادب میں نکھار آیا۔ اور ہندوستانی سماج کی عکاسی شعر و ادب میں جھلکنے لگی نئے نئے موضوعات سامنے آنے لگے۔ خاص

طور سے قدرتی مناظر کی عکاسی، سیاسی، سماجی، معاشرتی مسائل کا بیان۔ ہندوستانی رسم ورواج و عقائد وغیرہ نظموں میں بیان ہونے لگے۔ جدوجہد آزادی کے لئے پر تول رہی عوام کے جذبات وغیرہ نظم کے ذریعہ اجاگر ہونے لگے۔

سماجی برائیوں کو دور کرنے کی کوششیں کی جانے لگی، غلط، روائتیں اور رسوم کی نشاندہی کرتے ہوئے قدامت پرستی وغیرہ کو جڑ سے نکال پھینکنے کی کوشش ہونے لگی جدید دور کی سائنسی، ٹکنکی باتوں کو بھی نظم میں بیان کیا جانے لگا۔ کہا جاسکتا ہے کہ اُردو نظم نگاری نے سماج کے اعلیٰ تہذیبی معیار کو اُجاگر کرنے میں اہم کردار ادا کیا اس باب میں درج بالا تمام باتوں سے بحث کی گئی ہے۔

اختتامیہ میں جدید نظم نگاری کا سماجی مطالعہ اس عنوان کے تحت نظم کا پس منظر، سماجی ضروریات، ادبی اہمیت، نظم کے موضوعات خاص طور سے سماجی، ثقافتی اور معاشرتی نکتہ نظر سے تحقیقی مواد جمع کیا گیا۔ اس کی روشنی میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ آزادی سے قبل اُردو نظم نے سماج کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا اور ایک صالح معاشرے کے لئے ماحول سازی کی۔ غیر ضروری اور قدامت پرست روایتوں کو چھوڑنے اور نئے ترقی پسند راہوں کو اپنانے کے رواج کو فروغ دیا۔ آزادی کا جذبہ، حب الوطنی، قوم پرستی جیسی اہم باتوں کو عوام کے دلوں میں ابھارا۔ اپنائیت، بھائی چارگی کے جذبہ کو فروغ دیا۔ اور سماج و معاشرے کے صالح اقدار کی بنیادیں فراہم کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ کہا جاسکتا ہے کہ آزادی سے قبل اُردو نظم نگاری ایک فعال محرک اور بے باک تحریک رہی۔

اس مقالے کی تیاری میں جن شخصیتوں نے ترغیب دی ہمیشہ میری ہمت افزائی کی وہ میری والدہ بسم اللہ بیگم عبدالغنی ہیں جو آج بقید حیات نہیں لیکن اُن کی دُعائیں میرے لئے مشعل راہ ہیں اور رہیں گی۔ مجھے اپنے کرم فرماؤں، اساتذہ شعراء حضرات سے جو مشورے ملے میں ان کی ممنون ہوں خاص طور سے ڈاکٹر عبدالستار دلوی صاحب، ڈاکٹر شاہد حُسین صاحب، ڈاکٹر معین الدین جینابڑے صاحب، حمید سہروردی اور ڈاکٹر ایراج صدیقی صاحبہ ان سب کی شکر گذار ہوں ساتھ ہی اپنے کالج کے پرنسپل ڈاکٹر پی۔ ایل مورے صاحب، ڈاکٹر بی کے شندے، ڈاکٹر بھگوان جادھو صاحب کا بھی شکریہ ادا کرتی ہوں کہ ہر وقت انہوں نے میری ہمت افزائی کی۔

نا انصافی ہوگی اگر میں اپنے افرادِ خاندان کا شکریہ ادا نہ کروں میرے برادران محمد عبدالرشید صدیقی، محمد عبدالخورشید صدیقی، اور محمد عبدالرفیق صدیقی کی نیک خواہشات اور دُعائیں میرے ساتھ ہیں ان کا شکریہ ادا کرتی ہوں کہ ان کی ایماء اور تحریک نے مجھے اپنے مقالہ کے تکمیل کی ترغیب دی۔ انہی کے ساتھ بھانجہ خان غیاث الدین، بھانجی ڈاکٹر نسیم بیگم، بھتیجہ اقبال صدیقی کی محبتوں کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔ ساتھ ہی اپنی بیٹی فرح جبیں صدیقی کی بھی مشکور ہوں کہ جس نے اس مقالہ کی تیاری کے درمیان گھر کی ذمہ داریوں کا احساس نہ ہونے دیا۔ زیادتی ہوگی اگر میں صدر شعبہ اُردو ڈاکٹر حمید اللہ خان صاحب کا شکریہ ادا نہ کروں کہ جنہوں نے قدم قدم پر اس مقالہ کی تیاری میں میرا ساتھ دیا اور ہمت افزائی کی۔ ہر وقت میرے ہم قدم چلتے رہے یہ مقالہ اُن کی رہنمائی کے بغیر مکمل ہونا ناممکن تھا۔

سب سے بڑھ کر ڈاکٹر مجید بیدار صاحب کی میں بے حد مشکور ہوں کہ انہی کی نگرانی میں یہ مقالہ پائے تکمیل کو پہونچا۔ ان کی بے لوث رہنمائی کے لئے میں ان کی تہہ دل سے مشکور و ممنون ہوں ساتھ ہی ان تمام افرادِ خاندان اور سہلیوں اور ساتھی پرفیسرس کا شکریہ ادا کرنا چاہونگی جنھوں نے گاہے ماہے میری مدد فرمائی عبدالرحیم مونا کمپیوٹر کا بھی شکریہ ادا کرتی ہوں کیونکہ انہوں نے ہی DTP کے لئے بہت مدد فرمائی۔

ممتاز جہاں صدیقی
ایسوسی ایٹ پروفیسر شعبہ اُردو
گیان اپاسک کالج، پربھنی

☆☆

باب اوّل

اُردو نظم کا فکری پس منظر

ابتداء ہی سے اُردو شاعری میں غزل تمام اصناف شعری میں سب سے زیادہ مقبول اور پسندیدہ صنف رہی ہے۔غزل کے دوش بدوش دیگر اصناف شعری میں قصیدہ، مرثیہ، مثنوی، ہجو، شہر آشوب، قطعہ، رباعی وغیرہ بھی ترقی کے مراحل طئے کرتی رہیں۔ ۱۸۵۷ء تک مذکورہ تمام اصناف نظم کے زمرے میں شمار کی جاتی رہی ہیں۔ان میں قطعہ، ترکیب بند، مخمس، مسدس، مستمط اور غزل مسلسل کی اصطلاحیں بھی نظم کی ہیئتوں کی نشاندہی کرتی ہیں اور یہ تمام مذکورہ ہیئتیں زیادہ تر فارسی شاعری سے اُردو شاعری میں وارد ہوئی ہیں۔لیکن ساتھ ہی یہ کہنا بھی سچ نہیں کہ اس طرح کی شاعری ہر اعتبار سے فارسی شاعری کا چربہ ہے۔اس لئے کہ ان تمام اصناف میں بھی اس عہد کے تہذیبی عوامل کارفرما رہے ہیں۔اس زمانے کا ماحول اور اس دور کی مخصوص فضا اس کے مناظر اس دور کے انسانوں کا کرب و درد بھی اس زمانے کی شاعری میں در آیا ہے ساتھ ہی اس دور کے سماجی نظام پر تنقید بھی ملتی ہے۔

۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستانی تہذیب ایک نئے مرحلے سے ہمکنار ہوئی جس کے نتیجہ میں اُردو شاعری میں بھی بے شمار تبدیلیاں محسوس کی گئیں۔

اُردو شاعری میں مثبت اثرات اس طرح رونما ہوئے کہ ۱۸۶۷ء میں "انجمن پنجاب" لاہور کی سرکردگی میں آزادؔ اور حالیؔ نے نئی نظم نگاری کی بنیاد ڈالی۔ یہ نظم نگاری اس معنی میں نئی تھی

کہ شاعر کے پاس زندگی کو دیکھنے کے لئے ایک نئے زاویۂ نگاہ کی ضرورت تھی۔ اور اس دور کے مسائل بھی نئے تھے۔ اس لئے یہ دور دراصل اپنے آپ میں ایک اہم دور تھا کیونکہ یہیں سے نئی نظم نگاری یا جدید نظم نگاری کی بنیادیں قائم ہوتی نظر آتی ہیں۔ اس لئے اس دور کے سماجی، سیاسی، معاشرتی اور ادبی پس منظر کو ذہن میں رکھنا ضروری ہو جاتا ہے۔

یہ مسلّم حقیقت ہے کہ ہر شاعر یا ادیب اپنے مخصوص ماحول کی پیداوار ہوتا ہے اور ادب میں سیاسی، سماجی اور معاشرتی اثرات مرتب ہوتے رہتے ہیں۔ اس بات کے مدِ نظر اگر ہم تاریخ کی ورق گردانی کریں تو ہمیں جدید نظم کے معرض وجود میں آنے کی وجوہات نظر آئیں گی۔ جو درج ذیل ہے

☆ سیاسی حالات:

۱۸۵۷ء کی انقلابی جدوجہد میں ناکامی کے بعد ہندوستان پر حکومتِ برطانیہ کا اقتدار قائم ہو گیا تھا اور اس وقت کے مسلم مفکروں اور دانشوروں نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ اب انگریزوں سے براہ راست ٹکر لینا ناممکن ہے۔ انہوں نے اس بات کو محسوس کر لیا کہ آج اس بات کی ضرورت ہے کہ ہندوستانی قوم خاص طور سے مسلمان مایوسی کی فضاء میں سانس لے رہے ہیں۔ انہیں اس مایوسی اور بے اطمینانی کی فضا سے نکال کران میں خود اعتمادی بحال کرنا ضروری ہے کیونکہ ۱۸۵۷ء کی شکست سے عام لوگوں میں اپنی تہذیب وثقافت اور ماضی پر عدم اعتماد کی فضاء چھا گئی تھی تو دوسری طرف سیاسی بالادستی نے انگریزوں کو تہذیبی طور پر بھی ترقی یافتہ مستحکم اور طاقتور قوم کے طور پر ہندوستانیوں کے سامنے سے منوالیا تھا۔

بقول حالی

ہوئی وہ بزم خیال برہم تھا طلسمات کا گویا عالم
جس کو سمجھے تھے غلط ہم دریا اک ناچیز تھا وہ قطرہ
تھا کیا جس کو یقین چشمہ آب وہ نمائش تھی حقیقت میں سراب
ہنر اغیار میں پائے اکثر عیب اپنے نظر آئے اکثر
دفتر کو عالم کو ابتر پایا علم کو جہل سے بد تر پایا [1]

[1] مجموعہ نظم حالی مرتبہ ظہیر صدیقی ص ۱۰۲

اس پر آشوب اور مایوسی کے دور سے نکلنے کے لئے ضروری سمجھا گیا کہ مسلمان اپنی تہذیبی اور ثقافتی شناخت باقی رکھنے کی کوشش کریں۔ اور خود کو فعال اور متحرک قوم کے طور پر پیش کریں۔ اس مقصد کے لئے ایک طرف درخشاں ماضی کی از سرنو بازیافت کی گئی تاکہ خود پر اعتماد بحال ہو سکے۔ اور دوسری طرف اس بات کی کوشش کی گئی کہ مسلمان فاتح قوم کی برکتوں سے مستفید ہونے کی جستجو کریں۔ اور اپنے لئے ایک بہتر مستقبل کی تعمیر کے لئے کوشاں رہے یہی وہ جذبہ تھا جس نے عام اصلاحی کوششوں کو پروان چڑھایا اس کو "تہذیبی نشاۃ الثانیہ" نام دیا گیا۔ جس کے رہبر و روح رواں سر سیّد احمد خان تھے۔۔ انھوں نے یہہ محسوس کرلیا تھا کہ اگر مسلمانوں کو ایک باعزت قوم کی طرح زندہ رہنا ہے تو انہیں حالات سے مایوس ہو کر راہِ فرار اختیار کرنے یا گوشہ نشینی کو ترجیح دینے یا بغاوت کر کے خود کو مزید ہلاکت میں ڈالنے کی بجائے مفاہمت اور سمجھوتے کا راستہ اختیار کرنا چاہیے۔ وہ اس بات کے لئے کوشاں تھے کہ انگریزوں اور مسلمانوں میں جو غلط فہمی پیدا ہو گئی تھی وہ ختم کی جائے اور سر سیّد نے یہ کام "اسباب بغاوت ہند" لکھ کر انجام بھی دیا۔ ساتھ ہی مسلمانوں کو یہ تلقین کی کہ انگریز ایک ترقی یافتہ قوم ہے۔ اس لئے ان کی ترقیات سے فائدہ اٹھایا جائے ان کی علمی اور تہذیبی کارگذاریوں سے استفادہ پر توجہ دی جائے۔

سر سیّد کی یہی انفرادی کوشیش جلد ہی اجتماعی بن گئی اور ان کے اطراف کئی ایسے ہم خیال باشعور دانشور جمع ہو گئے۔ جن کی مدد سے زندگی کے تمام شعبوں میں اصلاحی کوشیش شروع ہو گئیں۔ یہاں سے مسلمانوں کی قومی تاریخ میں ایک نئے باب کا آغاز و اضافہ ہوا نئے ذہن اور نئے طرزِ فکر کی بنیاد پڑی۔ کئی لوگ اس بات سے متفق تھے کہ سر سیّد کی یہ تحریک "عقلیت پسندی" کی تحریک تھی۔ جس کی رو سے فطرت کے تمام مظاہر سلسلہ علت و معلول کے قانون کے پابند تھے۔ اور باقی تمام کے محض اوہام پرستی کا حصّہ تھے۔ اس وجہ سے سر سیّد کو مخالفین کا زبردست سامنا کرنا پڑا۔ ان پر نیچری ہونے کا الزام لگایا گیا۔ اور کافر ہونے کا فتویٰ دیا گیا۔

☆ نیچرل شاعری :

مذکورہ تمام باتیں اپنے آپ میں تاریخی حیثیت کی حامل ہیں۔ کیوں کہ اس تحریک سے

متاثر ہو کر الطاف حسین حالیؔ نے نیچرل شاعری کا آغاز کیا۔ جس کے ذریعہ جدید نظم نگاری کی داغ بیل پڑی اور نظم نگاری کو قومی اصلاح کا موثر ذریعہ گردانا گیا۔ جدید نظم وہ ہتھیار تھا جس کے ذریعہ قوم میں موجود برائیوں کو ختم کرنے کی کوشش کی گئی۔

کرنل ہالرائیڈ کی ایماء پر آزاد نے انجمن پنجاب کے زیر اہتمام ایک جدید طرز کے مشاعرے کا آغاز کیا۔ ۱۸۷۴ء میں نظمیہ شاعری کے طور پہلا مشاعرہ منعقد ہوا۔ اور اس مشاعرے میں محمد حُسین آزاد نے اُردو شاعری سے متعلق ایک مضمون پڑھا۔ جس میں انہوں نے کہا تھا۔

''میں نثر کے میدان میں بھی سوار نہیں پا پیادہ ہوں اور نظم میں خاک افتادہ ہوں۔ مگر سادہ لوحی دیکھو کہ ہر میدان میں دوڑنے کو آمادہ ہوں۔ یہ فقط اس خیال سے ہے کہ میرے وطن کے لئے شاید کوئی کام کی بات نکل آئے۔ میں نے آج کل چند نظمیں مثنوی کے طور پر مختلف مضامین میں لکھی ہیں جنھیں نظم کہتے ہوئے شرمندہ ہوتا ہوں۔'' [1]

اس طرح اُردو شاعری کے عام مواد پر انہوں نے اس سے قبل بھی عدم اطمینان کا اظہار کیا تھا اور شعر کی تعریف' ماہئیت اور مقصد پر روشنی ڈالتے ہوئے ایک نئے طرز کی شاعری شروع کرنے کی دعوت دی تھی، انہوں نے کہا تھا۔

''بعض طبائع شعر سے متنفر پائی جاتی ہیں۔ اور دلیل اس کی یہ پیش کرتے ہیں کہ اس سے کچھ حاصل نہیں اگر فائدہ سے یہی مراد ہے کہ جس کے عمل سے چار پیسے ہاتھ میں آجائیں تو بے شک شعر بالکل کارِ بے فائدہ ہے اور اس میں شک نہیں کہ ابنائے زمانہ نے شعر کو ایک ایسی ہی حالت میں ڈال دیا ہے [2]''

ایک جگہ محمد حُسین آزاد نے شاعری کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے

''شعر سے وہ کلام مراد ہے جو جوش و خروش اور خیالات سنجیدہ سے پیدا ہوا ہے۔ اور اُسے قوت قدسیہ الٰہی سے ایک سلسلہ خاص ہے۔ خیالات پاک جوں

۱۔ نظم آزاد۔ محمد حُسین آزاد ۱۳ سنہ ۱۹۱۰ء

۲۔ ایضاً محمد حُسین آزاد ۱۸

جوں بلند ہوتے جاتے ہیں۔ رتبہ شاعری پر پہونچتے جاتے ہیں۔ ابتداء میں شعر گوئی حکماء اور علمائے متبحر کے کمالات میں شمار ہوتی تھی اور ان تصانیف میں اُن کی تصانیف میں اور حالی کی تصانیف میں فرق بھی زمین آسمان کا ہے البتہ فصاحت بلاغت اب زیادہ ہے۔ مگر خیالات خراب ہو گئے سبب اس کا سلاطین و حکام عصر کی قباحت ہے انہوں نے جن چیزوں کی قدردانی کی لوگ اس میں ترقی کرتے گئے۔" [1]

مولانا محمد حُسین آزاد کے مذکورہ دونوں اقتباسات کا بغور مطالعہ کیا جائے تو پہلے اقتباس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ عام لوگوں میں اُردو شاعری کی طرف سے بیزاری پائی جاتی ہے۔ اور غدر کے ہنگاموں سے پیدا شدہ اقدار میں شاعری اپنا جواز کھو چکی ہے۔ اور دوسرے اقتباس سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ آزاد شاعری کا دفاع کر رہے ہیں کہ شاعری دوسرے فنون لطیفہ کی طرح قدرت کا ایک اہم عطیہ ہے۔ آزاد نے کئی جگہ اس بات کا اظہار کیا ہے کہ اُردو شاعری میں مضامین عاشقانہ خاص طور سے وصل کا لطف حسرت وارمان، ہجر کا رونا، شراب ساقی، بہار و خزاں کا ذکر ہے جو کہ خیالی ہے۔ یعنی آزاد نے شاعری کا موضوع محدود گردانا ہے اس سے نکلنے اور نئے مضامین پیش کرنے کا مشورہ بھی دیا۔

بقول آزاد

"تمہارے بزرگ اور تم ہمیشہ نئے مضامین اور نئے انداز کے موجد رہے مگر نئے انداز کے خلعت وزیور جو آج کے مناسب حال ہیں وہ انگریزی صندوقوں میں بند ہیں کہ ہمارے پہلو میں دھرے ہیں اور ہمیں خبر نہیں ہاں صندوقوں کی کنجی ہمارے ہم وطن انگریزی دانوں کے پاس ہے۔" [2]

محمد حُسین آزاد چونکہ انگریزی ادب سے مرعوب نظر آتے ہیں۔ اس لئے انگریزی ادب کی سمت رجوع کرتے ہیں۔ آزاد کے ان خیالات میں اس عہد کے دانشوروں کی ذہنی اور نفسیاتی کشمکش کا واضح اشارہ ملتا ہے۔ بہر حال یہ کہا جا سکتا ہے کہ مذکورہ بالا تصورات اور خیالات کی روشنی میں نیچرل شاعری کی تحریک کا آغاز ہوا۔

نیچرل شاعری کی اس تحریک کی وجہ سے اُردو کی قدیم شاعری سے بے اطمینانی کا چلن

۱۔ محمد حُسین آزاد ص ۲۰

۲۔ محمد حُسین آزاد ص ۸۵

عام اور ہند اسلامی تہذیب کی آویزش سے دانشوروں کا ایک نیا طبقہ سامنے آیا۔ جس نے قدیم فکری تہذیبی اور ادبی اثاثہ کو انگریزی ادب وثقافت کے سامنے کمتر گردانا اس تحریک سے نظم نگاری کو فروغ ہوا اور خاص طور سے حاؔلی نے غزل پر جو تنقید کی ہے اس کے نتیجہ میں غزل سے بیزاری بڑھی اور ادبی افق پر نظم کے لئے ایک خوش آئند ماحول فراہم ہوا۔ اور نظم مقبولیت کی منزلیں طے کرنے لگی۔

سرسیّد، آزاد اور حاؔلی نے شعر وادب میں جو تبدیلی کی راہ دکھائی تھی اس کی روشنی میں یہ محسوس کیا جاسکتا ہے کہ یہ خالص ادبی تحریک تھی کیونکہ حاؔلی سرسیّد اور آزاد نے عام اُردو شاعری کو زوال آمادہ قرار دیا تھا۔ اور ضرورت محسوس کی تھی کہ شاعری کو ایک ایسا رخ دیا جائے۔ جس سے یہ کارآمد صنف کی حیثیت اختیار کرسکے۔ اس لئے انہوں نے شاعروں کو چند مخصوص موضوعات پر نظمیں لکھنے کی تلقین کی بعض حضرات نے اُسے ''جدید نظم کی تحریک'' بھی کہا ہے اور یہ بات بالکل درست ہے کیونکہ اس تحریک سے ایک ایسی نظم نگاری کی روایت پروان چڑھی جس میں موضوعات بدلے ہوئے تھے۔ لیکن آزاد اور حاؔلی نے نظم کی ہیئت سے متعلق کسی طرح کی گفتگو نہیں کی بلکہ ''نظم'' صنف کی حیثیت سے موضوع بحث رہی اور اس طرح اُردو نظم کے ارتقاع پر اس بحث کے گہرے اثرات مرتب ہوئے۔

☆ یوروپی اثرات کا غلبہ

سرسیّد، حالی اور آزاد کی اس تحریک کا دوسرا اہم محرک سیاسی وجہ اور نفسیاتی ہوسکتی ہے۔ اس لئے کہ ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی میں شکست کے بعد انگریز جس قوت اور برتری کے احساس کے ساتھ ہندوستان پر قابض ہوئے۔ اس سے عام لوگوں میں اپنی تہذیب کے متعلق احساس کمتری کے جذبات شدید ہوئے۔ خاص طور پر مسلم عوام اور بالخصوص اس کا دانشور طبقہ اپنی تمام تہذیبی، فکری اور ادبی روایت کو انگریزی تہذیب اور ادب کے مقابلے میں کمتر سمجھنے لگا۔ اور شاید یہی وجہ تھی کہ ان حضرات نے اُردو کے قدیم سرمایہ ادب سے بیزاری ظاہر کی اور ادیبوں کو نئے خیالات قبول کرنے کی دعوت دی۔

اس تحریک کے اثرات بڑے دوررس رہے۔ اس رویے سے ایک ایسے طرزِ احساس کی

بنیاد پڑی جو نہ تو مغربی تھا اور نہ ہی اسلامی جو طرزِ مشرق و مغرب کی آویزش سے جنم لے رہا تھا۔ اور ایک نئے سماجی طرز فکر کا غماز بھی تھا۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ۱۸۵۷ء کی شکست کے بعد جو بھی نئی صورتِ حال سے مسلم قوم دوچار ہوئی اس میں جن بزرگوں نے فیصلے کیے۔ ان میں انتہا پسندی کا شکار بھی ہوئے لیکن ان کے خلوص اور دردمندی پر شک نہیں کیا جا سکتا کیونکہ وہ ایک نئی بیداری چاہتے تھے اور اسی مقصد کے لئے انہوں نے ادب کو تعمیری رخ دینے کی کوشش کی جس کے سبب جدید نظم نگاری کی بنیاد پڑی۔

☆ غدر اور اس کے بعد کے حالات

۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانوں کی حالات کے بارے میں غور کیا جائے تو اس دور کے انگریز کچھ اس طرح کہتے ہیں بقول ڈاکٹر ہنٹر

> ''ایک صدی قبل حکومت کے تمام ذمہ دار عہدوں پر مسلمانوں کا مکمل قبضہ تھا۔ ہندو محض شکریہ کے ساتھ ان چند ٹکڑوں کو قبول کر لیتے جو ان کے سابق فاتح اپنے دسترخوانوں سے ان کی طرف پھینک دیتے تھے۔ اور انگریزوں کی حیثیت چند ایک گماشتوں اور کلرکوں کی تھی (لیکن اب یہ حال ہے) ابھی پچھلے ہی دنوں ایک بہت بڑے محکمہ کے متعلق معلوم ہوا کہ وہاں ایک شخص بھی ایسا نہیں کہ جو مسلمانوں کی زبان پڑھ سکے۔ دراصل کلکتہ کے سرکاری دفتر میں مسلمان اب اس سے بڑھ کر کوئی امید بھی نہیں رکھ سکتے کہ قلی اور چپراسی، دواتوں میں سیاہی ڈالنے والا یا قلموں کو ٹھیک کرنے والا کے سوا کوئی ملازمت حاصل کر سکے۔''[1]

ڈاکٹر ہنٹر کے بیان سے اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مسلمان اس زمانے میں کس کس طرح کی پریشانیوں اور مسائل کا شکار تھے دراصل ۱۸۵۷ء میں مسلمانوں کا دو طرفہ نقصان ہوا تھا ایک تو وہ اقتدار سے محروم ہو گئے اور دوّم انہیں سماجی رتبہ سے بھی محروم ہونا پڑا تھا۔ معاشی اعتبار سے بھی وہ پس ماندہ ہو کر رہ گئے تھے۔ تعلیم سے دوری نے بھی مسلمانوں کے لئے

۱۔ Our Indian Musalman of w.v.Hunter

ترجمہ: ڈاکٹر صادق حُسین۔ لاہور باب چہارم صفحہ ۲۹۲

ترقی کے تمام راستے مسدود کر دیئے تھے۔

انگریزوں نے اپنی مصلحت کے پیش نظر کچھ ایسی سیاسی اور سماجی کشمکش پیدا کر دی تھی کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو نفسا نفسی کے سوا کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ یہ سارا زمانہ جبر واستبداد کا زمانہ تھا ۔کوئی بھی قوم انگریزوں کے خلاف آواز نہیں اٹھا پا رہی تھی۔ مسلمانوں کے لئے صرف ایک ہی راستہ رہ گیا تھا کہ وہ انگریزوں کی طرف سے مصالحت کر لیں جو بدگمانیاں یا مسلمانوں کو انگریزوں کی طرف سے جو شکایتیں پیدا ہو گئیں تھیں ان کے ازالے کی تدبیریں دریافت کریں اور اس کا سب سے آسان راستہ یہ تھا کہ مسلمان تعلیمی میدان میں آگے آئیں۔ تعلیم وتربیت، طرز معاشرت اور معیارِ زندگی کو انگریزی رنگ میں رنگ لیا جائے۔ اور کھوئے ہوئے اقتدار کو واپس بلانے کی تدبیر کی جائے۔ اس ضمن میں پہل کلکتہ سے کی گئی۔ بقول احتشام حُسین

> ''نئے شعور کی بناء پر جو تبدیلیاں ہو رہی تھیں۔ ان میں رہنمائی کی باگ ڈور پیشہ ور مذہبی پیشواؤں کی بجائے دانشوروں کے ہاتھ میں پہنچ رہی تھی [1]''

نواب عبداللطیف نے باقاعدہ ایک ماڈرن لٹریری سوسائٹی کی بنیاد ڈالی جس کی نشستوں میں مقتدر مسلمان جمع ہو کر مذہبی اور سیاسی مباحثے کیا کرتے تھے اور زندگی کو نئے اقدار سے روشناس کرنے اور زمانے کے ساتھ چلنے کی تلقین کرتے۔

اس طرح مسلمانوں میں تعلیمی بیداری کی ایک لہر اٹھتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ مسلمانوں کے اس رجحان کو شبہ کی نگاہ سے ہی دیکھتے تھے لیکن کچھ انگریزوں نے مسلمانوں کے تیئں اپنا رویہ بدلنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ اور وہ مصلحتاً ہی کیوں نہ ہو مسلمانوں کا ساتھ دے کر چلنا ضروری سمجھنے لگے تھے۔ انگریزوں کا ایک ہی مقصد تھا اور وہ یہ کہ ہندوستان دو قومی نظریہ کا حامی ہو جائے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں نفاق پیدا کیا جائے اور اپنی حکمرانی کو مضبوط کیا جائے چنانچہ ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر کی کتاب ''ہندوستانی مسلمان اسی ایماء پر لکھی گئی تھی مگر یہ ممکن نہ ہو سکا اور رفتہ رفتہ ہندوستانیوں میں سیاسی شعور اور قومی آزادی کا احساس پیدا ہوا۔ اور ملکی سیاست نے نئے نئے راستے تلاش کر لئے جن میں سب سے اہم ''انڈین نیشنل کانگریس'' کا قیام تھا

---

[1] احتشام حُسین علی گڑھ میگزین۔ علی گڑھ نمبر۔ مرتبہ نسیم قریشی صفحہ ۲۴

☆ سیاسی آزادی کا احساس:۔

۱۸۸۰ء سے ۱۸۸۴ء تک کا زمانہ ہندوستانی تاریخ میں اہم ہے اس زمانے میں لارڈ رپن کا اقتدار تھا جو طبیعتاً کسی قدر نرم رو تھا۔ اور جو غدر کے ہنگاموں کے دوران لگے زخموں پر مرہم کا کام کرنا چاہتا تھا۔ ہندوسانی قومیت کو دم لینے کا موقع مل گیا۔ جلد ہی آزادی کے لئے ہندوستانیوں کے دل میں تمنائیں انگڑائیاں لینے لگیں اور اب تک جو مراعات کونسل یا دوسری طرح سے مل رہی تھیں وہ ناکافی سمجھی جانے لگی تھی۔ کیونکہ کونسل کی ممبر شپ ملنے پر حکومت کے خلاف کچھ نہیں کہہ سکتے تھے اور برائے نام ممبر شپ رہ جاتی تھی۔ لارڈ رپن کے زمانے میں محدود انداز میں نرم لہجہ میں سہی حکومت پر موقع بہ موقع نکتہ چینی کی جانے لگی۔ انگریزی تعلیم کا رواج لارڈ میکالے کی کوششوں سے شروع ہوگیا گو کہ اس تعلیمی نظام کا مقصد صرف کلرک اور حاکم ومحکوم کے درمیان مترجم تیار کرنا تھا۔ لیکن کچھ باشعور اصحابِ نظر نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور بین الاقوامی حالات پر نظر ڈالنا شروع کیا۔ انہوں نے نئی تعلیم سے فائدہ اٹھایا اور اپنے خوابوں کو حقیقت میں بدلنے کی تدبیریں سوچنے لگے۔ انگریزی تعلیم کی وجہ سے انگریزی ادب سے واقفیت بڑھی اور اس کے اثرات اُردو ادب پر بھی مرتب ہونے شروع ہوگئے سر سیّد احمد خاں نے ''تہذیب الاخلاق'' کے ذریعہ لوگوں میں ملی اور قومی شعور پیدا کرنے کی سعی کی۔

بقول الطاف حُسین حالؔی

> ''اُردو شاعری جس میں دو سو برس تک ایک ہی قسم کے خیالات برابر دہرائے جارہے تھے۔ اس نے بھی زیادہ تر اس پرچہ (تہذیب الاخلاق) کی تحریک سے کروٹ لی۔ نئے نئے میدانوں میں شعراء قدم رکھنے لگے، مبالغہ اور جھوٹ کی جگہ حقائق اور واقعات کے خاکے کھینچنے لگے اور شاعری بجائے اس کے کہ محض دل لگی کی چیز سمجھی جاتی تھی ایک کام کی چیز بننے لگی۔'' [1]

غرض یہ کہ اُردو شاعری اور نظم نگاری کے لئے ایک ایسا ماحول تیار ہوگیا جہاں خارجی زندگی اور انسانی زندگی کے عوامل کو نئی راہ سے روشناس کرانے میں معاون و مددگار ثابت ہونے لگے۔

---

[1] حیات جاوید۔ حصہ دوّم ص ۶۱

بقول وزیر آغا۔

''دراصل موضوع کی تبدیلی تو ہر نئے دور کا ایک امتیازی نشان ہے کیونکہ نیا دور اپنے ساتھ نئی اشیاء نئے محرکات اور نے مسائل لاتا ہے دکھنی دور میں نظم نے خود کو زیادہ تر مذہبی جذبات کی ترسیل کا ذریعہ اور داستان گوئی اور قیصدہ نگاری کا ایک وسیلہ بنا کر پیش کیا تھا لیکن میرؔ اور سوداؔ کے زمانے میں جب کساد بازاری طوائف الملکی ۔ انتشار اور شکست و ریخت کی فضاء مسلط ہوئی تو اس کے نتیجے میں ہجو اور شہر آشوب کی روش بھی وجود میں آگئی گویا ایک نیا موضوع ابھر آیا۔ تاہم ان دونوں ادوار میں اُردو نظم کا پیکر جوں کا توں رہا۔ اور نظم نے خود کو زیادہ تر خارجی زندگی کی عکاسی اور اجتماعی شعور کے لئے وقف رکھا۔'' [۱]

یہ کہا جاسکتا ہے کہ جب وقت بدلتا ہے اور ماحول میں تبدیلی آتی ہے تو انسانی سوچ کے دھارے بھی نئی راہوں کی تلاش میں نکل پڑتے ہیں ۱۸۵۷ء کے بعد کے دور میں بھی انسانی فکر وسوچ کے دھارے بدلے اور انھوں اپنے لئے ایک نئی راہ متعین کر لی۔

اس ضمن میں وزیر آغا لکھتے ہیں۔

''حالیؔ اور اس کے رفقاء کے زمانے میں زندگی کے موضوعات ایک بار پھر بدلے میرؔ اور سوداؔ سے لیکر غالبؔ کے دور تک ہندوستان کی فضاء شکست و ریخت اور زوال کے احساسات سے لبریز تھی اور انفعالیت کا رجحان سطح پر آچکا تھا۔'' [۲]

☆ شاعری میں تعمیری پہلو

اگر دیکھا جائے تو ہندوستانی قوم میں اس قدر بے راہ روی ، خود غرضی ، قدروں کی شکست و ریخت کا عمل اپنے تمام گھناونے پہلوؤں کے ساتھ وجود میں آ گیا تھا۔ ہندوستانی قوم کو سماجی سطح کے علاوہ قومی اور سیاسی سطح پر بھی ہزیمت کا منہ دیکھنا پڑا۔ اور آخر ایک دن ایسا آیا جب اس ہزیمت سے ناچار قوم نے سیاسی سطح پر ایک طویل جنگ کا آغاز کر دیا اور اس کے

۱۔ ڈاکٹر وزیر آغا اُردو شاعری کا مزاج ص ۲۹۶

۲۔ ڈاکٹر وزیر آغا۔ اُردو شاعری کا مزاج ص ۳۹۶

ردِعمل کے طور پر کانگریس اور مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا۔ دوسری صورت مغربی تہذیب کو اپنانے اور مغرب کے ترقی پسند عناصر کا ساتھ دینے کی روش اختیار کی گئی جیسے سرسیّد احمد خان اور دوسرے اکابر نے بھی اپنایا۔ لیکن اکبرالہ آبادی، شبلی اور دیگر مسلمان علماء نے اُسے ہرگز پسند نہیں کیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تیسرا جذبہ جو کہ اصلاح کا تھا وجود میں آیا۔ جس کے تحت سرسیّد اور انکے رفقاء نے شعوری طور پر قوم میں نئی روح پھونکنے کے لئے اسباب تیار کر لئے حالؔی کے پاس غزل کے فرسودہ مضامین کے خلاف احتجاج ملتا ہے اور انہوں نے اُردو نظم کو موضوع کی تبدیلی کے ساتھ اپنایا۔ اور اُردو نظم نگاری بتدریج آگے بڑھتی رہی یہ بات بھی مسلّم ہے کہ غزل کی بجائے نظم کو مرکزی حیثیت تفویض کرنے کی تحریک کا آغاز یقیناً حالؔی کے دور میں ہوا۔ اگر باریک بینی سے مطالعہ کیا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ نظم کے رجحان کو عام ہونے میں درج ذیل وجوہات کارفرما ہیں

۱۔ اس زمانے میں غزل کے اس رجحان سے نجات پانے کی ایک شعوری کوشش تھی؟

۲۔ غزل کے لئے موضوعات محدود ہو چکے تھے۔ حالؔی کا موقف شاعری کو اصلاحی بنانا تھا۔ اصلاحی تحریک کے نظم کا کینوس موزوں تھا۔ نظم کا تسلسل موضوع کی تمام منطقی کڑیوں کا بآسانی احاطہ کرسکتا تھا۔

۳۔ حالؔی کا دور سیاسی اور سماجی تحریک کا دور تھا۔ یہ تحریک بڑی حد تک ریل، تار۔ برقی، ترقی سے منسوب تھی دیہات سے آبادی شہروں کی سمت آرہی تھی۔ پریس کی آزادی اور مغربی ترقی کے راستے اپنائے جارہے تھے اور ان تمام اصلاحات کو ادب کا موضوع بنانے کے لئے نظم ہی ایک واحد ذریعہ تھی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ اس دور میں فرد معاشرے کا مرکز نہیں تھا بلکہ ایک معاشرہ خود مرکز بن گیا تھا اور اُردو نظم معاشرے کی عکاسی کے لئے موزوں ترین صنف شاعری تھی۔

۴۔ نظم کے فروغ پانے کی چوتھی وجہ یہ تھی کہ حب الوطنی کی ایک فضاء ملک میں تیار ہو رہی تھی جس کے لئے شاعری کو وطن کی محبت اور اس کے مظاہر سے قریب تر کرنے کی ایک روچل پڑی تھی اور درجِ بالا اشیاء کو بیان کرنے کی صلاحیت نظم میں موجود تھی۔

۵۔ اس دور میں ایک رجحان پروان چڑھ رہا تھا ''مغربی پیروی'' اور یہی رجحان نے ادب میں اُردو نظم نگاری کیلئے مثبت رول ادا کیا۔ اس لئے نہ صرف اُردو نظم میں حب الوطنی

کے نغمے پروان چڑھے بلکہ نظم کو مغرب کی بلینک ورس سے قریب تر کرنے کی کوشش بھی کی گئیں۔

حالؔی کے دور میں نظم کی تحریک کسی خاص داخلی کرب کا نتیجہ نہیں تھی بلکہ ایک اصلاحی تحریک میں ایک فکر یا رجحان کی حیثیت تھی یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس دور میں نظم کی ترویج کا منصوبہ عوام کو جذباتی سطح پر تعمیر نو کی طرف متوجہ کرنے کی ایک کوشش تھی نظم گو کہ ترقی و ترویج پاتی رہی لیکن ان سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ نظم میں فرد کی ذات کے بجائے سماجی رخ کو سامنے لانے کا جذبہ زیادہ توانا تھا۔ یعنی نظم کا اہم کام یہ تھا کہ فرد کے ان اقدامات کو تیز کیا جائے جس سے ملک اور قوم کے اجتمائی مفاد کے لئے معاون و مددگار ثابت ہوسکے۔ حب الوطنی کا جذبہ ملت کو جگانے کا اقدام اور بہتر سماج کی تشکیل کے لئے فرد کو خاص سانچے میں ڈھالنے کی کوشش ہی نظم کا اولین مقصد تھا۔

☆ شاعری کی سمت کا تعین:

اس دور میں جن شعراء نے نظم نگاری کو پروان چڑھایا ان میں حالؔی کے علاوہ محمد حُسین آزادؔ اسمٰعیل میرٹھی، شبلؔی اور اکبرالہ آبادی قابل ذکر ہیں۔ یوں تو حالؔی آزادؔ اور اسمٰعیل میرٹھی ایک ہی مکتبہ فکر کے علمبردار تھے اور شبلی اور اکبرالہ آبادی دوسرے مسلک سے جڑے ہوئے تھے لیکن مقصد دونوں کا ایک ہی تھا یعنی قوم کی اصلاح۔ فرق صرف اتنا تھا کہ حالی اور ان کے رفقاء تلقین وعظ و نصیحت سے قوم کی اصلاح چاہتے تھے اور اکبرالہ آبادی اور شبلؔی کے ذریعہ ناہمواریوں کو ختم کرنا چاہتے تھے۔ حالؔی نے نظم کے ذریعہ اس بات کی تلقین کی کہ اپنے اسلاف کے کارناموں کے پیش نظر وہی صفات نئی نسل میں پیدا ہوں اور مسلم قوم اپنا کھویا ہوا وقار دوبارہ حاصل کرسکیں۔

اس کی ضد اکبرالہ آبادی کے خیالات تھے ان کا خیال تھا کہ یہی ترقی پذیر رجحانات قوم کو زوال کی سمت لے جارہے ہیں اب کون یہ کہہ سکتا ہے کہ دونوں کے مقاصد میں کوئی فرق تھا۔ دونوں ہی قوم کی اصلاح چاہتے تھے۔

حالی اور اکبر کی نظم نگاری سے یہ فائدہ ہوا کہ نظم کے موضوعات میں وسعت پیدا ہوئی اور نظم نگاری کے لئے ترقی کے راستے خود بخود کھلتے چلے گئے نظم کو اصلاحی تحریک کے لئے حالؔی کے

بعد محمد حُسین آزاد نے اپنایا انہوں نے نظم کے لئے اوصاف اور قدروں کو اپنا موضوع بنایا جیسے امید، انصاف، قناعت، امن، حب الوطنی وغیرہ آزاد نے اپنے بلند پایہ تخیل کے ذریعہ اس حقیقت کا انکشاف کیا کہ قوم وملت کو پرانی روش سے ہٹ کر جدید کاری میں حصّہ لینا چاہتے۔

نظم کے لئے جو پس منظر ابھرا اس کے تیسرے اور اہم ستون اسمٰعیل میرٹھی ہیں۔ انہوں نے یہ محسوس کرلیا کہ بڑوں کو نصیحت کرنے کی بجائے بچوں کو نصیحت آمیز نظمیں سنائی جائے تو زیادہ بہتر ہوگا کیونکہ آنے والے مستقبل کے وہی ضامن ہوتے ہیں۔ اس لئے انہوں نے بچوں کے لئے سیدھی سادھی نظمیں لکھیں۔

نظم نگاری کا اہم نام جو سامنے آیا ہے وہ علامہ اقبال ہیں اقبال کی نظم نگاری دراصل نظم نگاری کے فن کی معراج تصوّر کی جاتی ہے۔ حالؔی اور شبلؔی کی طرح حسرت نے بھی نیچرل شاعری کی اصطلاح کو شعری اصول کی حیثیت سے قبول کیا۔

ممتاز حسین نے حسرؔت کے نیچرل شاعری سے متعلق کہا ہے۔

> ”..........حسرؔت بہ نسبت مولانا حالؔی کے نیچرل مشاعری کے مفہوم کو بہتر طریقے سے سمجھتے ہیں۔ حالی نیچرل پر اخلاقیات کی قدغن لگاتے ہیں۔ حسرت اُسے دور کرتے ہیں۔ لیکن دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ نیچرل شاعری وہ ہے جو کہ لفظاً ومعناً دونوں اعتبار سے نیچرل ہو۔[1]“

اُردو نظم کے پس منظر میں اگر دیکھیں تو یہ بات سامنے آجاتی ہے کہ اُردو نظم میں اخلاق، ملی و وطنی موضوعات کی پیش کش کو بنیادی اہمیت حاصل ہے البتہ معاشی اور سیاسی فضاء نے سرسیّد احمد خان کی عقلیت پسندی اور حالؔی کی اصلیت پسندی کے خلاف رومانوی رجحان کو فروغ دیا۔ اس رجحان کو فروغ دینے میں اس دور کی عام سیاسی فضاء اور معاشرتی صورتِ حال ادیبوں کا اپنا مزاج اور انگریزی رومانی شعراء کا مطالعہ وغیرہ شامل ہے۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس دور کے شعراء نظم نگاری کی حیثیت سے عموماً اصلاح پسند تھے۔ ان کی روایت پرستی یہ تھی کہ قوم میں ایک طرف اپنی تہذیب روایت اور کلچر سے دلچسپی پیدا ہوئی اور دوسری طرف قوم معاصرِ زندگی کے تقاضوں کو قبول کرتے ہوئے آگے کی سمت قدم بڑھائیں

---

[1] ممتاز حُسین حسرت کی غزل گوئی ادب وشعور ص ۲۹۵

اس میں کوئی شک نہیں کہ جدید اُردو نظم نے ۱۸۵۷ء کے بعد ایک متعین صورت میں نشونما پائی انگریزی دورِ اقتدار میں انگریزی تعلیم اور مغربی اثرات کے نتیجہ میں ہندوستانی زندگی کے اہم شعبوں پر ہمہ گیر اثرات مرتب ہوئے۔ محمد حسین آزاد، الطاف حسین حالی نے نئے حالات اور انگریزی شاعری سے متاثر ہو کر اُردو شاعری میں ایک نئی صنف "نظم" کو رائج کیا۔ اور اُسے فروغ دینے کی کوشش بھی کی۔ لیکن مکمل طور پر وہ اپنی روایتی شاعری سے انحراف بھی نہیں کر سکے۔ کیونکہ کوئی بھی نسل اپنے ماضی سے بالکلیہ طور پر اپنا رشتہ نہیں توڑ سکتی۔ بلکہ روایتوں اور قدیم ورثے سے ہی نئی راہ متعین کی جا سکتی ہے روایت کی اہمیت کا اعتراف (T.S.Eliat) ٹی ایس ایلیٹ نے کچھ اس طرح کیا ہے۔

> "تاریخی شعور کے لئے ادراک کی ضرورت پڑتی ہے نہ صرف ماضی کی ماضیت، کی بلکہ اس کی موجودگی کی بھی تاریخی شعور ادیب کو مجبور کرتا ہے کہ لکھتے وقت جہاں اُسے اپنی نسل کا احساس رہے وہاں یہ احساس بھی رہے کہ یوروپ کا سارا ادب ہومر سے اب تک اس کے اپنے ملک کا سارا ادب ایک ساتھ زندہ ہے اور ایک ہی نظام میں مربوط ہے یہ تاریخی شعور جس میں لازماں اور زماں کا شعور الگ الگ اور ساتھ ساتھ شامل ہے وہ چیز ہے جو ادیب کو روایت کا پابند بناتا ہے اور یہی وہ شعور ہے جو کسی ادیب کو زماں میں اس کے اپنے مقام اور اپنی معاصرت کا شعور عطا کرتا ہے۔"[1]

درجہ بالا بیان کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ روایت کا شعور ہر دور کے شعراء کے یہاں موجود ہے لیکن اس کے باوجود نئے حالات کے تقاضوں کے پیش نظر نئے تجربے وجود میں آتے ہی رہتے ہیں

اور تجربے اور روایت میں ہمیشہ ہی ایک ربط پنہاں رہتا ہے۔ اس لئے جدید اُردو نظم کا جب ہم مطالعہ کرتے ہیں تو یہ بات نظر انداز نہیں کر سکتے کہ مغربی علوم اور نظم نگاری سے براہِ راست اثر لینے کے ساتھ ساتھ اس کا رشتہ اُردو شاعری کی قدیم روایت سے قائم رہا اور اُردو شاعری کی پائیدار روایت بھی جدید اُردو نظم کے تشکیل و ترویج میں معاون و مددگار ثابت ہوئی۔

---

[1] ترجمہ جمیل جالبی ایلیٹ کے مضامین ص ۱۲۹۔۱۲۸

اس لئے اگر اس بات پر غور کیا جائے کہ اُردو نظم کس دور میں نظر انداز کی گئی اور کس عہد نے اُسے اہمیت دی اور کن کن شعراء نے نظم کو مختلف شکلوں میں برتا تو دلچسپ معلومات کا ایک سلسلہ ہماری نظروں کے سامنے آجاتا ہے۔

قدیم دور میں اُردو نظم صوری اور معنوی لحاظ سے اپنی ابتدائی حالت میں تھی اس وقت شعراء کے ذہنوں میں نظم کا کوئی واضح متعین و مکمل تصور یا شکل موجود نہیں تھی۔ اگر تاریخ اُردو ادب کا باریک بینی سے مطالعہ کیا جائے تو قدیم دکنی دور سے لے کر ۱۸۵۷ء کے پر آشوب دور تک مختلف موضوعات پر علحیدہ علحیدہ موضوعاتی نظمیں لکھی گئیں۔ لیکن بطور ہئیت و تکنیک دیکھا جائے تو یہ نظمیں جدید نظم کے مفہوم کو پورا نہیں کرتیں۔ خاص طور سے مثنوی، مرثیہ اور قصیدہ کا تعلق ہے یہ تمام اصناف غزل سے ہٹ کر ایک علحیدہ صنف کے طور پر نظم کے موضوع کا احاطہ ضرور کرتی ہے لیکن یہ اصناف جدید نظم کے مطالعہ کے دائرے سے باہر ہیں۔ کیونکہ مذکورہ اصناف موضوع اور ہئیت کے لحاظ سے روایتی بن گئی ہیں۔ ۱۸۵۷ء کے سانحہ کے تعلق سے بھی دو رائے ملتی ہے۔ جس کا اثر اُردو نظم پر نمایاں ہے

یہ بات اپنی جگہ تحقیق طلب ہے کہ غدر کوئی انقلابی اقدام تھا یا کہ ایک فوجی بغاوت تھی ؟ اس کی تعبیروں تفسیروں پر علحیدہ علحیدہ رائے رکھنے والے مفکر مل جاتے ہیں۔ بقول آر۔ سی۔ مجمدار

یہ تحریک ''تمام ہندوستان کی نمائندگی ہر گز نہ کرتی تھی بلکہ مقامی محدود اور معمولی طور پر منظم تھی [1]''

اس بات کو حامد کشمیری کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں۔

''لیکن یہ حقیقت ہے کہ انگریزوں کے طریقہ کاران کے حصول اقتدار کے ناجائز اور جابرانہ طور طریق سے متاثر ہو کر ہندوستانیوں کے دلوں میں نفرت اور بے چینی بڑھتی جارہی تھی سیاسی، سماجی اور مذہبی وجوہات کی بناء پر لوگوں کے دلوں میں پرورش پانے والی بے چینی کے پھٹ پڑنے کا یہ لازمی نتیجہ تھا۔ نفسیاتی

1۔ آر۔ سی مجمدار۔ این ایڈوانسڈ ہسٹری آف انڈیا۔ حصہ سوم ص ۱۱۲

اعتبار سے یہ ہنگامہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ کیونکہ یہ اہلِ ہند کے لئے انقلاب اور شعور کی پہلی منزل تھی“ [1]

☆ انگریزی تعلیم کا اثر

غدر کے بعد انگریز ہندوستان پر پوری طرح قابض ہو گئے اور اپنے ساتھ اپنی زبان تہذیب و تمدن، عادات و اطوار، خیالات و نظریات بھی لائے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ غدر سے پہلے کی صدی کی بہ نسبت اب ان کی معاشرت اور تہذیب کا اثر براہ راست ہندوستانی زندگی پر پڑنے لگا۔ غدر سے پہلے ہندوستانی زندگی دھیرے دھیرے مغربی اثرات قبول کر رہی تھی۔ لیکن اب ایسٹ انڈیا کمپنی کے جانب سے انگریزی تعلیم نافذ ہونے پر انگریزی تہذیب و فکر کے پھیلنے کے لئے راہیں ہموار ہوتی گئیں۔ کلاسیکی زبان کے ساتھ ساتھ ادب کا مطالعہ بڑھا اور ہندوستانی عوام نئے خیالات و تصورات سے روشناس ہونے لگی۔ سائنسی معلومات بہم پہونچائی جانے لگی۔ عیسائی مشنریوں کا جال پھیلتا گیا پھر ۱۸۳۰ء میں کلکتہ میں کالج کا قیام عمل میں آیا۔۔ جہاں انگریزی ادب اور سائنس کی تعلیم کا انتظام کیا جانے لگا۔ ۱۸۶۱ء تک ہندوستان کے شہر کلکتہ، مدراس، اور بمبئی میں جدید یونیورسٹیوں کا قیام عمل میں آیا اور چند سال بعد دوسرے مقامات پر بھی یونیورسٹیوں کا قیام عمل میں آیا۔

انگریزی تعلیم کی اس تاریخی ترقی سے اس دور میں یعنی ۱۷۵۷ء جنگ پلاسی کے بعد سے ۱۸۵۷ء کے غدر تک کے دور میں لوگوں میں سماجی، تعلیمی اور مذہبی خیالات میں آہستہ آہستہ تبدیلی پیدا ہو رہی تھی۔ یہاں کے لوگوں میں توہم پرستی، اندھے عقائد اور مذہبی جنون کی کیفیت میں کمی آ رہی تھی فکر و عمل کی روشنی عقل و ادراک۔ حرکت و عمل اور مذہبی رواداری کی قدر و قیمت میں اضافہ ہی ہو رہا تھا لیکن یہ بات محدود طبقے تک ہی پائی جاتی تھی۔

بقول حسن یحییٰ عندلیب

”انگریزی حکومت کے قیام نے تمام ملک میں ایک ایسی فضاء پیدا کر دی جس میں مغربی خیالات خصوصاً انگریزی نظریات زندگی رفتہ رفتہ لوگوں کے دماغ پر

---

[1] حامد کاشمیری اُردو نظم پر یوروپی اثرات ص ۸۱

طاری ہونے لگے۔ انگریزی مدرسوں کے قائم ہوجانے سے جہاں انگریزی
ذریعہ تعلیم مقرر کردی گئی تھی لوگوں کے خیالات میں تغیر و تبدل ہونے لگا۔"

تعلیمی نظام میں انگریزوں کی دلچسپی نے ہندوستانی معاشرے میں نئی روح پھونکی ملک میں پرائمری تعلیم کی اہمیت پر زور دیا جانے لگا۔ انیسویں صدی کے آخر میں تعلیم کی باقاعدہ ترقی کے ساتھ ساتھ سماجی اور مذہبی اصلاحات کی طرف بھی توجہ دی جانے لگی۔ مختلف تحریکات کے ذریعہ سماج میں بیداری پیدا کی جانے لگی۔ ہندوؤں میں یہ عام رجحان تھا اور وہ انگریزی تعلیم سے مستفید بھی ہو رہے تھے

مسلمانوں میں انگریزی حکومت کے خلاف غم وغصہ تھا۔ اور تقریباً اٹھارویں صدی ہی سے مسلمان رہنماؤں اور مصلحوں نے اس کے خلاف ردّعمل کا اظہار کرنا شروع کر دیا تھا۔ سب سے پہلے شاہ ولی اللہ نے انگریزوں کے خلاف جہاد شروع کر دیا اس کے بعد احمد شاہ دہلوی، مولانا عبدالحی، شاہ اسماعیل شہید قابل ذکر ہیں۔ ان تمام لوگوں نے انگریزوں کے بڑھتے ہوئے قدم روک لئے ان مذہبی رہنماؤں نے مسلم سماج میں بڑھتی ہوئی توہم پرستی اور سماجی زندگی میں پھیلی ہوئی برائیوں کے خلاف بھی آواز اٹھائی۔ بعد میں وہابی تحریک نے سر ابھارا۔ جسکا مقصد انگریزوں کے پیدا کردہ روکاوٹوں کو دور کرنا بھی تھا۔

☆ بقول احتشام حُسین

"یہاں ان کی تفصیلات میں جانے کے بجائے محض یہ یاد دلانا ہے کہ مسلمانوں کے اندر عام بے چینی اور بددلی پھیلی ہوئی تھی اور اس اہم انقلابی جدوجہد کے لئے فضاء تیار ہو رہی تھی جو ۱۸۵۷ء میں رونما ہوئی [1]"

اتنا ہی نہیں انگریزوں کے خلاف بڑھتی ہوئی بے چینی اور بے دلی اور گھٹے ہوئے جذبات نے آگے چل کر ایک اور صورت اختیار کی یعنی اُن کی فکر و خدمات، وطن پرستی اور جذبہ آزادی کی صورت میں تبدیل ہو گئے۔ اور دونوں قوموں کی اصلاحی تحریکات نے ہندوستان کی تہذیبی عصمت اور شعور کو بیدار کیا، جو آگے چل کر انگریزوں کے لئے سب سے بڑا چیلنج بن گیا۔

---

[1] احتشام حُسین۔ علی گڑھ میگزین ص۔ ۲۴

انیسویں صدی تک آتے آتے مشرقی ممالک میں بھی بیداری کی لہر دوڑ گئی روس، چین، ایران میں جمہوری قومیں حرکت میں آگئیں۔ اس کا اثر براہ راست ہندوستان پر پڑا۔ اور ہندوستانی عوام نے تحریک آزادی میں شامل ہونا شروع کر دیا۔ لیکن انیسویں صدی کے نصف آخر میں زندگی مذہب اور اخلاق اور سیاست کے پرانے روابطہ کی شکست وریخت نے مسلمانوں کے ایک مخصوص طبقہ کو ذہنی الجھن میں ڈال دیا تھا۔

☆ بقول احتشام حُسین

"بنے بنائے راستوں پر چلنا ممکن نہ تھا۔ اور نئے راستے اچھی طرح بنے نہیں تھے۔ پرانے خیالات سے چھٹکارا حاصل نہیں ہوا تھا۔ نئے خیالات نے ذہنوں میں جگہ نہیں بنائی تھی۔ [1]"

اس بات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مسلمانوں میں ابھی تعلیمی بیداری کی مہم عام نہیں ہوئی تھی۔ سرسیّد کا خیال تھا کہ اگر مسلمان تعلیمی میدان میں سرگرم ہو جائیں تو معاشرت، تہذیب، مذہب اور ادب کے لئے بھی ایک نیک شگون ہوگا۔ بقول کرشن پرشاد کنول

"وہ تو مسلمانوں کو قعرِ ذلت سے ابھار کر زمانے حال کا ترقی پسند اور مہذب انسان بنانا چاہتے تھے۔ اس کے لئے انہوں نے اپنی تمام تر کوشش صرف کیں۔ اور وہ کامیاب بھی ہوئے۔ [2]"

سرسیّد نے تعلیم یافتہ طبقہ کو جہاں تہذیب کے اصلی اور وسیع تر معنی سے روشناس کرانے کی کوشش کی وہیں انہوں نے شعر و ادب کا بھی ایک جدید اور روایت شکن نظریہ پیش کیا۔ قدیم دور میں تہذیب و تمدن کی قدریں ظاہری آرائش زینت اور تکلف کے سوا کچھ بھی نہیں رہ گئی تھی۔ بلکہ ادب بھی اپنا اصلی جوہر کھو بیٹھا تھا۔ شاعری چند شعراء کو چھوڑ کر نقالی بن کر رہ گئی تھی جھوٹے خیالات اور تصنع و بناوٹ اور سستی جذباتیت کا ایک دفتر بن کر رہ گئی تھی اسی بات کے مدِ نظر انہوں نے شاعری کے لئے "نظم" جسے وہ شاعری ہی کے مفہوم میں استعمال کرتے ہیں وہ نہ

---

[1] احتشام حُسین۔ اُردو ادب انقلاب ۱۸۵۷ء کے پس منظر میں، عکس اور آئینے میں ص ۱۱۵

[2] پنڈت کشن پرشاد کنول۔ تہذیب اور ادب میں سرسیّد کا زمانہ۔ ادب اور نظریہ ص ۴۹

صرف ناقص بلکہ غیر مفید بھی نظر آئی۔ اس لئے سرسیّد نے لاہور کے مشاعرے کے تعلق سے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا تھا۔

''ہماری زبان کے علم و ادب میں بہت بڑا نقصان یہ تھا کہ نظم پوری نہ تھی۔ شاعروں نے اپنی ہمت عاشقانہ غزلوں اور واسوختوں اور مدحیہ قصیدوں اور ہجویہ قطعوں اور قصہ کہانیوں کی مثنویوں میں صرف کی تھی۔ دوسری قسم کے مضامین جو درحقیقتو ہی اصلی مضامین ہیں اور نیچر سے علاقہ رکھتے ہی نہ تھے۔ نظم کے اوزان بھی وہی معمولی تھے۔ ردیف قافیے کی پابندی گویا ذات شعر میں داخل تھی۔ رجز اور بے قافیہ شعر گوئی کا رواج ہی نہ تھا۔ اور اب بھی شروع نہیں ہوا۔ ان باتوں کے نہ ہونے سے حقیقت میں ہماری نظم صنفِ ناقص ہی نہ تھی بلکہ غیر مفید بھی تھی۔ اُردو زبان کے علم و ادب کی تاریخ میں ۱۸۷۴ء کا وہ دن جب لاہور میں نیچرل پوئٹری کا مشاعرہ قائم ہوا۔ یادگار رہے گا۔[1]''

سرسیّد نے اصلاح زبان کے ساتھ ہی اصلاح شاعری پر بھی توجہ دی اور اپنے اثر و رسوخ کے ذریعہ بے شمار قومی نظمیں لکھوائی۔ اگر ہم دیدہ ریزی کے ساتھ مطالعہ کریں تو یہ بات محسوس کی جاسکتی ہے کہ غدر سے قبل بعد کے سیاسی اور معاشرتی حالات ہی کے تجزیے سے ہم اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ مغربی تہذیب وفکر کے ہندوستانی زندگی پر اثرات ہی کا ثبوت ہے کہ جدید نظم فروغ پا گئی۔ اور سماجی وادبی اور نفسیاتی حالت ہی نے جدید اُردو نظم کے لئے ایک مناسب موقع فراہم کیا۔

بقول ڈاکٹر عبداللطیف۔

''عہدِ جدید کی تاریخ میں کوئی اور ملک اس طرح اچانک زندگی بخش خیالات اور تصورات کی روشنی سے منور نہیں ہوا اگر اس کی کوئی مثال ملتی ہے۔ وہ یوروپ کی نشاۃ الثانیہ ہے۔[2]''

اسی دور میں ہندوستانی عوام میں فکر وخیال کی وسعت پیدا ہورہی تھی اور قدیم تنگ و

---

[1] سرسید احمد خان بحوالہ ہماری زبان ص ۶ یکم نومبر ۱۹۶۵ء

[2] ڈاکٹر عبداللطیف فکشن آف انگلش لٹریچر اور اُردو لٹریچر ص ۹۳

تاریک ماضی پرستی سے نکل کر وہ نئی راہ متعین کرنے لگے تھے۔ انگریزی تعلیم جب رائج ہوئی تو ہندوستانیوں میں نئے خیالات و رجحانات کو بانٹنے کا موقع ملا۔ مغربی علوم اور سائنس کے مطالعہ سے فطرت کے رازہائے سربستہ منکشف ہونے لگے۔ ان حالات نے جہاں ذہن کو وسعت اور کشادگی بخشی وہیں اُسے نئی الجھنوں، مایوسیوں کا شکار بھی بنا دیا۔ اس لئے جن نئے شعراء نے اپنے مشاہدات اور وارداتِ حیات کا تخلیقی اظہار کرنا چاہا تو ان کے سامنے ایک بڑی دشواری یہ تھی کہ ان کے متنوع تصورات شعر کے پرانے روایتی سانچوں میں ڈھل نہیں سکتے تھے۔ اس لئے جدید نظم کی سمت ان کا رجحان جانا ضروری تھا۔ کیونکہ اظہار کے لئے انھیں ایک صنف کی تلاش کرنی پڑی۔ جو اپنے اندر لچک اور وسعت رکھتی ہو۔ یہ کام انہوں نے پہلے پہل مثنوی سے لیا۔ جو نظم کی شکل بن گئی۔

بقول حامد کاشمیری

"مغربی تعلیم کے رواج کے ساتھ اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں مغربی ادب اور شاعری عام ہونے لگی۔ لوگ انگریزی نظموں کیموضوع اور اسلوب سے آگاہ ہوئے اور انھیں اُردو شاعری کی کم مائیگی اور سطحیت کا احساس ہونے لگا۔ خاص کر اُردو غزل کے عام انداز کی فرسودگی کا انھیں احساس ہونے لگا۔ بعض شعراء نے مغربی تصور سے اُردو خوانوں کو روشناس کرانے کے لئے انگریزی نظموں کے اُردو ترجمے بھی کیے یہ گویا بہترین ابتدائی نمونے تھے۔ جو اس دور کے باشعور شعراء کے سامنے آئے۔ اور نظم کا مفہوم ان کے ذہن میں متعین ہونے لگا[1]"

۱۸۵۷ء کے بعد ہی نہیں اس سے قبل بھی اُردو میں ترجمہ کے ذریعہ انگریزی ادب اور ڈرامے متعارف ہونے شروع ہو گئے تھے۔ بقول عتیق صدیقی۔

"ہندوستانی زبان کے قواعد کی دوسری قابل ذکر خصوصیت یہ ہے کہ شیکسپیئر کے دو مختلف ڈراموں کے ایک ایک ٹکڑے کا ترجمہ اُردو زبان اور اُردو رسم الخط میں ہم کو اس کتاب میں ملتا ہے۔ سنسکرت فارسی اور اُردو کے اکثر شاہکاروں کا اس

---

[1] حامد کاشمیری اُردو نظم پر یوروپی اثرات ص ۹۰

وقت تک انگریزی میں ترجمہ ہو چکا تھا لیکن انگریزی زبان کی کسی کتاب کو یا اس کے کسی حصّہ کو کسی ہندوستانی زبان میں غالباً منتقل نہیں کیا گیا تھا۔ اس لئے گل کرسٹ کی ہی کوشش کو بھی ہمارے ادب کے اس میدان میں شائد اولیت کا فخر حاصل ہے۔'' [1]

جدید اُردو نظم کے لئے ترجموں کی روایت بھی اہم ثابت ہوئی آزاد اور حالی کے زمانے سے ترجموں کا جو سلسلہ جاری تھا۔ اُسے تقویت ملتی گئی۔ اور جدید نظم کا تصور آہستہ آہستہ مقبولیت حاصل کرنے لگا۔ جدید نظم نگاری دراصل ایک ردِّ عمل کے طور پر بھی وجود میں آئی۔ یہ ردِ عمل زوال پذیر دور کی لکھنوی شاعری کے خلاف پیدا ہونا ناگزیر تھا۔ کیونکہ لکھنوی شاعری عیش کوشی، تکلف، ظاہر پرستی۔ سطحیت اور چھچھورے پن کی آمیزش تھی۔ روایتی اور بے جان موضوعات شاعری میں داخل ہو گئے تھے نئے حالات میں اس نام نہاد شاعری کے خلاف جب ردِّ عمل ظاہر ہوا تو ایک ایسی صنف کی ترقی کے لئے راہ استوار ہونے لگی جو جدّت، تازگی، معنویت اور صداقت کے اوصاف سے مزّین تھی۔ اور یہ صنف نظم کے نام سے زیادہ سے زیادہ مشہور ہونے لگی۔ بقول ڈاکٹر عندلیب شادانی۔

''انگریزی تعلیم اور مغربی تہذیب و تمدن کے اثر سے ہمارے موضوعاتِ سخن بدلے یعنی مواد میں تبدیلی ہوئی اس تبدیلی کا اثر ہیئت پر بھی پڑا۔ اور ایک صنف خاص جسے حرفِ عام میں نظم کہتے ہیں وجود میں آئی۔'' [2]

انیسویں صدی کا دور ایک عجیب کشمکش کا دور تھا نئی تہذیب کی آہٹ سنائی دے رہی تو کچھ قدامت پرست روایتوں کے امین تھے نئی تعلیم اور نئی تہذیب کو وہ گمراہ کن مانتے تھے، خاص طور سے مسلم معاشرے میں انتشار کی لہر زیادہ تھی۔ کہا جا سکتا ہے کہ اسی انتشار اور مایوس بھری پھر تعلیمی و تہذیبی امور کی بازیافت کی وجہ سے نظم نگاری کے لئے ایک حقیقت پسندانہ ماحول ملا۔ آزادؔ۔ حالیؔ شبلی نے اس موقع کی نزاکت کو سمجھا اور اُردو نظم نگاری کے لئے کوشش جاری کیں۔ یہی وہ حالات تھے جس نے نظم نگاری کے لئے ذہنی پس منظر تیار کیا۔

---

[1] محمد عتیق صدیقی۔ گلکرائسٹ اور اس کا عہد ص ۱۵

[2] ڈاکٹر عندلیب شادانی۔ صحیفہ ص ۱۰

باب دوّم

آزادی سے قبل سیاسی، سماجی اور ثقافتی حالات کا جائزہ

یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ ہندوستان کی قدیم تاریخ بادشاہوں، شہنشاہوں اور امیر و امراء کے ساتھ نوابوں کی حکمرانی سے بھری پڑی ہے وقت اور حالات کے ساتھ ساتھ ان حکومتوں کے عروج وزوال کی داستان سے بھی واقف ہیں۔ اُس دور میں جنگ و دجال اور طاقت وقوت کے مظاہروں نے حکومتوں کے در و دیوار ہلا کر رکھ دیئے تھے۔ کہا جاسکتا ہے کہ ہندوستان کی تقریباً آٹھ ہزار پرانی تاریخ کے ابواب میں ایسے کئی جلیل القدر بادشاہوں کے قصّے ملتے ہیں جنھوں نے ارباب حکومت کے تئیں عدل و انصاف اور مساوات کو بھی اپنایا اور کبھی اپنے غیظ وغضب سے دشمنوں کا صفایا بھی کیا۔ ساتھ ہی فنونِ لطیفہ کے سبھی شعبوں پر نظرِ عنایت بھی کیا۔ اور خاص طور سے شعروادب میں خاطر خواہ اضافے کیے۔ چاہے سنسکرت زبان کی شاعری ہو یا علاقائی زبان میں لکھی گئی تخلیق ہر دور میں شاعروں اور ادیبوں نے اپنی فکر انگیز تخلیقات کے ذریعہ سماج کو ترقی کی راہیں فراہم کیں۔

جیسے جیسے زمانے وحالات میں تبدیلی آتی گئی۔ سوچ وفکر نے معاشرہ کو متاثر کیا۔ مغلیہ سلطنت کے خاتمے کے بعد خاص طور سے جنگِ پلاسی نے ہندوستانی تاریخ کو یکسر تبدیل کر دیا۔

سیاسی طور پر انگریزوں نے اپنی طاقت بڑھانی شروع کردی۔ اور پھر ہندوستان کی سلطنت پر قبضہ کرلیا۔

اس کے بعد ہندوستان دو سو سال تک غلامی کی زندگی جیتا رہا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد آزادی کی جدوجہد شروع ہوگئی۔ انگریزوں نے جس کو بغاوت کا نام دیا لیکن ہندوستان اور ہندوستانیوں کے لئے یہ پہلی جنگ آزادی تھی۔ ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کا مکمل طور پر خاتمہ ہوگیا۔ مسلمان بے یارومددگار ہوگئے بلکہ پوری طرح برباد ہوگئے۔ معاشرے میں ایک انتشار کی کیفیت پیدا ہوگئی تھی اُس زمانے کے ماحول پر نظر ڈالی جائے تو اُردو نظم کے آغاز وارتقاء سے بھی ہم واقف ہوسکتے ہیں۔ اس لئے سیاسی اعتبار سے اس زمانے کے حالات کا جائزہ لینا ناگزیر ہوجاتا ہے۔

☆ سیاسی حالات:

انگریزی دورِ اقتدار میں خاص طور سے انیسویں صدی کے آغاز ہی سے ملکی سیاست نے زبان وادب میں رخنے ڈالنے شروع کردیئے تھے۔ تعلیمی اور سماجی انقلاب واصلاح کی تحریکیں وجود میں آرہی تھیں۔ مرے پر سو دُرّے کے مطابق لارڈ میکالے کی ناعاقبت اندیشی نے ملکی زبان کو ذریعہ تعلیم بننے سے محروم کردیا تھا۔ اس کے پیچھے بھی سیاسی مقصد ہی کارفرما تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی اپنا سیاسی اقتدار قائم رکھنے کے لئے انگریزوں کو ہندوستانی زبانیں سکھانے اور ان سے واقفیت دلانے کے لئے کوشاں تھی تاکہ وہ ہندوستانیوں میں گھل مل کر ان کے ساتھ حاکمانہ برتاؤ کرسکیں۔

کہا جاتا ہے کہ سیاسی مسائل پر غور کرنا اور سیاسی اصول قائم کرنا انسان نے اُسی وقت سے شروع کردیا تھا۔ جب سماج کی تشکیل عمل میں آئی۔ ویسے بھی سماج میں قانون کی پابندی ضروری ہے۔ ورنہ روز کے اختلافات اور جھگڑے سماجی امن وسکون کو ختم کرسکتے ہیں۔

بقول ہیریک لی ٹس

"انسان کو اپنی زندگی قانون کے مطابق بسر کرنا چاہئے کیونکہ کائنات کا سارا کارخانہ بھی ایک مخصوص آئین کی پابندی سے چلتا ہے تمام انسانی قوانین ایک

اصول پر مبنی ہوتے ہیں جو بے حد مستحکم اور ان کا بوجھ اٹھانے کے لئے کافی ہے۔" [1]

اس بیان کی روشنی میں دیکھا جائے تو انگریزی دورِ اقتدار میں سیاسی حالات بہت ہی زیادہ ابتر تھے۔ ہندوستان جیسے ملک میں جہاں کئی مذاہب کے ماننے والے اور الگ الگ تہذیبی ورثے کے امین رہتے ہوں وہاں سیاسی طور پر مستحکم ہونا جوئے شیر لانے کے برابر تھا۔

ہمارے ماضی کے ادب میں شاہی نظام حکومت کی موجودگی کا اظہار تھا۔ اور ادب اس اعتبار سے اپنے عہد کی سیاسی شخصیتوں کا ترجمان تھا۔ اس عہد کے نظم و نثر میں انہی لوگوں کو مثال بنا کر پیش کیا کیا جاتا تھا۔ جو برسرِ اقتدار تھے۔ اور عوام الناس سے یہ توقع کی جاتی تھی کہ وہ طبقہ امراء و سلاطین کے نقشِ قدم پر چلیں۔ چونکہ ادیب ایک حساس وجود کا مالک ہوتا ہے اس لئے لازمی طور پر اس عہد کی سیاسی تحریکیں اور سیاسی مسائل اُسی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ لیکن یہ بات بھی اپنی جگہ درست ہے کہ ادب کو سیاسی میدان نہیں سمجھنا چاہیئے۔

بقول اختر انصاری:۔

"ادب اپنے دور کی سیاست کو کسی حال میں نظر انداز نہیں کر سکتا۔ جس زمانے میں سیاست اور سیاسی تنظیمیں صاحب اقتدار بالائی طبقہ کی ملکیت تھیں اور عوامی طبقے جمود اور بے حسی کا شکار تھے۔" [2]

☆ فوجی بغاوت:

تاریخ کی ورق گردانی سے یہہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ پہلی جنگ آزادی کا بگل ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے روپ میں بج چکا تھا۔ اور انگریزی حکومت کے خلاف عوام نے اپنے غم و غصہ کا اظہار کرنے کی ابتداء کردی تھی۔ رعایا عرصہ دراز سے پریشان تھی ہندوستانی فوج انگریزوں سے بددل ہورہی تھی۔ اور جب کلکتہ میں فوج کے لئے بنائے گئے کارتوس میں گائے اور سور کی چربی کے استعمال کی خبر عام ہوئی تو قیامت برپا ہوگئی اب تو فوجی بغاوت کی آگ میں مزید شدت پیدا ہوگئی۔

---

[1] تاریخ فلسفہ سیاست۔ پروفیسر مجیب ص ۳۰

[2] اختر انصاری۔ ادب اور سیاست، رسالہ منزل لکھنو ۱۹۰۴ء

☆ نئی اصلاحات:

انگریزوں نے اپنے دورِ اقتدار میں خاص طور سے لارڈ ڈلہوزی ۱۸۴۸ء تا ۱۸۵۶ء کے دوران ہندوستان میں صنعتی اور تمدنی معاملات میں کافی ترقی ہوئی۔ ہر طرف آمد ورفت کے ریل کا انتظام ہوا۔ ڈاک وتار کا رواج عام کیا گیا ٹیلیفون کے ذریعہ پیغام رسانی کی سہولت بھی مہیا کی گئی اور یہی تمام نعمتیں یا لعنتیں اور رسل ورسائل کی سہولتوں نے بدگمانی ونفرت، بے اطمینانی اور پریشانی کی وجہ سے ایک کونے سے دوسرے کونے تک پہونچ رہی تھی۔

☆ انگریز افسروں کی بے حسی:۔

اس سلسلے میں یہ بات قابل غور ہے کہ برطانوی افسران اقتدار کے نشے میں ہندوستانی فوجیوں کی جائز شکایت کو دور کرنے سے متعلق غیر سنجیدہ تھے۔ بلکہ وہ ہندوستانیوں کو سخت سے سخت سزائیں دینے پر تلے ہوئے تھے۔ مثلاً میرٹھ چھاؤنی میں جب ہنگامہ برپا ہوا تو پچاس سپاہیوں کو جس میں دیسی افسران بھی شامل تھے کورٹ مارشل کر کے دس دس سال کی سزا سنائی گئی۔ ہندوستانی سپاہیوں نے شورش کر کے حوالات کو توڑ دیا اور اپنے ساتھیوں کو چھڑا لیا۔ تمام دن میرٹھ میں قتل و غارت گری کا بازار گرم رہا۔ باغی سپاہی میرٹھ سے کوچ کرتے ہوئے دہلی پہنچ گئے۔ دہلی پر باغی سپاہیوں کا قبضہ ہو گیا۔ جس کی خبر آگ کی طرح تمام ہندوستان میں پھیل گئی تقریباً پانچ مہینوں تک بدامنی کا دور رہا۔ آخر کار بہادر شاہ ظفر قید کر لئے گئے۔

☆ پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو کی پالیسی:۔

بقول عبداللہ یوسف:۔

"یہ سب انگریزوں کی زیادتیاں اور زبردستیاں تھیں جنھوں نے ہندوستانیوں کو بغاوت پر اُکسایا" [1]

انگریزوں کی فتنہ پردازوں کا سلسلہ ایک عرصہ تک چلتا رہا۔ پہلے انہوں نے دہلی اور

---

[1] کلچرل ہسٹری آف برٹش آف انڈیا۔ عبداللہ یوسف۔ ص ۲۱۰

لکھنو کے درمیان پھوٹ ڈالوا کر دونوں حکومتوں کو الگ کر دیا۔ پھر ۱۸۰۱ء میں اودھ کا کچھ علاقہ اٹاوہ، فرخ آباد، اعظم گڑھ، گورکھپور، الہ آباد وغیرہ علاقے اودھ کو حفاظت کے بدلے میں اپنے قبضے میں لے لیئے۔ پھر ۱۸۳۷ء میں حکومت اودھ سے ایک اور معاہدہ کیا اور بدامنی پھیلنے کی صورت میں تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں لے کر اودھ پر قبضہ بھی کر لیا والیانِ اودھ نواب واجد علی شاہ انگریزوں کے فریب کا شکار ہو گئے اور سیاسی سوجھ بوجھ چھوڑ کر رنگ رلیوں میں ملوث ہو گئے۔

اس کے علاوہ انگریزوں کی اور بھی کئی زیادتیاں تھیں جن کی بدولت ہندوستانی محکوم غیر ملکی حاکموں سے بددل ہو رہے تھے۔ عوام کی زبان بندی تھی۔ ریاست میں ولیعہدی کے لئے لڑکوں کو متبنیٰ کرنے کی ممانعت تھی۔ قدیم ملکی رسم و رواج کے خلاف نئے قانون نافذ کئے جا رہے تھے۔ اور ان تمام اسباب کی بناء پر ہندوستانی عوام پریشان تھی۔ کہا جا سکتا ہے کہ ۱۸۵۷ء سے قبل سیاسی و سماجی بدحالی اور پریشانی روزگار زمانہ مختلف جماعتوں کی صورت اختیار کر لی تھی ۱۸۵۷ء اور اس کے فوراً بعد مسلمانوں کی حالت بالکل بے بس ہو گئی تھی انگریزوں کو لگتا تھا کہ مسلمان تمام اہم عہدوں پر قابض تھے اور غیر مسلموں کی حالت چند سکوں پر پلنے والے غلاموں کی طرح تھی انگریزوں نے غیر مسلموں میں یہ احساس بڑھایا کہ تم مسلمانوں کے رحم و کرم پر زندگی گذار رہے ہو اب مسلمانوں سے اقتدار جا چکا ہے اس لئے انھیں تمام نچلی صفوں میں ڈھکیلنے سے تمہیں اعلیٰ عہدے ملیں گے مسلمانوں کے حصے میں صرف قلی اور چپراسی کے سوا کوئی ملازمت نہ ملے اُن کا غرور اور حکمرانی کا نشہ اتارنا ضروری ہے تاکہ وہ احساسِ ندامت سے خود ہی مرجائے اور اُن میں احساس کمتری پیدا ہو اس بات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مسلمان کتنے کمزور ہو گئے تھے۔ ان کی سیاسی سکت ہی نہیں تھی کہ وہ اپنی قوم کے افراد کو اعلیٰ عہدوں پر معمور کرتے۔ اگر مسلمان سرکاری ملازمتوں کے قابل بھی ہوتے تب بھی انہیں ملازمت سے باز رکھا جاتا تھا۔ دوسرے معنی میں مسلمانوں کو سرکاری ملازمتیں نہیں دی جاتیں۔

☆ نئی تعلیمی پالیسی:۔

انگریزوں نے اپنے دورِ حکمرانی میں ہندوستانی عوام کے لئے تعلیم کی نئی راہیں استوار

کیں۔ یونیورسٹی اور کالج قائم کیے ان کا ماننا تھا کہ حکومت پر قبضہ جمائے رکھنا ہے تو پھر کچھ نہ کچھ اصلاحی کام کرنے ہی پڑیں گے۔ چنانچہ کلکتہ، مدراس، بمبئی وغیرہ مقامات پر یونیورسٹیاں قائم کی گئیں۔ ساتھ ہائی کورٹ ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ اور دیگر تعلیمی ادارے بھی قائم کیے گئے لیکن یہ ایسے علاقوں میں یا مقامات پر تھے جہاں سے مسلمان پوری طرح سے استفادہ حاصل نہیں کر پاتے تھے۔ چونکہ مسلمان آبادی زیادہ تر ہندوستان کے شمال یا مغربی ساحلوں پر ہی آباد تھی۔ اس کا نتیجہ یہہ نکلا کہ ہندوستان کے مسلمان تمام تجارتی، تعلیمی، صنعتی وتہذیبی مقابلوں میں دیگر اقوام ہند کے برابر نہ آسکے۔ اور حقیر وذلیل زندگی ان کا مقدر بنتی چلی گئی۔

لارڈ میکالے جس نے انگریزی تعلیم کا رواج قائم کیا تھا اگرچہ کہ اس اندازِ تعلیم نے زیادہ تر کلرک اور حاکم اور محکوم کے درمیان مترجم ہی پیدا کیے۔ مگر ساتھ ہی ساتھ کچھ اہل شعور حضرات واصحاب، نظر بھی تیار کیے۔ جو بین الاقوامی حالات پر نظر بھی رکھنے لگے اور ہمت اور جرات سے کام لیتے ہوئے سیاسی آزادی کے خواب بھی دیکھنے لگے۔ انہوں نے نئی تعلیمی پالیسی سے پورا فائدہ اٹھایا اپنے خوابوں کو حقیقت میں بدلنے کی تدبیریں بھی کرنے لگے۔

☆ سیاسی آزادی کا احساس:۔

ہندوستان کا تعلیم یافتہ طبقہ آہستہ آہستہ غلامی کی زنجیروں کو توڑ کر آزاد فضا میں زندگی گذارنے کے لئے پر تولنے لگا لہذا کچھ لوگوں نے یہ چاہا کہ ایک ایسی سیاسی جماعت بنائی جائے جو جائز اور مناسب طریقے پر ملکی ضروریات اور قومی مطالبات کے تحت برطانوی حکومت کے سایہ میں کچھ خود مختاری اور آزادی مل جائے۔ چنانچہ اس حکمت عملی کے تحت ایک ریٹائرڈ انگریز افسر اے۔ یو۔ ہیوم نے ۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس کی بنیاد ڈالی جو کچھ عرصہ تک انگریزی حکومت کی سرپرستی میں کام کرتی رہی لیکن جلد ہی ہندوستان کے متوسط طبقہ نے اس ادارے سے اپنی ناراضگی اور بے چینی کو حکومت تک پہنچادیا۔ جس کی وجہ سے انڈین نیشنل کانگریس، یہ جماعت حکومت وقت کو کھٹکنے لگی۔ سرکاری ملازم کو اس جماعت کے جلسوں میں جانے سے روکا جانے لگا۔

سیّد احتشام حُسین کے خیال میں:

"انڈین نیشنل کانگریس کو انگریزوں کی دین اور پہلا قومی ادارہ کہنا درست نہیں

کیونکہ اس احساس میں آزادی کی دو جماعتی شکلیں برٹش انڈیا سوسائٹی ...
۱۸۴۳ء۔ برٹش انڈیا اسوسی ایشن ۱۸۵۱ء بمبئی اسوسی ایشن ۱۸۵۰ء بنگال نیشنل لیگ انڈین اسوسی ایشن کلکتہ، سروجنک سبھا پونا ۱۸۷۵ء نیو اسوسی ایشن مدر اس مہا جن سبھا مدراس ۱۸۸۴ء جیسے اداروں کی صورت میں نمودار ہو چکی تھیں۔(۱)

احتشام حسین کی بات سچ ہے لیکن اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ انڈین نیشنل کانگریس ہی نے تحریک آزادی کو پروان چڑھایا۔ اور اس قسم کے دوسرے قومی اور مقامی اداروں کی اہمیت کم کر دی۔

اس دور کی سیاست کے پس منظر میں اگر دیکھیں تو کہا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کی سیاست کا رنگ کچھ عجیب غیر متعین تھا۔ کبھی یہ لوگ ملی جلی وطنی اور انقلابی تحریکوں میں اپنا فائدہ سمجھتے اور کبھی برطانوی اقتدار کی پیدا کی ہوئی مصلحت آمیز بدگمانیوں کو محسوس کرتے ہوئے۔ پرانی کدورت انفرادی کشاکش کو یاد کرتے ہوئے الگ رہنا ہی پسند کرتے۔ کبھی تو اہل وطن سے گلے ملنے کے لئے پوری طاقت سے دوڑ پڑتے اور کبھی ملنے سے بھی جھجھکتے تھے۔ یہ صورت حال زیادہ دنوں تک قائم نہ رہی۔ اور مسلمانوں میں دو فرقوں نے جنم لیا۔ ایک فرقہ انگریزوں کو ہمدرد اور مخلص سمجھنے لگا۔ اور ان کا طرفدار ہو گیا۔ دوسرا فرقہ انگریزوں کے خلاف برادران وطن کی انقلابی تحریکوں کا ہم نوا اور طرفدار بن گیا۔

کہا جاتا ہے کہ کانگریس کے پہلے سالانہ جلسے میں جو ممبئی میں ہوا اس میں صرف گنتی کے بارہ مسلمان تھے۔ لیکن دوسرے سالانہ جلسے میں ان کی تعداد ۳۳ تھی۔

ادھر ۱۸۸۶ء میں سر سیّد احمد خاں نے انڈین نیشنل کانگریس کے مقابلے میں علیحدہ جماعت قائم کی جس کا نام آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس رکھا۔ جس کا مقصد مسلمانوں کے سیاسی، سماجی، تعلیمی اور تہذیبی قسم کی ذمہ داریاں سمجھنا قرار پایا۔ سر سیّد نے اپنے دوسرے سالانہ جلسے میں انڈین نیشنل کانگریس کی مخالفت کی اور مسلمانوں کو کانگریس سے دور رہنے کی ہدایت بھی کی۔ یعنی مسلمانوں کے دو فرقے آسانی سے منظر عام پر آ گئے۔ ایک کانگریس کا شریک اور دوسرا

(۱) سیّد احتشام حسین: علی گڑھ میگزین۔ علی گڑھ نمبر صفحہ ۳۳

اپنی دنیا الگ بنانے کا قائل پایوں کہئے کہ ایک انگریزوں کا مخالف اور دوسرا مادر وطن کا شیدائی لیکن دوسرا برطانوی حکومت کا ہمنوا طرفدار اور حکومت میں اقتدار حاصل کرنے کا مشتاق بن گیا۔

☆ کانگریس کی مقبولیت:۔

ہندوستان میں مسلمانوں کے یہ دوہرے رجحانات سیاسی اور سماجی زندگی میں ایک عرصہ تک کام کرتے رہے لیکن انڈین نیشنل کانگریس کی مقبولیت ہر طبقہ میں روز بڑھتی رہی۔ اور ہندو مسلم تناؤ کی کیفیت جو تقریباً ۱۸۶۰ء کے آس پاس وسیع سے وسیع تر ہوتی گئی تھی۔ ۱۸۹۰ء تک پہنچتے پہنچتے بہت کم ہوگئی۔ انڈین نیشنل کانگریس کے چھٹے سالانہ جلسے میں جو کلکتہ میں منعقد ہوا اس میں تقریباً ۲۲ فیصد مسلمانوں نے شرکت کی۔ کہا جاتا ہے کہ اس اجلاس میں ۱۵۶ Deligates مسلمان تھے۔ اس دوران ہندو اور مسلمانوں میں بھائی چارگی، حب الوطنی اور قومی یگانگت پائی جانے لگی۔ جو ہندوستانی سماج کے لئے بے حد اہمیت رکھتی ہے۔

> یہہ اجلاس کافی ہنگامہ خیز ثابت ہوا انگریزوں کو بھی اندازہ ہو گیا کہ ہندستانیوں کے دل ان کی طرف سے غبار آلود ہو گئے ہیں۔ اور مسلمان بھی ان سے دور ہوتے نظر آنے لگے۔ ہندوستانیوں کی اجتمائی کوشش اور انقلابی تحریکوں کے زیر اثر انگریزوں نے انڈین لیجسلیٹو کونسل کے لئے عام انتخابات کا اصول مان لیا۔ ممبروں کا انتخاب عوام کے ووٹوں کے ذریعہ کرنے کا فیصلہ ہوا۔ لیکن ساتھ ہی برطانوی ارباب مجاز اور مدبّروں کے سیاستدانوں کو یہ بات کافی خطرناک لگی۔ انہیں اس بات سے سخت صدمہ پہنچا کہ جس قوم کو ہندستان کے برسرِ اقتدار قوم یعنی مسلمانوں کے مقابلے ابھارا اور اپنا آلہ کار بنایا اپنی مرضی

کے مطابق استعمال کیا وہی قوم اب آنکھیں دکھا رہی ہیں۔ انگریزوں کو یہہ ہندو مسلم اتحاد راس نہیں آیا۔

انھوں نے پھر سیاسی چالیں چلنی شروع کر دیں۔ اور ہندو مسلم خلیج پھر سے وسعتیں اختیار کرنے لگی۔ شاید یہی وجہ تھی انگریزوں نے مصلحت پسندی سے کام لیتے ہوئے مسلمانوں کی سیاسی، سماجی، تعلیمی، اور تہذیبی اصلاحات میں سر سیّد احمد خاں اور ان کی تحریک کا ساتھ دیا۔ اور

مسلم قومیت کی تشکیل ایک علحیدہ صورت میں ابھرنے لگی۔

☆ سرسیّد تحریک یا علی گڑھ تحریک:

مسلمانوں میں سرسیّد احمد خان ایک مدبّر، فلسفی سماجی مصلح اور تعلیمی سفیر بن کر ابھرے۔ انہوں نے اپنی دوراندیشی، جفاکشی، اخلاص اور حوصلہ مندی سے کام لیتے ہوئے مظالم کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔اس لئے وہ سمجھ چکے تھے کہ انگریز حکام سے تعاون ہی کے ذریعہ قومی اور فلاحی کام کئے جاسکتے ہیں۔اسی زمانے مین ہندی اور اردو کا جھگڑا بھی شروع ہوگیا تھا۔اس سے بھی وہ بدل ہوگئے تھے۔ایک جلسہ میں تو انہوں نے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ بقول حاؔلی۔

> ''اب ان کو یقین ہوگیا کہ ہندو مسلمان کسی کام میں دل سے شریک نہ ہوسکیں گے۔اور ہندو مسلمانوں کا بطور ایک قوم کے ساتھ چلنا اور دونوں فرقوں کو ملا کر سب کے لئے مشترک پروگرام بنانا قطعاً ناممکن ہے۔''[1]

سرسیّد مسلمانوں کی بدحالی، پریشانی، بے روزگاری اور اضطرابی کیفیت سے متفکّر تھے۔ساتھ ہی ہندوستانی سیاست جس رخ پر چل رہی تھی اس سے مایوس بھی ہوگئے تھے۔یہاں تک کہ وہ ہندستان چھوڑنے اور مصر میں بس جانے کے بارے میں غور کرنے لگے۔لیکن پھر قوم کو اس طرح بربادی وتباہی کے دہانے پر چھوڑ کر نکل جانا انہیں گوارہ نہ ہوا۔اورانہوں نے ہوا کے رخ کے مطابق سیاسی، سماجی اورادبی سطح پر مسلمانوں کو انگریزوں کے قریب لانے کی کوششوں میں جٹ گئے۔

سرسیّد احمد خاں کے ساتھ سیاسی دنیا میں شبلی مولانا محمد علی جوہر، ظفر علی خاں، حسرت موہانی، نواب حمید اللہ خاں، شیخ عبداللہ، سر رضا علی، مولانا شوکت علی، وغیرہ نے بھی اپنے کارناموں سے قوم کی ذہنی نشونما مین کارہائے نمایاں انجام دیئے۔

☆ بیسویں صدی کے سیاسی حالات:

زیادتی ہوگی اگر ہم بیسوی صدی کے حالات کا جائزہ نہ لیں۔کیونکہ اردو نظم نگاری

(۱) الطاف حسین حالی۔حیات جاوید۔صفہ ۲۰۰

کے لئے جس طرح سیاسی سماجی اور ادبی ماحول پیدا ہوا تھا اس سے صرف نظر کر کے ہم آگے نہیں بڑھ سکتے۔ ویسے تو بیسوی صدی کے ابتدائی زمانے میں ادبی لحاظ سے غزل کو اہمیت حاصل تھی لیکن رفتہ رفتہ نظم کی طرف شاعر راغب ہونے لگے۔ روائتی شاعری کی بجائے ترقی پسند خیالات سے متاثر ہو کر ایک تحریک ابھرنے لگی۔ جسے بعد میں ترقی پسند تحریک کہا گیا۔

اگر بیسویں صدی کے ابتدائی زمانے کو سیاسی نوعیت سے دیکھا جائے تو یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے بیچ خلیج کو بڑھانے کا کام انگریزوں نے شروع کر دیا تھا۔ اور اس کا عملی نمونہ لارڈ کرزن کا ۱۹۰۵ء میں تقسیم بنگال کا واقعہ ہے۔ جس کی بدولت ہندوؤں اور مسلمانوں میں حب الوطنی کے جذبے کو کافی نقصان پہنچا اس دورِ حکومت میں ہندوستانیوں پر کافی مظالم ڈھائے گئے۔ حاکم اور محکوم کے درمیان جنگ چھڑ گئی اس دوران مسلمانوں کو سیاسی طور پر ایک نیا پلیٹ فارم قائم کرنے کا موقع ملا اور ۱۹۰۶ء میں انڈین نیشنل مسلم لیگ قائم کی گئی۔

☆ خلافت تحریک:

سب سے زیادہ جس تحریک نے ہماری سیاست اور فکر و نظر پر خاص اثر ڈالا وہ خلافت تحریک ہے۔ کہا جاتا ہے کہ انیسویں صدی کے آخر میں ترکستان کے سلطان عبدالحمید نے ایک پان اسلام ازم کی تحریک چلائی اور شہنشاہیت کو بچانے کے لئے کوشش کی۔ لیکن یہ تحریک زیادہ نہ بڑھ سکی۔ اور ۱۸۰۸ء میں ترک نوجوانوں نے خلیفہ عبدالحمید کا تختہ پلٹ دیا۔ اور جمہوری حکومت کی بنیاد رکھی۔ تقریباً ۱۹۱۲ء کے قریب ہندوستان میں اسی قسم کی تحریک خلافت کے نام سے شروع کی گئی۔ اس کا اصل مقصد مذہب اور سیاست کو ساتھ لیکر چلنا تھا۔

ساتھ ہی دیگر مسلم ممالک سے راہ و رسم بڑھا کر اقتصادی اور ذہنی صلاحیت کو پروان چڑھانا تھا۔ اور ہندوستان کو غیر ملکی حکومت کے مظالم سے آزاد کرانا تھا۔ اس تحریک نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو پھر سے متحد کر دیا۔ اب ایسا زمانہ آ گیا تھا کہ ہندو مسلمان متحد طور پر آزادی کا مطالبہ کر رہے تھے۔ مسلم لیگ اور کانگریس دونوں سیاسی پارٹیاں ہندوستان کو آزاد کرانے کے لئے کندھے سے کندھا ملا کر چل رہی تھیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ غیر ملکی حکومت کی بنیادیں ہل

گئیں۔اور انگریز یہ سمجھ گئے کہ اب وعدوں کا سبز باغ دکھانے سے کام نہیں چلنے والا۔اور اب وقت آگیا ہے کہ کچھ مراعات بھی دینے ضروری ہیں۔ چنانچہ رولٹ کمیشن مقرر کیا گیا۔لیکن عراق سے انتشار اور جنگ کے آثار ابھر آئے اس دوران مانٹیسکو چیمسفورڈ نے اصلاحات کا کام شروع کیا۔اور ہندوستان کے لئے ذمہ دار حکومت قائم کرنے کی تجویز پیش کی۔

اب آزادی کی جدو جہد مین زیادہ پختگی آگئی۔اور پوری طاقت سے آزادی کی تحریک چلنے لگی۔اس دوران جلیان والا باغ کا واقعہ پیش آیا۔جس مین جنرل ڈائر نے انقلاب پسند عوام پر گولیان برسائی اور پھر اس کے نتیجہ میں ترکِ موالات عدم تعاون کی تحریکوں نے زور پکڑا۔مجبوراً حکومت برطانیہ نے یہ بات تسلیم کرلی کہ عالمی جنگ کے خاتمہ کے بعد ہندوستان کو آزاد کردیا جائیگا۔

☆ گاندھی جی اور ستیہ گرہ:

سنہ ۱۹۲۰ء کے آس پاس موہن داس کرم چند گاندھی نے عملی طور پر ہندوستانی سیاست میں قدم رکھا۔اس سے قبل بال کرشن گوکھلے، بال گنگا دھر تلک، ہندوستانی عوام کی رہنمائی کررہے تھے۔

گاندھی جی چاہتے تھے کہ برطانیہ اپنا وعدہ پورا کرے لیکن انھیں احساس ہوگیا کہ انگریزی حکومت صرف وعدوں پر اکتفا کئے ہوئے ہے تو انہوں نے ہندوستان میں تین مقامات پر ستیہ گرہ شروع کردی۔جو مقام انہوں نے منتخب کیئے اُس میں کھیرا، لورسا اور چمپارن تھے۔اس تحریک میں گاندھی جی کے ساتھ ہندو مسلمان سکھ سبھی شریک تھے۔اسی دوران جمعتہ العلماء کی بنیاد بھی پڑ چکی تھی اور سب ملکر آزادی کا مطالبہ کررہے تھے۔

اب تمام لوگوں نے مل کر سوراج کی تجویز رکھی اور مکمل آزادی کا نعرہ لگایا۔پرنس آف ویلز کی آمد پر ان کے استقبال کا بائیکاٹ کیا گیا۔آئنی عدول حکمی کی تحریک چلائی گئی۔باردولی کے مقام پر ٹیکس کی عدم ادائیگی کی تحریک شروع کی گئی اور آزادی کے لئے جدو جہد اپنے شباب پر پہنچنے لگی۔

آخر کار لارڈ ماونٹ بیٹن کے زمانے میں ہندوستان کو آزادی دلانے کا مام سونپا گیا۔ دن بدن انگریزوں کی ریشہ دوانیاں بڑھتی گئی انہوں نے مسلمانوں اور ہندوؤں کے بیچ نفرت کی کھائی کو بڑھانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔آخر کار اس کے نتیجہ میں دو قوم اور دو ملک کا نظریہ سامنے آیا۔مسلم لیگ نے کانگریس سے علیحدہ ہو کر پاکستان کا مطالبہ کیا۔اور اس طرح تمام سیاسی

حالات کے پیشِ نظر ہندوستان آزاد ہو گیا۔ لیکن دنیا کے نقشہ میں دو ملک ہندوستان اور پاکستان کا وجود عمل میں آ چکا تھا۔

یہی تھے وہ سیاسی حالات جس سے متاثر ہو کر ہماری ادبی وراثت آگے بڑھی اور ساتھ ہی ادیبوں اور شاعروں نے اس دور کی کربنا کیاں، زیادتیاں اور خواہشیں وارمان کو اپنی تخلیقات میں جگہ دی خاص طور سے اس دور کی نظم نگاری میں اس دور کے حالات کی عکاسی ملتی ہے۔

☆ سماجی اور معاشی پس منظر:

سماج کے لغوی معنی گروہ یا اجتماع کے ہیں جس سے مراد مل جُل کر رہنے کے ہیں۔ ایسے انسانی گروہ اور اجتماع کو عربی زبان میں معاشرہ کہا جاتا ہے اور انگریزی میں Society جیسے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں۔ چونکہ سماجی زندگی افراد سے ملکر بنتی ہے۔ اس سے عوام کے انفرادی مفاد میں دوسروں سے مدد لینا اور انہیں امداد پہونچانا یہی احساس سماج کی تنظیم کا محرک بنتا ہے۔ اور ساتھ ہی انفرادی اور مجموعی مفاد میں تصادم سماجی مسائل کو جنم بھی دیتا ہے۔

سماجی زندگی کی بنیاد خاندانوں کے آپسی میل ملاپ سے پڑی چند خاندانوں نے ملکر گاؤں کی بنیاد رکھی۔ گاؤں ترقی کر کے شہر بن گیا۔ اور کئی شہروں کی وجہ سے ملک بنا۔ جس قدر انسانی گروہ میں وسعت پیدا ہوئی سماج کا دائرہ بڑھا۔ آپسی رشتوں کی اہمیت بڑھی سبھی مل جل کر رہنے کا رجحان وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا۔ خاندان کا فرد چاہے چھوٹا ہو یا بڑا چاہے مرد ہو یا عورت سبھی باہمی اتحاد کے فطری رشتوں میں بندھ گئے۔ کہا جاتا ہے کہ مجموعی مفاد کے پیشِ نظر فرائض کی انجام دہی کے اس احساس پر سماجی زندگی کا انحصار ہے۔

علم سماجیات کے نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ آغاز میں انسانوں کی کسی بھی بڑی تعداد کو جو ایک مخصوص علاقہ میں رہتی تھی۔ سماج کہا جاتا تھا جیسے جیسے دیہاتی زندگی سے ترقی کرتے ہوئے لوگ شہر آباد کرنے لگے ویسے ویسے شہری زندگی میں آرام و آسائش کے وسائل کی وجہ سے ترقی یافتہ انسانی جماعت کو سماج کہا جانے لگا۔ آج بھی شہروں سے دور گاؤں بھی ہمارے سماج کا اٹوٹ حصہ ہیں۔

ہندوستان جیسے وسیع و عریض ملک میں سماجی نقطہ نظر سے غور کیا جائے تو کہا جا سکتا ہے

کہ اس ملک کی سماجی جڑیں کافی گہری ہیں۔ چونکہ سماجی ترقی اور شہروں کی بنیادوں نے اس ملک کے سماج کو نئی روشنی سے ہمکنار کیا۔ آہستہ آہستہ سماجی ضرورتوں نے نئی نئی ایجادات کو اپنایا اور پھر اپنے ملک کی......

تعمیر و ترقی میں معاون و مددگار ثابت ہوئے۔ وقت اور حالات نے ضرورت کے مطابق سماجی طبقوں کو جنم دیا۔ امیر غریب کی کھائی بڑھتی گئی۔ اور سماج کے آپسی ٹکراؤ نے ملک کی سماجی تاریخ میں کئی اہم موڑ پیدا کر دیئے۔ اگر غور کیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ ہندستانی سماج بھی مخصوص کردار کے حامل مختلف طبقوں۔ گروہوں، اور جماعتوں کا مجموعہ ہے۔ بلکہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہندستانی سماج کثرت میں وحدت کا حامل ہے۔ ہندستانی سماج مین دو بڑے طبقے مذہبی اعتبار سے تسلیم کیئے جاتے ہیں۔ ایک ہندو دوسرے مسلمان۔ ابتداء میں ان دونوں طبقوں کے عادات واطوار اعتقادات اور طریقہ زندگی میں نمایاں فرق پایا جاتا تھا صدیوں کے باہمی اختلاف اور ارتباط نے رفتہ رفتہ دونوں کی عام زندگی میں اشتراک پیدا کیا۔ اور بعض معاملات میں ہندو مسلم میں فرق کرنا مشکل معلوم ہونے لگا۔ صدیوں تک مسلسل ایکدوسرے کے پہلو بہ پہلو زندگی بسر کرنے اور ایکدوسرے کے غم وخوشی میں شریک ہونے سے دونوں طبقے بڑے بڑے تاریخی حادثات سے یکساں طور پر متاثر ہوئے۔ خاص طور سے اٹھارویں۔ انیسویں اور بیسویں صدی کے وسط تک دونوں طبقوں کی قسمتوں پر سیاسی، معاشی، اقتصادی، محکومی اور غلامی کے زنجیروں کی بیڑیاں پڑی رہیں۔ اور سامراجی قہر وعذاب اور جبر وتشدّد سے ملک اور اپنے آپ کو بچانے کے لئے انہیں سخت ترین جدوجہد کرنی پڑی۔

☆ نسلی امتیاز:

ہندوستان کی برسوں کی تاریخ نے سماجی طور پر ایک قسم کے نسلی امتیازات کو اپنائے ہوئے پایا۔ آریاؤں کی آمد سے دراوڑیوں کو کمتر گردانا پھر طبقاتی سماجی نظام جس میں برہمن، چھتری، ویش، اور شودر کی درجہ بندی عام تھی۔ جب مسلمان اسلامی تہذیب وتمدن کی میراث لے کر ہندستان میں داخل ہوئے۔ وہ بھی اسلام کے پیروکار تھے۔ مگر نسب ونسل کے اعتبار سے عربی تھے۔ اپنے آپ کو ایرانیوں سے برتر سمجھتے تھے۔ لیکن ہندستان میں ان کا سابقہ جس نسل سے

پڑا وہ ان سے بھی اپنے آپ کو برتر مانتے تھے۔ خاص طور پر برہمنوں نے خود کو اعلیٰ و برتر سمجھے گر پیشہ ور جماعتوں کو اچھوت کا درجہ دے رکھا تھا۔

☆ بقول رام آسر اراز:

"محکوم رعایا کی حیثیت سے انھوں نے مسلم حکمرانوں کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا لیکن سماجی اعتبار سے انہوں نے مسلمانوں کو بھی شودروں ہی کی صف میں جگہ دی"۔[1]

یہہ اور بات ہے کہ مسلم حکمرانوں نے اس کی شکایت نہیں کی۔ اسلامی مبلغوں کے ذریعہ ایک بڑے شودر طبقے کی ہمدردی حاصل کرنی اور انہیں حلقہ بگوش اسلام کرلیا۔ اسلامی نظریہ سے متاثر ہو کر کئی اعلیٰ ذات کے ہندوؤں نے بھی اسلام قبول کرنا شروع کیا۔

☆ باہمی موافقت:

ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں کوئی بھی خود کفیل نہ تھا۔ اس لئے ضروریات زندگی کے حصول کی خاطر ایکدوسرے سے باہمی رشتہ بنانا ان کے لئے لازمی تھا۔ اس ضرورت نے دونوں کے رہن سہن میں نکھار پیدا کیا۔ یہہ بات بھی اہم ہے کہ جن لوگوں نے اسلام قبول کیا وہ سماجی اعتبار سے اپنے رنگ و پے میں رچی بسی قدیم ہندستانی روایات سے مکمل طور سے پر منحرف نہ ہو سکے۔

ایسے نو مسلم خاندانوں نے اسلام میں لچک پیدا کردی اسلامی روایات اور طرز زندگی کے ساتھ وہ ہندوستانی مقامی رسم و رواج اور دیگر سماجی روایات کو اپنانے لگے اور رفتہ رفتہ ان کے آپسی میل جول سے ہندستانی سماج کا سنگم بن گیا۔

سیّد صباح الدین عبدالرحمن رقمطراز ہیں۔ پنجاب کے بہت سے مسلمان مکتی اور لاچی جیسے دیوتاؤں کی پرستش کرتے ہیں۔ امرتسر کے میراتی دُرگا بھوانی پر نذریں چڑھاتے ہیں۔ پنڈی کے مسلمان چیچک کی دیوی (ماتا) کی پوجا کرتے ہیں۔ یوپی کے مسلمان بھاٹوں کے یہاں برہمن پروہت سنتے ہیں۔ کچھ کے بعض میمن ہندوؤں کی طرح جسم پر بھبھوت ملتے ہیں۔ پنجاب کے بعض

---

[1] رام آسر اراز۔ اُردو شاعری ص ۱۳

مسلمان فقراء دھونی بھی رماتے ہیں۔ یوپی کے چوٹی ہار کالکا مائی کی پوجا کرتے ہیں۔ اور ہندوؤں کی طرح سرادھ کی رسم ادا کرتے ہیں۔ مشرقی بنگال کے ترک نو اسلکشمی دیوی کے سامنے جھکتے ہیں۔ اور مغربی بنگال کے مسلمان فقیر لکشمی دیوی کے سامنے گیت گاتے ہیں۔ مدراس کے دورکلد دسہرہ میں ہتھیاروں کی پرستش کرتے ہیں۔ ''[1]

درج بالا اقتباس سے یہ تو پتہ چلتا ہے کہ جن لوگوں نے اسلام قبول کیا۔ وہ اپنے روائتی رسم ورواج سے پوری طرح منحرف نہیں ہوئے اپنے سماجی رسم ورواج کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا یہ بات صرف مسلمانوں میں ہی عام نہیں ہے۔ بلکہ کئی دیگر قومیں بھی اسلامی عقائد کو مانتی ہیں۔ مرزا محمد حسین قتیل لکھتے ہیں۔

ہندستان میں ایک جماعت (شوی) کہلاتی ہے انکی عادت یہ ہیکہ رمضان کے چاند کی پہلی تاریخ سے لے کر آخری تاریخ تک خوب نمازیں پڑھتے ہیں۔ روزے رکھتے ہیں۔ اور کلام پاک کی تلاوت بھی کرتے ہیں رات رات بھر عبادت کرتے ہیں پانچوں وقت کی نمازیں حنفی سنیوں کے مسلک کے مطابق ادا کرتے ہیں۔ اور ہندو مذہب کے روزے (برت) بھی نہیں چھوڑتے ....

ایک طرف میں تعزیہ داری کرتے ہیں۔ فقراء اور مساکین کو کھانا کھلاتے اور شربت پلاتے ہیں۔ دوسری طرف کالکا کے سامنے رقص بھی کرتے ہیں۔[2]

کہا جاسکتا ہے کہ دونوں طبقے ایکدوسرے کی اچھائیوں اور برائیوں سے متاثر ہورہے تھے اوہام پرستی مسلمانوں میں بھی سرایت کرنے لگی۔ نظر بد سے بچاؤ کے لئے صدقہ اتارنا سفر پر جانے سے پہلے منتر بندھ کرا کے بازؤوں پر باندھنا وغیرہ جیسی روائتیں چل پڑیں۔ اور یہ روایات آزاد ہندوستان میں آج بھی کئی دیہاتوں میں دیکھنے کو مل جاتی ہیں۔ دراصل یہ عمل باہمی موافقت ہی کی دین ہے۔

---

[1] سید صباح الدین عبدالرحمٰن ہندوستان کے سلاطین، علماء اور مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر ص ۱۹۷

[2] مرزا محمد حسن قتیل ہفت تماشہ۔ دہلی ص ۴۵

☆ سماجی ہم آہنگی:

سماج میں جو رسم و رواج تھے وہ ہندوؤں اور مسلمانوں نے ایکدوسرے سے اپنائے اس کی کئی مثالیں ہمیں مل جاتی ہیں۔ اسلامی نظریات سے متاثر ہو کر ہنداؤوں میں سماجی بندھن کمزور پڑنے لگا۔ دوسری طرف ذات پات کا زہر مسلمانوں میں عام ہونے لگا۔ اور شیخ، مغل، سیّد، پٹھان وغیرہ کے علاوہ کئی رزیل اور شریف ذاتوں میں امتیاز برتا جانے لگا۔ اس لحاظ سے دونوں جماعتوں میں ہم آہنگی پائی جانے لگی۔

شادی بیاہ کے موقعوں پر ہونے والے شگون بدشگون کا رواج بڑھا۔ یہاں تک کہ بیواؤں کی شادی جو مسلمانوں میں جائز تھی مگر ہندوؤں میں ناجائز مانی جاتی تھی۔ اس کا اثر بھی مسلمانوں پر پڑنے لگا۔ بیوہ سے شادی کرنا گناہ تصور کیا جانے لگا بعد میں راجہ رام موہن رائے کی اصلاحی تحریک کے ذریعہ بیوہ سے شادی کو جائز مانا جانے لگا۔

مذہبی امور میں بھی ہم آہنگی دیکھی جانے لگی۔ ہندو دیو دیوتاؤں کی پرستش کے زیرِ اثر درگاہوں کا رواج عام ہوا۔ منتیں مانگنا، نذریں چڑھانا وغیرہ کا رواج اپنایا گیا رتھ یاترا اور دسہرہ کا رواج اور رتھ یاترا اور دسہرہ کے نمونوں پر محرم میں تعزیے نکالے جانے لگے۔ اسی طرح سماجی ہم آہنگی وسیع سے وسیع تر ہوتی گئی ہندوستان کی آزادی تک یعنی ۱۹۴۷ء اور پھر اس کے بعد بھی مذکورہ تمام باتیں سماج میں پائی جاتی رہیں۔

☆ طرزِ معاشرت:

زندگی گزارنے کے طریقے یا ایک دوسرے سے سماج میں میل ملاپ بڑھانے کے لئے اپنائے جانے والے اصول و ضوابط انسانی طرزِ معاشرت کے لئے کافی اہمیت رکھتے ہیں۔ روزمرہ کے معاملات بود و باش، لباس، کھانے پینے کے طریقے پکوان وغیرہ یہ سبھی کچھ طرزِ معاشرت کے زمرے میں آتے ہیں۔ ساتھ ہی زیور سے برتن تک خوراک سے پوشاک تک بھی کچھ میں معاشرتی ہم آہنگی اس دور کے سماج کی اہم کڑی ہے۔ ساتھ ہی رسم و رواج کو بھی دونوں فرقوں نے اپنا لیا تھا۔

بچے کی پیدائش ہو یا شادی بیاہ کی تقریب ہر موقع پر ہندو مذہب کے اثرات مسلمانوں میں نمایاں تھے۔ کہا جاسکتا ہے کہ ہندوستانی سماج مذہب اور معاشرت میں اسقدر جڑے ہوئے تھے کہ انھیں علحیدہ کرنا ناممکن سا ہوگیا تھا۔ آج بھی بعض معاملات میں یہ یکسانیت دکھائی دیتی ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ آزادی سے قبل ہندوستان میں قومی یکجہتی کو فروغ ملتا رہا۔ ہندو مسلم اتحاد کا مقصد قوم کو سامراجی حکومت کی غلامی سے نجات دلانا تھا۔ جنگ آزادی نے محبان وطن کو ملک و قوم کی تعمیر و تشکیل کے لئے ایکدوسرے کا ساتھ دینے آپسی بھائی چارگی کو بڑھاوا دینے کے مواقع فراہم کئے۔ لیکن چند مفاد پرستوں نے اس فضاء کو مکدر کرے کی کوشش بھی کیں۔ انگریزوں نے اپنی عنانِ حکومت قائم دائم رکھنے کے لئے دونوں اقوام یں پھوٹ ڈالنے اور ایک دوسرے کے خلاف نبرد آزما کروانے کے لئے کئی حربے استعمال کئے۔

دشمنوں کی کوششیں کسی قدر بروئے کار آئیں اور نتیجہ کے طور پر فرقہ وارانہ ذہنیت پروان چڑھنے لگی۔ مہاتما گاندھی نے ہر ممکن کوشش کی کہ یک جہتی قائم رہے۔ اور اسی لئے انہیں اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑا۔ یوں بھی ہندوستان دیہاتوں اور گاؤں کی فضاؤں میں سانس لینے والا ملک ہے۔ یہاں کا کاشتکار اور زمیندار مسلمان اور ہندوؤں کے ساتھ مل جُل کر رہنے کی کوشش ضرور کر رہے تھے۔ پھر ہندوستانی سماج کو دوقومی نظریہ سے کوئی نہ بچاسکا۔ انگریزوں نے بڑی چالاکی سے یہ بات عوام کے ذہنوں میں بٹھادی کہ ہندو اور مسلمان دو علحیدہ قومیں ہیں۔ اس لئے وہ کبھی یک جہتی سے نہیں رہ سکتے۔

ادھر یہ بھی بات اڑائی گئی کہ مسلمانون نے ہندوؤں کا مذہب تبدیل کروایا۔ اس لئے ہندو مذہب خطرے میں آگیا۔ لہذا ہندوؤں میں کٹر قدامت پرست لوگوں نے ہندو مہاسبھا اور ان جیسی تنظمیں قائم کیں۔ ادھر مسلمانوں میں یہ بات گھر کرگئی کہ اسلام کو ہندوؤں سے خطرہ ہے۔ انگریز دونوں فرقوں میں پھوٹ ڈالنے میں کامیاب ہو ہی گئے۔ اس لئے ہندوستانی سماج دو قومی نظریہ سے کافی متاثر ہوگیا۔

☆ سماجی طبقات:

یہہ بات تو سبھی جانتے ہیں کہ سماج میں زمانہ قدیم سے ہی طبقات کا وجود ہے حاکم و

محکوم، راجہ و پرجا، اس کے ساتھ ہی حکومت کا کاروبار چلانے کے لئے امیر، امراء، وزیر، سپاہی، تاجر، وغیرہ بھی ضروری طبقات تصور کئے جاتے ہیں۔ ویسے تو ہندوستان میں آریاؤں کی آمد کے بعد سے ہی سماج چار طبقات میں تقسیم ہو چکا تھا اور یہ طبقے انگریزی دورانِ حکومت میں بھی رائج تھے اور مسلمان حکمرانوں کے دوران حکومت میں بھی ہر طبقہ اپنے اپنے کاروبار اور اپنی اپنی ذمہ داریوں کے بل بوتے پر زندگی گذار رہا تھا مثلاً (۱) برہمن:

برہمن کا کام پوجا پاٹ کرنا۔ حکومت چلانے کے لئے راجہ کی مدد کرنا، قوانین کی عمل آوری سے متعلق مشورہ دینا تھا۔

(۲) چھتری:

حکومت یا سلطنت کو قائم رکھنے نیز سرحدوں کی حفاظت کرنا، جنگیں لڑنا امن و امان قائم رکھنے میں مدد کرنا، یعنی سپاہیوں کی جماعت تھی جو درج بالا تمام امور انجام دیتی تھی۔

(۳) ویش:

یہ طبقہ بیوپاریوں کا تھا جو تاجرانہ ذمہ داریاں ادا کرتا تھا ضروری اشیاء کی خرید و فروخت کرنا اور تمام عوام کے لے خورد و نوش سے لے کر تمام ضروریات زندگی کی اشیاء مہیا کرانا ان کی ذمہ داری تھی۔

(۴) شودر:

یہ طبقہ سماج کا سب سے نچلا طبقہ تھا اس طبقہ کی حالت تینوں طبقات سے بالکل مختلف تھی۔ غریب لاچار مزدوروں جیسی حالت میں وہ زندگی گذارتے تھے سبھی کی خدمت گذاری ان کا کام تھا کہا جاتا ہے کہ یہ طبقہ اُس زمانے کے غلاموں کا طبقہ تھا۔ انہیں سماج میں کوئی رتبہ حاصل نہ تھا۔ بڑے طبقوں کے رحم و کرم پر وہ زندگی گذارتے تھے۔ ہندوستان کی تقریباً 70% آبادی ایسے ہی لوگوں پر مشتمل تھی۔

آزادی سے قبل سماج میں ان طبقات کے علاوہ مسلمان بادشاہوں کے زمانے میں جو

طبقات ابھر کر سامنے آئے ان میں سلاطین، امراء نواب، جاگیردار، علماء، سپاہی، تاجر وغیرہ تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ حکمران اسلام مذہب کے پیروکار تھے۔ اس لئے اسلامی تعلیمات کی وجہ سے غلاموں، حاکموں یا اونچ نیچ ادنی واعلیٰ کے نظریہ سے گریز کیا جاتا تھا۔ اور نچلے طبقہ کو ہی حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا اور نہ کمتر مانا جاتا اور نہ ہی ان پر ظلم وزیادتی کی جاتی تھی۔

انگریزوں کے زمانے میں سماجی طبقات کو ہوا دی گئی اس اونچ نیچ اور بھید بھاؤ کی پالیسی سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی گئی۔ ساتھ ہی مذہب کے نام پر منافرت پھیلائی گئی کہا جاتا ہے کہ آزادی سے قبل ہندوستانی سماج میں ایک انتشار واضطراب کی کیفیت پیدا ہوگئی تھی اور یہہ معاشرہ آہستہ آہستہ غلامی کی زنجیروں کو توڑ کر آزاد ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔

☆ معاشی حالات:۔

ہندوستان ایک دیہی ملک ہے اس ملک کی 80% فیصد آباد گاؤں یا دیہاتوں میں رہتی تھی۔ ان کا ذریعہ معاش کاشتکاری ہی تھا۔ کچھ لوگ کسان یا کھیتوں میں کام کرنے والے مزدور ہوا کرتے تھے ان کے تمام تر ذرائع آمدنی زرعی فصلیں تھی۔

زمین کے مالک کو زمیندار کہا جاتا تھا۔ زمیندار اپنے کھیتوں میں کام کرنے والے افراد کو مزدوری کے طور پر اناج کا کچھ حصہ یا پھر نقدی رقم دے دیتا جس سے ان کی روزی روٹی چلتی تھی۔ ہندوستان میں دیگر ممالک کی طرح بیسویں صدی کا آغاز کئی معاشی اور ذہنی تبدیلیوں کے ساتھ ہوا اس معاشی تبدیلی میں خاص طور سے سیاسی، سماجی، مذہبی تحریکیں بھی اثر انداز ہوئیں۔ تعلیم کے عام ہونے سے جدید صنعتوں کا قیام عمل میں آیا۔ ساتھ ہی صنعتی شہر آباد ہوئے یا قائم ہوئے جن کی وجہ سے مختلف شعبہ زندگی کے لوگ ایک دوسرے کے قریب آئے۔ اور عوامی زندگی میں ان کا اثر دیکھنے کو ملنے لگا اور ہندوستان کا سماجی ڈھانچہ بے حد متاثر ہوا۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ ہندوستان ایک دیہی ملک ہے۔ اس کی آبادی زیادہ تر گاؤں میں آباد تھی۔ صنعتی شہر بننے کی وجہ سے گاؤں کی اکائی کمزور پڑنے لگی۔ وہاں کا نظام درہم برہم ہونے لگا۔ دیہی صنعتوں کا تیزی سے زوال ہونے لگا۔ گاؤں کا معاشی نظام متاثر ہونے لگا۔ کاشتکاروں کی زندگی سے اطمینان اور سکون ختم ہوگیا۔ لوگ روزگار کی تلاش میں شہروں کا رخ

کرنے لگے۔ جہاں اچانک آبادی بڑھنے لگی مختلف الخیال لوگوں کے جمع ہونے سے کام کرنے کے طریقہ کار میں تبدیلی آئی۔ ساتھ ہی تہذیبی قدروں میں فرق ہونے کی وجہ سے نئے مسائل پیدا ہونے لگے۔

نئ تعلیم یعنی انگریزی تعلیم عام ہوئی۔ جس کی وجہ سے صدیوں سے چلے آرہے اعتقادات پر بھی چوٹ پڑی۔ لوگوں میں شعور بیدار ہونے لگا۔ برسوں سے چلی آرہی اعلیٰ ذات کے لوگوں کا دبدبہ کم ہونے لگا۔ بیسویں صدی کی ابتداء میں ملک کی معاشی حالت کچھ اس طرح ہوگئی کہ ۱۹۰۱ء تک ملک کی آبادی کا 65% فیصد حصہ کھیتی باڑی پر انحصار کرتا تھا۔ دھیرے دھیرے یہ طبقہ بڑھتا گیا۔ اور پہلی جنگِ عظیم کے بعد ۱۹۲۱ء میں یہ آبادی ۷۳ فیصد ہوگئی۔ اس طبقہ کی معاشی حالت نہایت ابتر تھی۔

غریبی، افلاس، بھوک مری اور تمام مسائل سے گھری ہوئی آبادی معاشی بحران کا شکار تھی ساہوکاروں کے بوجھ تلے دبے ہوئے بے حال لوگ تھے لیکن ساتھ ہی صنعتوں کے قیام کی وجہ سے مزدور طبقہ کا وجود پڑھائی کی جانب راغب ہونے لگا۔ کسان مزدوری کے لئے صنعتی شہروں میں جا کر بسنے لگے۔ زمینداری ختم ہونے سے سرمایہ داری کا نیا طبقہ وجود میں آنے لگا۔ غریب غریب تر اور امیر ہونے لگے۔

کہا جاسکتا ہے کہ ہندوستان کی معاشیات دیہاتوں سے نکل کر شہروں کی سمت نکل پڑی۔ اسی معاشی تبدیلی نے سماج میں بغاوت اور بے چینی پھیلادی۔ وقت اور حالات نے ہندوستان کو انگریزی حکومت کے رحم وکرم پر لا کھڑا کیا۔ انگریز چونکہ ذہنی طور پر بیوپاری تھے اس لئے انہوں نے ہندوستان کا معاشی استحصال کرنا شروع کیا۔ ہندوستانی عوام ان کے اس استحصال کا شکار ہو کر رہ گئی۔

ہندوستان کی عوام یوں تو ۱۸۵۷ء کے بعد سے ہی نئی نئی مشکلات کا سامنا کررہی تھی۔ خاص طور سے مسلمانوں میں بے چینی بڑھ گئی تھی وہ دوہری مشکلات سے دوچار تھے ایک حکومت اُن سے چھین گئی تھی دوسرے انگریز انہیں پوری طرح سے تباہ وبرباد کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ کیونکہ انہیں یہ ڈر تھا کہ حکمران طبقہ کھوئی ہوئی حکومت اور اقتدار کو حاصل کرنے کی جدوجہد کرے گا۔ اس لئے ہر طرح سے یعنی سیاسی، سماجی معاشی اور ذہنی طور پر انھیں پریشانیوں میں

مبتلاء رکھنے کے لئے نئے نئے حربے استعمال کئے جانے لگے۔ مسلمانوں پر یہ آفت ناگہانی کچھ اس طرح مایوس کن ثابت ہوئی کہ انہوں نے اپنے آپ کو ہر طرف سے بے یار و مددگار پایا۔ کہا جاتا ہے کہ جب مصیبتیں پڑتی ہیں تو انسان اس سے نکلنے کی جدوجہد کرتا ہے مگر مسلمانوں نے اس غلامی کو بھی اپنا نصیب سمجھ لیا۔ اور لکیر کے فقیر بنے رہنے میں ہی آفیت سمجھی۔

جب ۱۸۵۷ء کا شور تھا تو سر سیّد احمد خاں نے اپنی قوم کو ترقی کی راہ پر ڈالنے کی کوشش کی۔ ان کی ذہنی تربیت کو پروان چڑھانے میں زبان و ادب کو بھی از سرِ نو نکھارنے کا کام انجام دیا۔ ادبی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو مسلمانوں کے لئے ادبی سرمایہ عربی فارسی اور اُردو زبان میں ہی تھا۔

جاگیردارانہ نظام میں ادب صرف ایسے لوگوں کی زندگی کا اظہار تھا جو امیر یا امیر ترین تھے۔ بادشاہوں، نوابوں اور امیر و امراء کا دل بہلانے کے لئے جو قصے لکھے گئے ان میں بھی ایسے کردار تھے جو حقیقی دنیا کی عکاسی سے کوسوں دور تھے۔ شعر و شاعری میں بھی قصیدہ خوانی، مبالغہ آرائی اور منظر نگاری پر ہی زور دیا جاتا یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ زوال پذیر معاشرے نے داستان اور قصیدہ نگاری کے ساتھ ساتھ مرثیہ خوانی اور مثنوی نگاری کو جنم دیا تھا اور غلامی کی زندگی میں ایک طرح کا عیش و نشاط ڈھونڈنے پر مجبور کر دیا تھا۔ یا اکتفاء کیا تھا۔ مگر ۱۸۵۷ء کے حالات سے اس دور کے شاعروں اور ادیبوں کو تخیلات کی دنیا سے نکال کر ذہنی حقیقتوں کے اظہار پر مجبور کر دیا۔ اب ان کے سامنے ایسی کیفیات کا انبار تھا جو جس کے اظہار کے لئے نئے اندازِ فکر کے سانچوں اور نئے صنفِ ادب کو اپنانا ہی ضروری تھا۔ چنانچہ اس دور کے حالات نے جس میں نئی تعلیم جو کہ انگریزی زبان میں تھی۔ نئی تہذیب جو کہ مغربی تہذیب تھی اور جہاں روایتی انداز سے سوچنا کفر سمجھا جاتا تھا۔ اس کا اثر بھی شعر و ادب پر پڑا۔.........

چنانچہ اُردو شاعری کے لئے ایک ایسا ماحول تیار ہونے لگا جو انگریزی ادب سے متاثر تھا۔ دہلی اور آس پاس کے علاقوں میں اُردو زبان میں بھی انگریزی ادب خاص طور سے شاعری کے ترجمے کئے جانے لگے ان تراجم کو نظمِ جدید کا آغاز سمجھا جائے تو بجا نہ ہوگا۔

ہندوستانی مسلمان جو کہ مذہب اور سماج کے اصولوں کو اپنائے ہوئے تھا۔ چنانچہ اس کے شاعر و ادیبوں نے فطرت کی عکاسی کے لئے خود کو ذہنی طور پر تیار کر لیا تھا۔ اور یہ بات بھی

قابل ذکر ہے کہ انگریزی ادب میں بھی قدرتی مناظر اوراس کی خوبصورتی کو ہی موضوع بنایا گیا تھا۔ اس لئے اُردو نظم میں ذہنی حقیقتوں کی عکاسی کی جانے لگی۔ دھیرے دھیرے حالیؔ، شبلیؔ، محمد حُسین آزادؔ جیسے شعراء نے اس دور کو سماجی، سیاسی اور معاشی حالات کو بھی نظموں کا موضوع بنایا۔

کہا جاتا ہے کہ جس زمانے میں اُردو شاعری کی ابتداء ہوئی مغلوں کی حکومت عروج پر تھی۔ یہ بھی سچ ہے کہ ادب وشاعری کو پروان چڑھانے میں مستحکم حکومت اور امن وامان کی فضاء سازگار ہوتی ہے۔ لیکن یہہ بھی حقیقت ہے کہ حکومت میں کب کیسے حالات پیدا ہو جائیں کوئی نہیں جانتا جب درباداری ختم ہوگئی تو شاعری میں بھی ایک قسم کے جمود کی کیفیت طاری ہوگئی۔ بقول عبدالقادر سروری

"جب قومی ادباء کا زمانہ شروع ہوا تو فارسی شاعری پر بھی جمود طاری ہوا کہ زندگی کی تمام علامتیں اس سے مفقود ہوگئیں۔ اس طرح جو چیز اُردو شاعری کے لئے پہلے سہارا بنی تھی۔ اب وہی اس کے انحطاط کا باعث بھی ثابت ہونے لگی۔"[1]

جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے جب حالات بدلتے ہیں تو کچھ برسوں کے لئے سوچ وفکر حیران ہو جاتی ہے تخلیق کے نئے نئے سانچے گھڑنے میں وقت لگتا ہے۔ اور پھر نئی فضاء نئی سوچ، نئی رفتار کے ساتھ زندگی اوراس کے مسائل کو بیان کرنے لگتی ہے۔ اس لئے حالیؔ، شبلیؔ اکبرؔ یا اسمٰعیل میرٹھی نے اُردو شاعری کی مذمت کی اُسے بے وقت کی راگنی کہا غزلیہ شاعری سے گریز کرتے ہوئے نظم نگاری کو اپنایا گیا۔ غزل کے مضامین جو عاشقانہ، تخیلی اور نسوانی سنگار اور روپ کا اظہار ہی تھا۔ اُسے بدلتے اور نئے زندگی کے مسائل کو بیان کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ قوم پرستی، حب الوطنی معاشرتی مسائل، معاشایات اور ملی تشخص کو نظم کے موضوعات بنایا جائے گا۔

ویسے مغلوں کی حکومت کے خاتمے سے قدیم مغل تمدن ہندوستان سے رخصت ہو گیا تھا۔ اور مغربی تہذیب وتمدن کے نئے اثرات نے ہندوستان کے سامنے ایک نیا نصب العین قائم کر دیا لیکن شعر وادب قدیم روایتوں قومی معاشرت، قومی اعتقادات سے دور نہ جاسکا۔ شاعروں اور ادیبوں کے لئے نیا پن اور نئے حالات کو اپنی تخلیقات میں بیان کرنا آسان بھی نہ تھا۔ شاعرانہ احساس کی ایک اور وجہ وہ سانحہ تھا جس نے اُردو شاعری کے پھلنے پھولنے کی روایات کو یکسر ختم

[1] جدید اُردو شاعری۔ از عبدالقادر سروری ص ۷۱

کردیا تھا۔لیکن یہ ممکن نہ تھا کہ شاعروں کی قوم آسانی سے فنا ہو جاتی ۔وہ باقی رہی اور نئی آبیاری کے ساتھ نئی فضاء میں خوشگوار ماحول پیدا کرنے میں نہ صرف مددگار ثابت ہوئی بلکہ اس نے اپنے آپ کو اس قابل بنادیا کہ دیگر زبانوں کے مقابل سر اٹھا کر جینے کا حوصلہ بھی پایا۔اس دور میں نظم نگاری کے جوہر سامنے آئے۔ان کو کسی طرح نظرانداز نہیں کیا جاسکتا

قومی اور ملکی خدمات ابھارنے میں اُردو نظم نے کارہائے نمایاں انجام دیئے۔آزادی کا احساس، فطرت کی عکاسی ،موسموں کی کیفیات،شہرو کی انفرادیت، انسانی اخلاق و عادات، اسلامی جذبات کی عکاسی، سماجی مسائل اور معاشی رجحانات بھی اُردو نظم نگاری کا موضوع بنے رہے۔کہا جاسکتا ہے کہ اُردو نظم نگاری نے جس ماحول میں آنکھ کھولی اس کی سمت و رفتار کو اپنے اندر سمولیا۔اور آنے والی نسلوں کے نمائندہ شعراء نے اپنی اپنی بساط کے مطابق ان کا اظہار اپنی تخلیقات میں کیا۔جو اُردو نظم نگاری کی ایک انفرادی خصوصیت ہے۔

باب سوّم

اُردو نظم معنی، مفہوم آغاز اور ارتقاء

شاعری کے ذکر کے ساتھ ہی مختلف اصناف شاعری کا تصور بھی ابھرنے لگتا ہیں ساتھ ہی بے ساختہ لفظ نظم کا یا نظم کی اصطلاح زبان پر آجاتی ہے۔جس پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے شعر کے لئے اس اصطلاح کا استعمال زمانہ قدیم سے ہوتا چلا آرہا ہے۔لیکن بعد میں ایک مخصوص صنف کے لئے اس کا استعمال بھی کیا گیا نظم کے مفہوم سے متعلق اگر تاریخی چھان بین کی جائے تو مندرجہ ذیل حقائق سامنے آتے ہیں۔

حامدی کاشمیری نے اپنی کتاب ''اُردو شاعری پر یوروپی اثرات'' میں حوالہ دیا ہے۔جس کی رو سے اندازہ ہوتا ہے

> ''نظم اس لفظ یا اصطلاح کے تعلق سے کہا جاتا ہے کہ یہ اُردو میں فارسی زبان سے آئی لیکن ایک زمانے تک اصطلاح کے طور پر استعمال نہیں ہوئی۔ بلکہ اس کے لغوی منی پرونا، ضبط میں لانا وغیرہ کے مفہوم میں عربی زبان میں استعمال ہوتی رہی۔''[1]

اس کے علاوہ نظم کے معنی آراستہ کرنا، موزوں کرنا اور کسی چیز کو کسی چیز سے جوڑنے کے مفہوم میں بھی درج کیا گیا ہے۔ جیسے عربی اُردو لغت 'المنجد' میں

[1] اُردو نظم پر یوروپی اثرات از حامدی کاشمیری ص ۱۲

''نظماً، نظاماً، اللؤ ونحو۔'' موتی پرونا آراستہ کرنا موزوں کرنا کا مفہوم اصلاح کیا گیا اور النظم اور المنظوم کا مفہوم نظم کیا ہوا موزوں کلام اور شعر ہے''[1]

فارسی کتاب 'منتہی الادب'، میں اس کا مفہوم کچھ اس طرح درج ہے

''بالفتح شعر و رشتہ مرداریدو گروہ بسیار ائج ہے اس کا استعمال یہ بتایا ہے'' نفال جانا نظم من جراؔ اسی کے ساتھ اس کا ایک مفہوم ''در کشیدہ سخن'' ہے۔''[2]

عربی زبان کی ایک مستند لغت ''صراح'' میں بھی نظم کے تعلق سے منتہی الادب کا مفہوم نمبرا پر درج ہے [3]

فارسی کی کئی لغات میں نظم کا یہی مفہوم درج کیا گیا ہے۔

''نظم، ترتیب۔ انتظام

''اسی قسم کے مفہوم نظم سے متعلق شمس الغات اور سٹین گیس انگلیسی لغت میں بھی درج ہیں [4]

اگر اُردو کی لغات پر نظر ڈالی جائے تو سب سے پہلے مستند اُردو لغت فرہنگ آصفیہ میں اس لفظ کے مختلف مفہوم حسب ذیل درج ہیں۔

ا۔ پرونا۔ موتیوں کو تاگے میں پرونا۔ لڑی۔ سلک

۲۔ انتظام۔ بندوبست

۳۔ کلام موزں۔ شعر، چھند، کبت۔ ضد نثر [5]

اس تعریف میں تیسرے معنی ہمارے مقصد کی تکمیل کرتے ہیں اُردو کی جدید لغت جامع اللغات میں نظم کے معنی اس طرح درج ہے ''شعر، کلام موزوں، چند شعروں کا مجموعہ جو ایک ہی مضمون پر ہوں۔''

درج بالا تعریفوں سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ نظم عربی زبان کا لفظ ہے اور عام معنوں کے

---

[1] المنجد (عربی نعت) ناشر: دارالاشاعت کراچی

[2] منتہی الادب (فارسی نعت) جلد سوم و چہارم ص ۱۲۴۴ لاہور [3] صراح (عربی نعت) جلد دوم ص ۲۳۸

[4] شمس الغات ص ۴۲۷

[5] فرہنگ آصفیہ۔ جلد چہارم ص ۵۷۸

ساتھ عربی اور اس کے ساتھ ہی اُردو میں بھی کلام موزوں کے لغوی مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔
اسی طرح جامع اللغات میں نظم کے جدید تصور کے کچھ عناصر مل جاتے ہیں جو اُردو ادب کی عہدِ جدید کی ایک مستند لغت ہے۔ اسی لغت میں قدیم عربی ''پرونا'' سلک، لڑی وغیرہ کے مقابلہ میں شعر کی اس صنف کے لئے ایک مستقل لفظ یا اصطلاح کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ اور اس کے وہ اصلی اور وصفی معنی جو دوسری لغات میں پہلے دیئے گئے ہیں ثانوی مقام رکھتے ہیں۔ جامع اللغات میں یہی مفہوم واضح ہوا ہے اس لغت میں ''نظم'' کے مخصوص مفہوم کی توضیح کچھ اس طرح کی گئی ہے۔

''شعر کلام موزوں چند شعروں کا مجموعہ، جو ایک ہی مضمون پر ہوں۔'' [1]

اس حوالے کا آخری حصہ نظم کے مطالعہ کے تعلق سے اہمیت رکھتا ہے اس صنف نظم کا ایک اہم اور قابل ذکر پہلو نمایاں ہوتا ہے جو کچھ اس طرح ہے۔
یہ کہا جاسکتا ہے کہ صنف نظم کے خدوخال کے تعین کا یہ پہلا قدم ہے۔ کیونکہ اس کی تفصیلات سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ تعریف نظم کے سارے اجزاء پر حاوی یا منطقی طور پر کسی تعریف کو ہونا چاہیئے جامع ومانع نہیں ہے۔ پھر بھی اس صنف نظم کا خاکہ ہمارے ذہن میں کسی قدر واضح ہو جاتا ہے۔
''نظم'' کی اصطلاح عہدِ حاضر میں شاعری کی ایک مخصوص صنف کے لئے کس طرح منظر عام پر آئی اس بات پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان میں اس شاعری کو منظر عام پر لانے کے لئے انگریزی شاعری کے جو نمونے ابتداً ترجمہ یا تلخیص کے ذریعے سامنے آئے ہیں ان کے لئے یہ اصطلاح ایک طرح سے شعوری طور پر متعین ہوگئی۔ ورنہ قدیم ادوار میں بھی یہ اصطلاح مستعمل تھی جس کا اطلاق شاعری کی تمام اصناف پر ہوتا تھا۔ بقول حامد کاشمیری

''جب ہم اس لفظ یا اصطلاح یا سبق کا پتہ چلانے کی کوشش کرتے ہیں تو ظاہر ہوتا ہے کہ یہ قدیم ادوار میں بھی مستعمل تھی۔ لیکن اس کے استعمال میں ایک ابہام سا پایا جاتا تھا۔ قدیم دور میں یہ وسیع معنوں میں اور عمومی مفہوم میں استعمال ہوتی رہی کسی کے ذیل میں نہیں آسکتے تھے ان کیلیے اس عمومی اصطلاح

۱۔ اُردو نظم پر یوروپی اثرات از حامد کاشمیری ص ۱۳

کا استعمال ہونے لگا۔ اس طرح اس کا اصطلاحی مفہوم دراصل عام مفہوم سے متخرج ہے۔"[1]

اُردو زبان و ادب میں یہ لفظ "نظم" فارسی سے رواج پایا ہے اس لئے اُردو میں اس کے استعمال پر غور کرنے سے قبل فارسی ادب میں اس کے اصطلاحی معنی کے بارے میں چھان بین کی جائے تو فارسی ادب کی تاریخ کے مطالعہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ "نظم" کا لفظ دو معنوں میں استعمال ہوتا رہا۔ ایک کلام موزوں یا نظم کرنے کے معنوں میں دوسرے نثر کے مقابلے شعر کے معنوں میں۔ یعنی ادب کی دو قسمیں ایک نثر اور دوسرے نظم چنانچہ فارسی شعراء اور ادباء کے نزدیک نظم کے معنی کچھ اس طرح لئے جاتے رہے ہیں۔ "نظامی عروضی سمرقندی نے "نظم" کو نظم کرنے یا موزوں کرنے کے معنی میں استعمال کیا ہے۔"

شمس الدین محمد بن قیس الرازی نے اپنی تصنیف "المعجم فی مغائر شعر العجم" میں اسے شعر کے مفہوم میں استعمال کیا ہے۔ فردوسی نے اس لفظ کو موزوں کرنے کے مفہوم میں درج کیا ہے۔ جبکہ حافظ نے نظم کو شعر یا کلام موزوں کیلئے استعمال کیا ہے۔ اسی طرح جامی کے پاس بھی اس کا مفہوم شعر ہی ہے۔ امیر خسرو نے بھی اس لفظ کو شعر کے مفہوم میں ہی برتا ہے۔

فارسی کے بعد اگر اُردو شعراء و ادباء کے کارناموں کا جائزہ لیا جائے تو نظم کا لفظ عام طور پر درج ذیل معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔

۱۔ نظم کرنا

۲۔ نثر کے مقابل نظم یا شعر

۳۔ مختلف اصناف سخن کے معنوں میں

ڈاکٹر محمد محی الدین قادری زور نے لفظ نظم کی تحقیق کے ذریعہ یہ ثابت کیا ہے کہ سب سے پہلے شاہ میراں جی شمس العشاق نے لفظ نظم کا استعمال کیا۔

اسی طرح عاجز، سلطان اور غواصی نے بھی نظم کو اسی مفہوم میں باندھا ہے عادل شاہی شعراء میں امین الدین اعلیٰ صوفی شاعر نے اپنی ایک مثنوی کو "نظم وجود" سے موسوم کیا ہے۔ نظم کا

۱۔ حامدی کاشمیری۔ اُردو نظم پر یورپی اثرات ص۔ ۱۳

یہی مفہوم سیّد شجاع الدین اور قریشی کے پاس بھی ملتا ہے۔ نثر کے مقابلے میں نظم یا شعر کا مفہوم فتح شیر فتح کی مثنوی زلیخا ثانی کے اشعار میں بھی ملتا ہے۔

شمالی ہندوستان میں بھی لفظ نظم کو شعر موزوں کے معنوں میں کہیں کہیں استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ گلزار ابراہیم میں اور خاص طور سے فائز کے فارسی کلیات کے پیشِ لفظ میں ایسے شعر موزوں کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ میر حسنؔ نے بھی کئی جگہ پر نظم کو شعر کے مفہوم میں استعمال کیا ہے۔ مصحفی نے نظم کا استعمال مذکورہ بالا دونوں مفہوم میں کیا ہے۔

اشکؔ نے اپنے شعر میں نظم کو ''موتی کی لڑی'' کے معنوں میں استعمال کیا ہے مثلاً

جب پیر نے میں عکس پڑا تیرے دانتوں کا
دریا میں نظم گوہر شہوار گر پڑی

مرزا انیسؔ کے اشعار میں بھی یہی مفہوم ہے۔

ہم ہیں ہے پرور موتی کیا کیا نظم، رشتہ یہ گہر سلک ہے
جو ہری بھی اسطرح موتی پرو سکتا نہیں نظم ہے یا گوہر شہسوار کی کڑیاں انیس

درج بالا مفہوم ''لڑی'' کا ہے اور عام معنوی مفہوم ہے ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ مفہوم یعنی لڑی، سلک، پرونا، وغیرہ نظم کے پہلے مفہوم یعنی شعر موزوں کرنا سے مختلف ہے۔ یہ مفہوم شعر کے خیال کے ربط و تنظیم کا احساس دلاتا ہے جو نظم جدید سے قریب تر معلوم ہوتا ہے۔

مرزا انیسؔ نے ایک شعر میں نظم کا یہ مفہوم زیادہ وضاحت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ یعنی نظم ''مربوط کرنا'' کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

انیسؔ نظم غم شعر میں کتاب بنا
تیرے سلام میں ہے مرثیے کا سارا لطف

اس طرح ایک رباعی میں نظم کا استعمال شعر یا شاعری کے معنوں میں بھی استعمال ہوا ہے

وہ نظم پڑھوں کہ بزم رنگین ہو جائے
ایک نعرۂ آفرین و تحسین ہو جائے
جھڑتے ہیں دہن سے پھول لفظوں کے عوض
یاں آئے سخن چیں بھی گل چین ہو جائے

نسیم لکھنوی نے نظم کی اس اصطلاح کو کلام موزوں یا شعر کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔ اُردو کے نامور شاعر شیفتہ اور غالبؔ نے بھی نظم کو کلام موزوں کے طور پر استعمال کیا ہے۔

درج بالا مختلف شعراء کے خیالات سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ اس اصطلاح کے متنوع اور وسیع مفاہم ہیں۔ مذکورہ بحث سے اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ جدید دور سے پہلے 'نظم' کے استعمال کے عام اور اصطلاحی مفاہم کیا تھے اگر باریک بینی سے غور کیا جائے تو درج ذیل نتائج اخذ کیے جاسکتے ہیں۔

۱۔ نظم کا مفہوم لغت کے لحاظ سے 'ضبط میں لانا ہے

۲۔ نظم سے مراد پرونا۔ لڑی۔ سلک وغیرہ ہیں۔

۳۔ اصطلاحی مفہوم، شعر، مربوط کرنا اور شعر موزوں کرنا ہے

۴۔ اسی طرح نظم وسیع ترعمومی اصطلاحی مفہوم کے دائرے میں قدیم دور کی تمام اُردو شاعری آجاتی ہے جس میں تمام اصناف شاعری شامل کیے جاسکتے ہیں۔

بقول حامد کاشمیری

''یہ بات قابلِ لحاظ ہے کہ قدیم دکنی دور ہی سے غزل کو چھوڑ کر دوسری ساری اصنافِ سخن مثلاً قصیدہ، مرثیہ، مثنوی، رباعی کو نظم سے موسوم کرنے کا ایک غیر شعوری رجحان موجود رہا ہے۔''[۱]

مذکورہ بالا تمام باتوں کے ذریعے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ ''نظم'' کے وسیع ترعمومی اصطلاحی مفہوم کے دائرے میں قدیم دور کی تمام اُردو شاعری آجاتی ہے اس میں غزلیں بھی شامل ہیں۔ مثنویاں بھی قطعات، مرثیے، ترجیع بند غرض یہ کہ جتنے انداز میں شعر کہے گئے ہیں وہ سب شامل ہو جاتے ہیں۔ پر شاعرانہ تخلیق خواہ وہ کسی صنف میں ہو نظم کہی جاسکتی تھی۔ لیکن ایک بات قابلِ غور ہے کہ دکنی دور سے ہی غزل کو چھوڑ کر دوسری اصنافِ سخن کو نظم سے موسوم کرنے کا ایک غیر شعوری رجحان موجود رہا ہے۔ کیونکہ کسی بھی تذکرہ نویس نے غزل کو نظم نہیں لکھا ہے۔ اس طرح قلی قطب شاہ فائز، حاتم، سودا، میر، نظیر اکبر آبادی یا غالب کی مختلف اصناف کو (غزل کو چھوڑ کر) کبھی غزل کا نام نہیں دیا گیا

شمیم احمد صاحب اپنی تصنیف ''اصنافِ سخن اور شعری ہیئتیں'' میں رقمطراز ہیں۔

''اُردو شاعری کو موٹے طور پر ہم دو شعبوں میں تقسیم کرسکتے ہیں ایک غزل اور

---

[۱] اُردو نظم پر یوروپی اثرات از حامدی کاشمیری ص ۱۹

دوسری نظم ۔ گو اُردو غزل کے مقابل اُردو نظم ایک اہم صنف ہے ۔ اُردو شاعری
میں اصناف کی تقسیم بھی عربی اور فارسی شاعری کے طریقہ تقسیم سے متاثر رہی
ہے۔ چنانچہ اُردو شاعری میں ایک طرف غزل ہے جو اپنے روایتی موضوع اور
ہیئت کے اعتبار سے اپنا ایک جداگانہ مقام رکھتی ہے تو دوسری طرف قصیدہ،
مرثیہ اور مثنوی، رباعی، نظم ترکیب بند، ترجیع بند، متزاد، قطعہ، مسمط، مربع، مخمس،
مسدس، مثمن، مسبع، معشر ہیں۔'' ۱

یعنی غزل کے علاوہ تمام اصناف شعری نظم کے مفہوم میں رائج تھیں۔ لیکن زمانے کے
ساتھ ساتھ اصنافِ شعری میں نظم سے متعلق ایک نیا رجحان رونما ہوا خاص طور پر انیسویں صدی
کے وسط سے نئے ادبی معیار اور شاعری کے نئے نمونے اُردو زبان میں روشناس ہونے
لگے۔ شعر کی اس نئی صنف کے لئے جو قدیم اصناف کے کسی ذیل میں نہیں آسکتی تھی نظم کے قدیم
عام اصطلاحی مفہوم کے لئے رائج ہونے لگی۔ اور نظم کا نیا تصور ابھرنے لگا جو ۱۸۵۷ء کے بعد اُردو
شاعری میں اپنی علحیدہ و منفرد شناخت بنانے لگا۔

بقول شمیم احمد:۔

''ہماری کلاسیکی تنقید میں نظم سے جملہ شاعری مراد لی گئی ہے لہٰذا ابلاغت کی دستیاب
کتابوں میں یہ لفظ ان ہی معنوں میں استعمال ہوا ہے لیکن یہاں ہماری مراد، نظم
سے وہ مخصوص صنف سخن ہے جسے بالعموم ہم غزل کے مقابلہ میں رکھتے ہیں۔'' ۲

اس قول کی رو سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اُردو کی تمام شاعری کلاسیکی تنقید کے
مطابق نظم کے زمرے میں شامل کی جاتی تھی۔ چاہے وہ قصیدہ ہو مرثیہ ہو یا رباعی یا قطعہ وغیرہ
جبکہ دورِ جدید میں 'نظم' ایک علحیدہ اور مخصوص صنف کی حیثیت سے نمودار ہوئی۔ وزیر آغا کا کہنا ہے کہ

''خالص نظم کا بہ حیثیت صنفِ سخن زیادہ صحیح تصور جدید تناظر میں واضح ہوگا۔
غزل کے ماسوا دیگر اصنافِ سخن مثلاً قیصدہ مثنوی مرثیہ وغیرہ کا جدید شاعری
میں وہ رواج باقی نہیں رہا جو کلاسیکی شاعری میں تھا اور جہاں چاروں اصناف

۱۔ اصناف سخن اور شعری ہیئتیں از۔ شمیم احمد ص

۲۔ اصناف سخن اور شعری ہیئتیں از شمیم احمد ص

اُردو شاعری کی اہم اور بڑی اصناف سمجھی جاتی تھیں عہد جدید میں نظم کے ارتقاء اور اس کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے اُسے شاعری کی پانچویں اہم اور بڑی صنفِ سخن قرار دیا جاسکتا ہے۔ بلکہ موجودہ عہد میں تو غزل کے دوش بدوش کوئی صنف سخن زندہ ہے اور پوری طاقت اور توانائی کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہے تو وہ نظم ہی ہے۔ اس لحاظ سے جدید شاعری کی سب سے بڑی دو ہی اصناف غزل اور نظم ہیں۔" [1]

اُردو نظم پر انگریزی کے اثرات: انگریزوں کی آمد سے ہندوستان میں نئی نئی اصطلاحیں رائج ہوئیں انگریزی ادب کے ذریعہ اُردو ادب پر بھی خوشگوار اثرات مرتب ہوئے ایک طرح سے اُردو زبان وادب کے لئے یہ نشاۃ الثانیہ کا آغاز تھا۔ اس عہد میں یوروپی علوم وفنون، تہذیب و تمدن، اقتصادیات، فکر وفلسفہ، سائنس اور دوسرے شعبہ حیات، فکر وخیال سے متاثر ہورہے تھے۔ مغربی تہذیب اور شائستگی اپنائی جارہی تھی۔ لیکن ان سب سے الگ مغربی طرز تعلیم کو بڑا دخل تھا۔ نئی تہذیب، نئے تصورات اور نیا تعلیمی رجحان جس کی بنیاد عقلیت پر تھی جس نے زندگی کے تمام شعبوں میں ایک نیا انقلاب پیدا کیا۔ ادب اور شاعری بھی نئے حالات اور واقعات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ یوروپی تہذیب کے زیر اثر جدید اور عصری خیالات، تصورات اور میلانات کے ساتھ ساتھ اظہار کے شعوری نمونے شعر وادب میں شامل ہونے لگے اور نظم کا جدید تصور بھی ان ہی نئے خیالات اور حالات کی وجہ سے پیدا ہوا۔ نئے خیالات اور تصورات اس وقت منظر عام پر آتے ہیں جب سماجی یا سیاسی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ یعنی ادب وشعر زندگی کا پروردہ ہی نہیں ہوتا بلکہ سیاسی حالات سے متاثر بھی ہوتا ہے چنانچہ ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ شعر وادب کو متاثر کئے بغیر نہیں رہ سکا۔ بقول ڈاکٹر سیّد اعجاز حسین

"غدر کا ہنگامہ کے بعد ہندوستان کی سیاسی اور معاشرتی زندگی پر اثر پڑا بلکہ علمی وادبی دنیا میں بھی انقلاب عظیم ہوا۔" [2]

۱۸۵۷ء کا انقلاب ہندوستانی زندگی کا فیصلہ کن انقلاب تھا۔ انگریزی حکومت کا

۱۔ اُردو شاعری کا مزاج۔ از ڈاکٹر وزیر آغا ص

۲۔ اُردو شاعری کا مزاج۔ از ڈاکٹر وزیر آغا ص

باقاعدہ قیام اور ہندوستان کی شکست۔ لیکن اس کے بعد مشرق اور مغرب دونوں میں میل جول کے امکانات بڑھ گئے جس نے ہندوستان کی تہذیبی، سماجی اور تعلیمی زندگی کو متاثر کیا۔ بقول قریشی نسیم

"انگریزی تہذیب اور علم وفن کا اثر روز بروز تیزی سے بڑھنے لگا اور زندگی کے نئے امکانات اور نئی راہیں روشن ہوگئیں اس زبردست انقلابی عمل نے ہندوستان کی ساری ادبیات کی طرح اُردو ادب کو بھی گہرے طور پر متاثر کیا۔ صاف طور پر نظر آتا ہے کہ فکر ونظر کی جولانیوں کے لئے نئے نئے میدان ظہور میں آئے اور اُردو ادب کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔"[1]

یہہ بات بھی جانتے ہیں کہ نئی شاعری کی ابتداء سب سے پہلے آزاد اور حالؔی کو کوششوں کا نتیجہ ہے کیونکہ یہی دو حضرات تھے جن کا ذہن نئے حالات سے زیادہ متاثر ہوا خاص کر انگریزی شاعری کے نمونوں سے واقفیت حاصل کرنے کی وہ ہمیشہ کوشش کرتے رہے۔ ان کی نگاہوں میں شعر کے نئے خدوخال ابھرنے لگے۔ اور "نظم" کی اصطلاح غیر شعوری طور پر ابھر کر سامنے آنے لگی۔ لیکن یہ بات بھی اپنی جگہ صحیح ہے کہ نئی نظم کے یہ خدوخال ابتداء میں مبہم اور غیر واضح تھے۔ کیونکہ حالؔی اور آزاد قدیم شاعری کے فرضی تخیلات سے بے زار ہو کر ردِ عمل کے طور پر کچھ انگریزی نمونوں کے پیشِ نظر اُردو شاعری میں تبدیلیاں لانا چاہتے تھے۔ جو موضوع کی صداقت کے ساتھ ساتھ ربط و تسلسل رکھتی ہو۔ یعنی انہوں نے تسلسل مضامین پر زور دیا۔ بقول محمد حُسین آزاد:۔

"میں نے آج کل چند نظمیں مثنوی کے طور پر مختلف مضامین پر لکھی۔"[2]

اس طرح حالؔی نے شعر کے نئے تصور کو مثنوی کے روپ میں پیش کرنے کی کوشش کی چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔

"جتنی صنفیں فارسی اور اُردو مین متداول، ان میں کوئی صنف مسلسل مضامین کے بیان کرنے کے قابل مثنوی سے بہتر نہیں۔"[3]

ا۔ اُردو ادب کی تاریخ از قریشی نسیم ص

۲۔ اُردو ادب کی تاریخ از محمد حُسین آزاد ص

۳۔ مقدمہ شعر و شاعر۔ مرتبہ:۔ وحید قریشی

مولانا محمد حُسین آزاد نے انجمن پنجاب کے زیر اہتمام طرحی غزلوں کے بجائے مخصوص موضوع پر لکھی ہوئی نظموں کو فروغ دیا۔ محمد حُسین آزاد نے اپنے ایک لکچر میں نظم سے متعلق کچھ اہم باتیں بتائیں۔ حالیؔ نے بھی آزاد کی ہم نوائی کی لیکن دونوں کے ذہنوں میں نئی نظم کا نیا تصور نہیں تھا۔
بقول حامد کاشمیری

"آزاد اور حالیؔ کے ذہنوں میں نئی نظم کا نیا تصور نہیں تھا گو انہوں نے نظم لکھی تھی اس کے علاوہ اپنی تحریروں میں 'نظم' کا استعمال بار بار کیا ہے۔" [۱]

☆ حالیؔ اور آزاد کی کوششیں

جب ہم نئی شاعری کی ابتداء پر غور کرتے ہیں تو اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ اُردو ادیبوں میں سب سے پہلے آزاد اور حالی کے ذہن نئے حالات سے متاثر ہوئے۔ اور خاص کر انگریزی شاعری سے واقفیت ہونے کی وجہ سے ان دونوں حضرات کی نگاہوں میں شعر کے نئے خدوخال متعین ہونے لگے اور نظم کی اصطلاح غیر شعوری طور پر مستعمل ہونے لگی دراصل حالیؔ اور آزاد انگریزی ادب سے متاثر ہو کر اُردو میں ایسی شاعری کو رائج کرنا چاہتے تھے۔ جو موضوع کی صداقت کے ساتھ ساتھ ربط و تسلسل رکھتی ہو۔ یعنی یہہ کہا جاسکتا ہے کہ اس دور میں نظم کے ربط و تسلسل کے مفہوم کو اہمیت دی جانے لگی تھی۔ اور یہی دراصل پہلا قدم تھا۔ جس نے جدید اُردو نظم کو فروغ دینے میں اہم رول ادا کیا جس نے بعد میں منظم تحریک کی شکل اختیار کر لی۔ جب محمد حُسین آزاد نے کرنل ہارائیڈ کی ایما پر "انجمن پنجاب" کی بنیاد ڈالی۔ اس انجمن میں غزلوں کے بجائے مخصوص موضوع پر لکھی ہوئی نظمیں پڑھی جانے لگیں۔ اس دور میں نظم کی اصطلاح کو عام طور پر دو معنوں میں استعمال کیا گیا۔

۱۔ شعر یا شاعری کے معنوں میں
۲۔ غزل کے مقابلے کسی بھی ایسے موزوں کلام کے لئے جو تسلسل و ربط رکھتا ہو۔
۳۔ نظم کا تیسرا مفہوم بھی اس پس منظر میں رواج پانے لگا۔
اور وہ یہ تھا کہ انگریزی کی اصطلاح "Poem" سے روشناس ہو کر اُردو شاعرو

۱۔ جدید اُردو نظم اور یوروپی اثرات از:۔ حامدی کاشمیری ۲۱

ادیب نظم اس اصطلاح کو استعمال کرنے لگے۔ نظم کے جدید مفہوم کے تعین کے سلسلے میں گویا یہ ایک اہم قدم بھی تھا۔

☆ بقول حالیؔ:۔

"لارڈ بائرن کی نظم موسوم "بہ چائلڈ ہیرلڈز پلگرمیج"
ایک مشہور نظم ہے ....۱۸۱۲ء میں اس نظم کی اشاعت ہوئی۔
جس کے سبب بائرن کی شاعری کی تمام یورپ میں دھوم ہوگئی اور
انگریز اس کی نظم پر مفتون ہوگئے۔"[۱]

☆ جدید نظم کا ارتقاء

بہرحال یہ کہا جاسکتا ہے کہ نظم کے علحیدہ مفہوم کا چلن عام ہوتا جارہا تھا۔ اور نظم کا جدید مفہوم زیادہ سے زیادہ واضح اور متعین ہونے لگا تھا۔ آہستہ آہستہ نظم ایک علحیدہ منفرد اور مخصوص صنف کے طور پر فروغ پاتی رہی اور اپنی انفرادیت منواتی رہی موجودہ تصور کے اعتبار سے نظم ایک مکمل تخیلی یا شاعرانہ تجربے کے فنکارانہ اظہار کا نام ہے۔

اُردو ادب کی تاریخ کا بغور جائزہ لیا جائے تو یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اُردو نظم کا ایک نیا مفہوم آزاد اور حالیؔ کے ذہن میں تھا۔ جو نظم کے قدیم مفہوم سے مختلف تھا اور جو ربط و تسلسل سے جڑا ہوا تھا ساتھ ہی انگریزی Poem کے تصور سے میل کھاتا تھا۔ جو بعد میں اس دور کے دیگر شاعروں اور ادیبوں کے ذہنوں میں جگہ بنانے میں کامیاب ہوگیا۔ ساتھ ہی انگریزی نظموں کے ترجموں کی تعداد بھی بڑھنے لگی۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ اُردو جدید نظم سے لوگ واقفیت حاصل کرنے لگے، ساتھ ہی نئی نظموں میں موضوع کے ربط و تسلسل اور تنوع کے علاوہ تکنیک اور ہیئت میں تازگی اور جدت پیدا ہونے لگی۔ اور جدید اُردو نظم قبول عام کا درجہ حاصل کرنے لگی۔

اُردو نظم نے ایک علحیدہ منفرد اور مخصوص صنف کی حیثیت سے فروغ پانے لگی اور اپنی انفرادی حیثیت منوا چکی ہے۔ اس کے اجزاء کی تشریح اور مفہوم کا تعین بھی ضروری ہوگیا ہے۔

۱۔ مقدمہ شعروشاعری از شمس العلماء مولوی الطاف حُسین حالی ص ۱۱۳

موجودہ تصور کے اعتبار سے نظم ایک مکمل تخیلی یا شاعرانہ تجربے کے فنکارانہ اظہار کا نام ہے۔ بقول حامدی کاشمیری:۔

"شعری تجربہ جب شاعر کی داخلی شخصیت کے آتش خانوں میں تپ کر نکھرتا ہے۔ اور پھر ایک پراسرار تخلیقی عمل کے تحت موزوں، حسین اور مترنم الفاظ کے قالب میں اس انداز سے ڈھل جاتا ہے کہ قاری کا دل و دماغ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ تو ایک نظم معرضِ وجود میں آتی ہے۔" ۱

اگر ادب کا تنقیدی مطالعہ کیا جائے تو یہ بات بھی سمجھ میں آجاتی ہے کہ نظم کے مختلف اجزاء اور حصّے خارجی اور داخلی طور پر پوری نظم کی تعمیر و تشکیل میں برابر کا حصّہ ادا کرتے ہیں۔ "اجزاء کل کے ساتھ ہم آہنگ ہوجاتے ہیں، یعنی شاعر کا مشاہدہ احساس جذبہ، ادراک، تخیل، حسّیات وغیرہ جمالیاتی صورت میں ڈھل جاتے ہیں۔ اور پھر ہیئت کے اعتبار سے ایک مخصوص شکل میں قاری کے دل و دماغ پر انداز ہوتے ہیں۔ یہ بات بھی صحیح ہے کہ ہر ادب میں نظم کا کم و بیش مذکورہ تصور ہی ملتا ہے۔

سنہ ۱۹۰۱ء میں رسالہ "مخزن" کا اجراء ہوا جس کے مدیر سر عبدالقادر تھے۔ انہوں نے متن کی اپنی کارکردگی پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا:۔

"اپریل ۱۹۰۱ء میں مخزن نے جنم لیا۔ اس کے جملہ مقاصد میں سیا یک مقصد اُردو نظم میں مغربی خیالات، فلسفہ اور سائنس کا رنگ بھرنا اور نتیجہ خیز مسلسل نظم کو رواج دینا تھا۔ یہ مقصد خاطر خواہ پورا۔" ۲

پروفیسر احتشام حسین بھی جدید نظم کے متعلق کہتے ہیں۔

"اُردو ادب میں نظم کا لفظ دو الگ الگ معنوں میں استعمال ہوتا رہا عام حیثیت سے تو یہ ہے کہ ہر شاعرانہ تخلیق کو نظم کہہ سکتے ہیں چاہے وہ مختصر ہو یا طویل یہ بھی شرط نہیں کہ وہ کس شکل میں ہے۔ اپنے دوسرے مفہوم میں لفظ نظم ایک مسلسل مربوط اور ارتقائی شاعرانہ تصنیف کے لئے استعمال ہوتا ہے۔" ۳

۱۔ حامدی کاشمیری "جدید اُردو نظم اور یوروپی اثرات ص ۱۴

۲۔ سر عبدالقادر سروری "مخزن" اپریل ۱۹۰۳ء

۳۔ پروفیسر احتشام حسین اُردو شاعری کا ارتقاء (مقدمہ ادب پارے) ۲۵

پروفیسر آل احمد سرور بھی نظم کے لئے خیال کا تسلسل اور وحدت ضروری خیال کرتے ہیں۔

"نظم مسلسل روشنی ہے۔ نظم کی مثال ایک دریا کی سی ہے جس میں طرح طرح کے نشیب وفراز ہیں۔ کہیں وہ چٹانوں کا سینہ چیر کر نکلتا ہے تو کہیں میدانوں میں متانت اور وقار کے ساتھ بہتا ہے۔ لیکن دریا میں ایک تسلسل اور وحدت ہوتی ہے۔" [1]

☆ جدید نظم کی خصوصیات

جدید نظم کی خصوصیات پر غور کیا جائے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ جدید نظم کی ہیئت پرانے سانچوں میں ڈھلنے کے لئے مجبور نہیں۔ پرانی صنفیں بار بار کے استعمال سے روایتی بن گئی تھیں۔ اور کلاسیکی تقلید اور تکرار سے ذاتی جوہر کھو چکی تھیں۔ اس میں ایک قسم کی تنگ دامانی در آئی تھی۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اُردو شاعری کی قدیم اصناف ہیئت کے بعض جامد اصولوں سے اپنا ہیولیٰ تیار کرتی تھیں۔ اور کسی شاعر میں ان اصولوں کی پائمالی کی ہمت نہ تھی۔ وہ آنکھ بند کر کے ان اصولوں کی پیروی کرتا تھا۔ وقت کی رفتار نئے حالات، نئے واقعات اور نئے خیالات کے ساتھ ساتھ شاعر کی ذہنی کیفیت بھی بدلتی ہے۔ لیکن شعری روایت کے اصولوں کی وجہ سے وہ روایتی انداز میں شاعری کرنا پسند کرتے تھے۔ لیکن کچھ جلد باز طبعتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو کسی روایت کی پابند نہیں ہوتیں۔ ایسی شخصیتیں ذہنی اپج اور تخلیقی صلاحیتوں سے نئی اصناف کو جنم دیتی ہیں۔ یہی باتیں شعری اصناف میں تبدیلی لاتی ہیں۔ اور نئی اصناف معرضِ وجود میں آتی رہتی ہیں۔ اظہار کے نئے سانچے تخلیق پاتے ہیں۔ صنف نظم اس اعتبار سے ایک نیا شعری قالب ہے اس کی بنیادی خصوصیت تغیر پذیری کی صلاحیت ہے اس میں جامعیت، وسعت اور ایک ہمہ گیری ہے۔ اس کی خالص ہیئت نہیں اور نہ ہی کوئی ایک موضوع ہے نظم کے مفہوم کو متعین کرنے کی کوشش انسائیکلوپیڈیا کے ایک مضمون نگار نے کی ہے وہ لکھتا ہے۔

"ادبی اظہار کی شکل جس کے حدود قطعی طور پر مخصوص نہیں ہوسکے۔" [2]

صنف نظم کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ایک ہی مرکزی

۱۔ آل احمد سرور "جدید نظم کی ہیئت وتشکیل (ایک مباحثہ) جدید نظم نمبر بنگلور ص ۱۰۱

۲۔ اُردو انسائیکلوپیڈیا ۱۵۱۲ء

خیال یا موضوع ہوتا ہے۔ نظم میں موضوع کی وحدت ارتقاء پذیر ہوتی ہے اور جب یہی موضوع مترنم و موزوں قالب میں ڈھل جاتا ہے اور قاری کے ذہن کو متاثر کرتا ہے تو جدید نظم کا تصور مکمل کہلانے کا مستحق ہو جاتا ہے جدید نظم کو سمجھنے کے لئے اس بات کی بھی کافی اہمیت ہے کہ کیا جدید نظم ایک داخلی صنف ہے یا نہیں؟ اگر اس سوال پر غور کیا جائے تو یہ بات ابھر کر سامنے آتی ہے کہ چاہے نظم کو کتنا ہی خارجی کہا جائے مگر شاعر کا احساس۔ نظریات وغیرہ داخلیت ہی کی غمازی کرتے ہیں۔ ایک خارجی منظر پر لکھی گئی نظم کتنی ہی غیر شخصی کیوں نہ دکھائی دے اس میں داخلیت کا رنگ جھلکتا ہی رہتا ہے اس لئے کہا جاتا ہے کہ خارجی اثرات اور داخلی اثرات کے امتزاج سے ہی شاعری کا تانا بانا بُنا جاتا ہے۔ بقول حامدی کاشمیری

"جدید دور میں نظم کو بلاشبہ ایک الگ اور منفرد صنف کی حیثیت سے فروغ حاصل ہو رہا ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نظم ہی وہ صنف ہے جو اپنی تخلیقی صلاحیتوں کی بدولت اُردو شاعری کو اس قابل بنائے گی کہ وہ دنیا کی دوسری ترقی یافتہ زبانوں کی شاعری سے آنکھ ملائے۔ اس کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کی بڑی وجہ یہ ہے کہ یہ جدید ذہن سے پوری مطابقت رکھتی ہے۔"[1]

نظم اور اس کی خصوصیات کے ضمن میں سیّد احتشام حُسین رقمطراز ہیں۔

"نظم کا لفظ مختلف سلسلوں میں مختلف معانی میں استعمال ہوتا رہا ہے۔ کبھی غزل کو الگ کر کے باقی تمام اصناف کو نظم کہہ دیتے ہیں۔ لیکن جب نظم کا لفظ شاعری کی ایک خاص صنف کے لئے استعمال ہوتا ہے تو یہ اشعار کا ایسا مجموعہ ہوتا ہے۔ جس میں ایک مرکزی خیال ہو اس کے کے لئے کسی موضوع کی قید نہیں اور نہ ہی اس کی ہئیت متعین ہے ایسی نظموں کو اُردو کی قدیم اصناف سے الگ بھی رکھا جاتا ہے جس کی ایک علاحدہ حیثیت اور تاریخ ہے جیسے مثنوی، مرثیہ، قصیدہ، رباعی، نظم کا لفظ جب شاعری کی ایک مخصوص صنف کے لئے استعمال کیا جاتا ہے تو اس سے وہ نظمیں مقصود ہو جاتی ہیں جن کا کوئی حسین موضوع ہو اور جن میں فلسفیانہ،

۱۔ حامدی کاشمیری اُردو نظم پر یوروپی اثرات ۱۷

بیانیہ یا مفکرانہ انداز میں شاعر نے کچھ خارجی اور داخلی تاثرات پیش کیے ہوں۔"۱

درج بالا بیان کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ قدیم اصناف شعر سے جدا اور مخصوص صنف کے لئے نظم کا لفظ استعمال کیا گیا ۱۸۵۷ء کے بعد حالات تبدیل ہوگئے عوامی ذہن وفکر میں بھی تبدیلی آنے لگی ان بدلتے ہوئے حالات اور ماحول نے سوچ وفکر میں تبدیلیاں لانے کے لئے مجبور کردیا اسی لئے اس دور کے شاعروں اور ادیبوں نے اس بدلتے ہوئے حالات اور ذہن کی عکاسی اپنی تخلیقات میں کی اسی لئے اس دور کی نت نئی الجھنیں اور کشمکش اوران کی زندگی کی آرزوؤں اور حسرتوں کی عکاسی اُردو نظم میں ہوئی ہے اسی لئے کہا جاسکتا ہے کہ جب شاعران داخلی کوائف وحالات سے متاثر ہوکر انہیں شعری الفاظ کا جامہ پہنانا چاہتا ہے تو نظم سے بہتر کوئی ادبی صنف شعری رویے میں کارآمد نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ داخلی تجربے کو خواہ وہ کسی نوعیت کا کیوں نہ ہو۔ اپنے اندر اسے سمونے کی پوری صلاحیت اس میں موجود ہے ساتھ ہی نظم نئی صنف ہونے کے علاوہ قدیمی اصنافِ شاعری کے مقابلہ میں اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی صلاحیت بھی رکھتی ہے۔ اسی لئے ڈاکٹر وزیر آغا کہتے ہیں۔

> "نظم بچے کی زندگی کے اس دور سے مماثل ہے جب وہ سنِ بلوغ کو پہنچ کر خود ایک علحیدہ "کل" میں تبدیل ہوجاتا ہے چنانچہ اگر نظم کو انسانی زندگی میں انفرادیت کے بھرپور اظہار کی ایک صورت دیں تو اس کے مزاج کا ایک اہم پہلو آئینہ ہوجائے گا۔" ۲

نظم شاعری کی جدید اور منفرد، ترقی یافتہ شکل ضرور ہے اور دیگر ترقی یافتہ زبانوں کی طرح اُردو میں بھی انفرادی حیثیت کی حامل ہے۔ نظم خواہ کسی بھی زبان میں ہو۔ مواد، ہیئت اور دوسری فنی خصوصیات کے اعتبار سے تمام اہمیت کی حامل ہے جو شاعری کو دیگر فنونِ لطیفہ سے ممتاز کرتی ہیں جس میں ہر موضوع اور فن کی نمائندگی ہوئی ہے۔

(الف) نظم کی فنی خصوصیات:

آج کے دور میں نظم ایک اہم علحیدہ صنفِ شاعری کی حیثیت سے پہچانی جاتی ہے۔ اس

۱۔ سیّد احتشام حسین عکس اور آئینے ص ۱۲۰ ۲۔ ڈاکٹر وزیر آغا

کی سرحدیں شاعری کی ہر صنف کو چھوتی اور متاثر کرتی جارہی ہیں نظم کی جو ٹکنک ہے وہ شعر کی ٹکنک سے بالکل علیحدہ نہیں۔ سوائے اس کے ظاہری روپ کے جس کی اُصول سازی بھی آسان نہیں ہے۔ اس لحاظ سے شعر کی جو ٹکنک ہے وہی نظم کی ٹکنک ہے۔

۱) خیال

نظم کے موضوع یا بنیادی خیال کی تعریف بے حد مشکل ہے کیونکہ اس کی کوئی حد مقرر نہیں ہے دراصل نظم کا موضوع حیات و کائنات کی طرح وسیع ہے۔ انسانی زندگی کے ابتدائی مراحل سے لے کر جدید دور کے انسان تک کے تمام واقعات، واردات حالات اور ان کا عمل وردِ عمل نظم کے موضوع کی تشکیل و تعمیر میں مددگار ہوتا ہے ساتھ ہی خیال و فکر کے مختلف شعبے تہذیب و تمدن کے تصورات، مذہب، اخلاق، سیاست، فلسفہ، سماجی مسائل وغیرہ نظم کے موضوعات بن سکتے ہیں شاعر کی شخصیت ماضی اور حال کی تہذیبی اور تمدنی قدروں اور رشتوں سے بندھی ہوئی ہوتی ہے اس لئے نظم میں اس کا اظہار بھی ہوتا ہے ساتھ ہی شاعر کے تخیل میں زندگی سے متعلق موضوع اس کے جذبہ شعور اور لاشعور کی ہر کروٹ زندگی اور اس کے مظاہر سب کچھ نظم میں ہی بیان کئے جاسکتے ہیں۔ اور بیان کئے جارہے ہیں

یہہ بات بھی ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ شاعر خیال کو خیال کی حیثیت سے نہیں دیکھتا بلکہ خیال کی ترسیل و اظہار سے پہلے ہی اس کی صورت میں تبدیلی پیدا کرتا ہے۔ اُسے صرف خیال نہیں رہنے دینا۔ وہ خیال کو جذبے سے ہم آہنگ کر کے شخصی گرمی، قوت اور روشنی سے روشناس کراتا ہے۔ خیال کسی بھی نوعیت کا کیوں نہ ہو یا زندگی کے کسی بھی شعبہ سے تعلق رکھتا ہو جب وہ جذبے کی آنچ میں تپ کر کندن بنتا ہے تب ہی شعر بن جاتا ہے۔ اسی لئے یہہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ نظم کا تعلق جذباتی اور احساساتی آہنگ سے بھی مطابقت رکھتا ہے۔ بقول ایچ کومس

> ''شعری خیال اس وقت صورت پذیر ہوتا ہے جب شاعر خیال کو استعمال ہی نہیں بلکہ محسوس بھی کرتا ہے اور الفاظ کی مدد سے وہ اُسے تعمیری انداز بخشتے ہوئے بے نقاب کرتا ہے۔'' [۱]

۱۔ ایچ کومس لٹریچر اینڈ کریٹیسزم ص ۷۰

یہ بات بھی تسلیم کر لینی چاہئے کہ شعری تجربے کے تشکیلی عمل میں شاعر کی شخصیت اپنی تمام پر اسرار خصوصیات کے ساتھ الجھی رہتی ہے اور شخصیت کا مسئلہ دراصل نفسیات کا مسئلہ ہے شخصیت کی تعمیر میں ملکی و نسلی خصوصیات اور سیاسی و تاریخی حالات بھی حصّہ لیتے ہیں۔ تہذیبی اور معاشرتی قدریں اسے بالیدگی عطا کرتی ہیں صحیح معنوں میں شخصیت ایک ترکیبی عمل سے بنتی ہے ساتھ ہی خارجی زندگی داخلی طور پر شخصیت پر اثر انداز ہوتی ہے اور اسی مرحلے سے تجربات کی شکل بھی نمودار ہوتی ہے۔ فنکار جمالیاتی تجربے کی تشکیل و تکمیل کے لئے داخلی قوت سے کام لیتا ہے اسی لئے حالؔی نے کہا تھا۔

"سب سے مقدم اور ضروری چیز جو شاعر کو غیر شاعر سے تمیز دیتی ہے وہ ہے قوت متخیلہ یا تخیل ہے۔" [1]

۲۔ لاشعوری محرکات

فرائڈ نے جدید دور میں شخصیت کے نئے رازوں کا انکشاف کیا۔ اس نے شخصیت کی تشکیل میں لاشعوری محرکات کی دریافت کی۔ اس کے خیال میں فن کار کی زندگی آرزو اور شکست آرزو کی داستان ہے۔ لاشعور سے شعور میں آنے کے لئے آرزوئیں مچلتی رہتی ہیں لیکن 'انا' ان کا راستہ روک لیتی ہے۔ اس لئے یہ حسرتیں صورت بدل کر ابھرنے کی کوشش کرتی رہتی ہیں۔ فرائڈ کے شاگرد یونگ نے لاشعور کی ایک نئی تعریف کی اور اُسے نسلی اور اجتماعی زندگی کی تخلیقی قوتوں کا مخزن قرار دیا۔ بہر حال علم نفسیات کے ان ماہروں نے فنکار کی شخصیت کے لاشعوری محرکات سے کئی پردے ہٹائیں اور شخصیت کی بے پایاں وسعتوں پر اظہار خیال بھی کیا۔ اس طرح غور کیا جائے تو نظم دراصل شخصیت کے اظہار کا ہی نام ہے۔ مغربی ادب میں انیسویں صدی کے ابتداء سے ہی خاص طور پر نظم میں شخصیت کے عناصر کی تلاش کا چرچا ہونے لگا لیکن ٹی ایس۔ ایلیٹ نے اس سے مختلف بات کہی:۔

"شاعری جذبات کے آزادانہ اظہار کا نام نہیں ہے بلکہ جذبات سے گریز کا نام ہے شاعری شخصیت کے اظہار کا نام نہیں بلکہ شخصیت سے گریز کا نام ہے۔" [2]

۱۔ حالؔی مقدمہ شعر و شاعری ص ۱۹

۲۔ ٹی۔ ایس ایلیٹ۔ روایت اور انفرادی صلاحیت ص ۵۸

اس طرح یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ شاعری اظہارِ خیال ہی نہیں بلکہ شخصیت کی شمولیت اوراس سے انحراف یا گریز کا عمل بھی شاعری ہی ہے۔

ہر نیا دور نئے خیالات وتصورات لیکر آتا ہے اس لئے شاعر کو الفاظ کے انتخاب میں ایک نئی دریافت، ریاضت اور بصیرت سے کام لینا پڑتا ہے زبان آہستہ آہستہ بدلتی ہے۔

☆ بقول ٹی۔ایس ایلیٹ

''الفاظ اور بحر کی مسلسل جدّت کی خواہش کرنا اتنا ہی پسندیدہ ہے جتنا ہمارے آباء کے محاورے کے اتباع پر اصرار کرنا'' [1]

یہہ بات بالکل صحیح ہے کہ شعری تجربے کی خارجی صورت گری کی تکمیل الفاظ کرتے ہیں اور الفاظ شاعر کے ماضی الضمیر کا اظہار کرتے ہیں وہ ایک ایسی ترتیب اور تنظیم جو معانی کی خالق ہو، اسے ہیئت کا نام بھی دیا جاسکتا ہے دراصل ہیئت شعر یا نظم کا خارجی وجود ہے۔

آسکر وائلڈ نے ہیئت کی اس طرح تعریف کی ہے

''ہیئت ہی سب کچھ ہے۔ یہ رازِ حیات ہے ہیئت کی پرستش سے آغاز کرو اور پھر فن کا کوئی ایسا راز نہیں جو تم پر منکشف نہ ہوگا۔'' [2]

شاعر ہیئت کو تخلیقی تجربہ کے تابع رکھتا ہے اور وقت ضرورت اس میں تبدیلیاں بھی کرتا ہے۔ موزوں ومناسب تراش خراش سے کام بھی لیتا ہے۔ یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ شاعری میں الفاظ کا انتخاب، ترتیب، مناسبت، ہم آہنگی، ردیف قافیہ کا الزام وغیرہ شاعری کے تکنیکی عناصر ہیں۔ نظم کے مرکزی خیال میں جس قدر پیچیدگی اور گہرائی ہوگی۔ ہیئت میں بھی اسی قدر پیچیدگی ہوگی۔ دراصل ہیئت کی کامیابی کا راز اس حقیقت میں پوشیدہ ہے کہ وہ شعری تجربے کے ابلاغ وترسیل کا ایک بااثر ذریعہ بنائے نظم کی ہیئت کا مطالعہ کرتے ہوئے اس میں بحر ووزن اور قافیہ وردیف کی باحالی کی جائے لیکن بعض اوقات بغیر قافیہ وردیف کے نظم ہوتی ہے۔

۱۔ایضاً

۲۔آسکر وائلڈ اسٹینز اص، ۲۰۲، ۲۰۱

اس لئے مڈلٹن مرے کہتا ہے۔

"وزن اور بحر جو شاعری کی ہیئت کے امتیازی عناصر ہیں۔ فارسی میں جذباتی کیفیت کا ایک سنبھلا ہوا احساس پیدا کرنے کی قوت رکھتے ہیں۔"[1]

بلا شبہ پابند نظم کے لئے ان عناصر کی ضرورت ہوتی ہے لیکن آزاد اور معریٰ نظم میں اس کی ہیئت کے لئے امتیازی عناصر کی ضرورت بھی نہیں رہتی۔

☆ اسلوب:

وزن اور بحر کی طرح نظم کے بنیادی عناصر میں اسلوب اپنی جگہ بڑی اہمیت کا حامل ہے کیونکہ اسلوب پر شاعر کی شخصی خصوصیات کی چھاپ ہوتی ہے۔ اس لئے شاعر اپنے منفرد اسلوب کا مالک ہوتا ہے وہ اپنے منفرد انداز سے لفظوں کا انتخاب کر کے انہیں بڑے اہتمام اور سلیقے سے ترتیب دیتا ہے شعری تجربے کے اظہار کا کام لیتا ہے۔ اور جب وہ کامیاب ہو جاتا ہے تو اسی مخصوص اسلوب کا خالق کہلاتا ہے۔

اسلوب کی کامیابی دراصل الفاظ کے جادو۔ ان کے انتخاب صفائی، قوت۔ برجستگی، ایمائیت اور تازگی پر منحصر ہے اسلوب اور مواد میں گہرا تعلق ہے بعض نقاد اسلوب اور مواد کو الگ الگ پرکھتے ہیں لیکن جب اسلوب کا ذکر آئے گا تو مواد سے بھی بحث ہوگی اور نظم کے ادبی مرتبہ کو متعین کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کا مجموعی جائزہ لیا جائے۔

اسلوب کا تجزیہ کرتے وقت اس میں شاعر کی شخصیت کا عکس بھی نظر آتا ہے شاعر اپنے تاثرات اور تجربات کا اظہار ایک غیر شخصی انداز میں نہیں کر سکتا۔ اس کا زاویہ نگاہ بالکل معروضی اور خارجی نوعیت کا بھی ہو تو اس میں شخصی میلانات ظاہر ہوتے ہیں شاعر کا مذاق، احساس جمال اور اس کی روح کی نغمگی بھی شامل ہوتی ہے شعری اسلوب کا ضروری حصّہ تشبیہ ہے کسی خیال کو اجاگر کرنے کے لئے دو چیزوں کی باہمی مشابہت یا تقابل کو مدنظر رکھنا ضروری ہوتا ہے یہ ضرور ہے کہ تشبیہ کا انداز وضاحتی اور غیر مبہم ہوتا ہے تشبیہ عقل و ذہن کی پیداوار ہوتی ہے لیکن استعارہ کی تخلیق فن وحسن اور معنویت کے امکانات کی حامل ہے۔ استعارہ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ

---

[1] مڈلٹن مرے پرابلم آف اسٹائل ۲۵

فرسودہ ہو جاتا ہے اور اپنی تازگی اور ندرت کھو دیتا ہے۔ اسی لئے استعارے میں نئی نئی مشابہتوں کو تجویز کرنا پڑتا ہے۔

"فرنگ ادبیات" میں سلیم شہزاد تشبیہ کی تعریف یوں کرتے ہیں۔ "بیان کا ایک اسلوب جس میں دو مختلف چیزوں کو بعض مشترک صفات کے سبب مشابہ قرار دیا جاتا ہے۔" [1]

(ب) اُردو نظم کے ابتدائی نقوش

جب شعر و نظم میں دو مختلف چیزوں کو بعض مشترک صفات کے سبب مشابہہ قرار دیا جاتا ہے تو شعر و نظم کے معنوں اور مفہوم میں چار چاند لگ جاتے ہیں اور نظم کے مفہوم کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے

درس بلاغت کے مضمون "علم بیان" کے مصنف ڈاکٹر صادق تشبیہ کے بارے میں کہتے ہیں۔

"تشبیہ کے معنی ہیں "باہمی مشابہت" جب کسی مشابہت کے باعث ایک چیز کو دوسری چیز سے مشابہ قرار دیا جائے تو (چاہے اس میں مشابہت کی وجہ کا اظہار ہو یا نہ ہو) تو اُسے تشبیہ کہتے ہیں۔" [2]

تشبیہ کے ذریعہ نظم کے مفہوم کی وضاحت واضح ہوتی ہے جو ذہن کو متاثر کرتی ہے تشبیہ و استعارہ کے علاوہ نظم کے اسلوب میں تشبیہ سازی، رمزیت اور تاثیر اور معنویت پیدا کرتے ہیں۔

"درس بلاغت" میں استعارہ کے معنی "مستعار لینا" ہیں انگریزی زبان میں اس کے لئے لفظ Metaphor استعمال کیا جاتا ہے جو یونانی زبان سے ماخوذ ہے یونانی میں اس کے معنی آگے بڑھانا ہیں ارسطو نے استعارہ کو صفائی خیال کی کلید سے تعبیر کیا ہے۔

دراصل استعارہ اپنے لغوی معنی ترک کر کے لسانی سیاق و سباق کے اعتبار سے نئے معنی

1۔ فرنگ ادبیات سلیم شہزاد ص ۲۴۰

۲۔ ڈاکٹر صادق۔ درس بلاغت ص ۱۰

متعار لیتا ہے اور انہیں آگے بڑھاتا ہے۔ جس کی وجہ سے نظم کی زبان نئی وسعتوں سے آشنا ہوتی ہے۔ نظم میں معنی کی وضاحت اور شدّت استعارہ کے سبب بڑھ جاتی ہے۔

اُردو کی جدید نظم نگاری میں مذکورہ تمام صفات ملتی ہیں۔ ان صفات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے جدید نظم نگاری کے ارتقائی سفر کی جانچ از حد ضروری ہو جاتا ہے۔

(ج) جدید اُردو نظم کا ارتقائی پہلو:۔

جدید اُردو نظم کی روایت اور تصور کی ابتداء دراصل مغربی شعر و ادب کے نمونوں سے اُردو شعراء کے روشناس ہونے کے بعد ہوئی خاص طور پر یہ زمانہ کم و بیش اٹھارویں صدی کے آغاز کا ہے جب فورٹ ولیم کالج کا قیام عمل میں آیا۔ اور جان گلکرائسٹ کی قیادت میں تصنیف و تالیف اور ترجمے کا دور شروع ہوا۔ تاریخی اعتبار سے یہ دور ۱۸۰۰ء تا ۱۸۰۴ء کا ہے ۱۸۲۴ء کے بعد دلی کالج سے علمی کتابوں کے ترجموں کی وجہ سے بھی نئی شاعری کے لئے ماحول تیار ہوا۔ اس کے بعد ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد جب ہندوستان پر برطانوی تسلط مکمل طور پر قائم ہو گیا تو انگریزی تعلیم و تفہیم بھی رواج پانے لگی۔ ساتھ ہی اُردو شعراء کو مغربی شاعری اور ادب سے متعارف ہونے کا موقع ملا۔ اور جدید نظم کا مفہوم واضح طور پر متعین ہونے لگا۔ کیونکہ مغربی قوتوں نے نہ صرف ہندوستانی زندگی کے ہر شعبے کو متاثر کیا بلکہ تمام شعر و ادب کو بھی متاثر کر دیا۔ اس سلسلے میں تاریخی نقطہ نظر سے اس بات کا تذکرہ بے جا نہ ہوگا کہ سترہویں صدی کے ابتداء سے یوروپی قومیں اہل ہند سے تعلقات بڑھا رہی تھیں اور ان کے زیر اثر انسانی زندگی کے ساتھ ساتھ شعر و ادب بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا جنگ پلاسی ۱۷۵۷ء کے بعد سے انگریزوں کے قدم مکمل طور پر جم گئے۔ اور تقریباً ۲۰۰ سال تک حکمران بن کر رہے۔ ان کے زیر تسلط کئی اچھے اور بُرے تجربات ہندوستانیوں کا مقدر بن چکے تھے۔ اسی میں ایک اچھا تجربہ انگریزی تعلیم کا رواج بھی تھا جس کی وجہ سے مغربی شعر و ادب کو سمجھنے میں مدد ملی۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے صلے میں مسلمانوں کے ایک بڑے طبقے کو نقصان اٹھانا پڑا کل تک جو حکمران تھے محکوم بن چکے تھے۔ اور اسی لئے جو شعر و ادب حاکموں کا تھا محکموں کا مقدر بننے پر مجبور ہو گیا۔ اسی دوران سر سیّد کی اصلاحی تحریک اور ان کے رفقاء کار نے جو خدمت انجام دی وہ انتہائی اہم ہے۔ انہوں نے لوگوں میں تعلیم سے رغبت دلائی

ساتھ ہی انگریزی علوم کو عام کرنے کے لئے راہ ہموار کی سر سیّد نے اصلاح قوم کے ساتھ ساتھ اصلاحِ زبان اور شاعری کی اصلاح کے لئے بھی کوشش کی۔

بقول نورالرحمٰن

"سر سیّد نے اصلاح زبان کے ساتھ ہی اصلاح شاعری پر بھی توجہ دی اور اپنے اثر و کوشش سے بے شمار قومی نظمیں لکھوائیں"۔ ۱

اسی طرح سر سیّد نے تعلیم یافتہ طبقہ کو تہذیب کے اصل اور وسیع تر معنوں میں سے روشناس کرانے کے ساتھ ساتھ شعر و ادب کے لیئے بھی جدید اور روایت شکن نظریہ اختیار کرنے کی ترغیب دلائی۔

ا) اردو ادب کی تاریخ میں ۱۸۷۴ء کا وہ دن ہمیشہ اہمیت کا حامل تصور کیا جائیگا۔ جب لاہور میں "انجمن پنجاب" نے طرحی شاعری کے بجائے موضوعاتی نظموں کے مشاعرے کی بنیاد انجمن کے باقاعدہ نظم جدید کا تصوّر ابھرا اور ایک رجحان کی شکل اختیار کر گیا۔ ویسے تو آزاد اور حالی کے زمانے میں مغربی نظموں کے ترجموں کا سلسلہ ہو چکا تھا خود حالی اور آزاد نے چند نظموں کے ترجمے کئے اور جدید نظم آہستہ آہستہ رواج پانے لگی۔

اسی طرح ۱۵؍ اگست ۱۸۶۷ء میں جب کرنل ہالرائیڈ نے انجمن پنجاب کی بنیاد ڈالی اور پرانی اُردو شاعری سے انحراف کرتے ہوئے جدید نظم کے لئے راہ ہموار کر دی۔ انجمن پنجاب کے مشاعروں میں خاص موضوع پر نظمیں لکھکر پڑھی جانے لگیں۔ الطاف حُسین حالؔی نے بھی اس مشاعرے کے لئے چار نظمیں لکھیں۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ انجمن پنجاب کا قیام جدید نظم کے فروغ کے سلسلے میں ایک اہم انقلابی قدم تھا

جدید نظم نگاری جس کے علمبردار آزاد اور حالؔی ہیں دونوں ہی حضرات کی شاعری دراصل ایک ردِّ عمل کے طور پر وجود میں آئی۔ یہ ردِّ عمل لکھنو کے زوال پذیر معاشرے کی شاعری کے خلاف تھا۔ لکھنوی شاعری عیش کوشی، تکلف، ظاہر داری، سطحیت اور زوال کا ایک بھونڈا انداز ہی تھی۔ روایتی بے جان موضوعات، شخصیت سے بیگانہ روایتی اسالیت کا استعمال اس کا طرۂ امتیاز تھا نئے حالات دراصل اس شاعری کے لئے نامناسب تھے۔ اس لئے تبدیلی ناگزیر تھی اور نئی نظم

ا۔ نورالرحمٰن۔ حیات سر سیّد ۳۲

موضوع اور ہیئت دونوں کے اعتبار سے اُردو میں ایک نئی صنف کی حیثیت سے داخل ہو رہی تھی

بقول ڈاکٹر عندلیپ شادانی

''انگریزی تعلیم اور مغربی تہذیب کے اثر سے ہمارے موضوعاتِ سخن بدلے یعنی مواد میں تبدیلی ہوئی۔ اس تبدیلی کا اثر ہیئت پر بھی پڑا اور ایک صنفِ خاص جیسے حرفِ عام میں نظم کہتے ہیں وجود میں آئی۔'' ۱؎

حالات کی تبدیلی کا شعور ہی تھا جس نے آزاد اور حالی کو نظم کا نیا تصور دیا۔ اور دونوں نے اس کی تعمیر و ترقی کے لئے کوششیں کیں۔ آزاد نے اپنے لکچروں اور تقریروں کے ذریعہ لوگوں کو جدید نظم کے لئے تیار کیا ۱۸۷۴ء کے جلسے میں مختلف موضوعات پر تحریر کی گئی موضوعات پر فطری نظمیں پڑھی گئیں اور مختلف فطری موضوعات پر نظموں کا سلسلہ شروع ہوا۔ جون ۱۸۷۴ء میں انجمن کے دوسرے جلسے میں بوستان کے موضوع پر نظمیں پڑھی گئیں اور شاہ حسین ہما، انور حسین، مرزا اشرف بیگ، منشی الٰہی بخش، رفیق آزاد، مولوی قادر بخش اور مولوی عطا اللہ وغیرہ نے بھی نظمیں پڑھیں۔ اور نظم کے تاریخ میں یہ ایک انقلاب آفریں کارنامہ تھا آزاد نے جہاں جدید نظم پر تقریریں کیں وہیں کچھ نظمیں بھی لکھیں یہ نظمیں اُردو نظم کی تاریخ میں بڑی اہم سمجھی جاتی ہین کیونکہ یہی نظمیں جدید نظم کی اولین کوششوں کی مظہر ہیں بقول کیفی دہلوی

''اگر امیر خسرو نے اُردو کا پہلا شعر موزوں کیا اگر ولؔی نے پہلا دیوان اُردو نظم کا مرتب کیا، اگر بیجو باورا نے پہلا دھرپد ہندی زبانوں میں باندھا، اگر ردودگی نے پہلا شعر فارسی کا کہا تو حضرت آزاد نے پہلی نظم نئی طرز پر موزوں فرمائی۔'' ۲؎

اس حوالے میں نئی تحقیق نے یہ اضافہ کیا ہے کہ اُردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر ولؔی نہیں بلکہ قلی قطب شاہ ہے اور ولی کے دیوان نظم سے مراد ''دیوانِ شاعری'' ہے اس طرح اس حوالہ کو مختصر سی تبدیلی کے ساتھ قبول کیا جائے گا۔

احتشام حسین بھی کیفی کی رائے سے متفق نظر آتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے

''آزاد کو نظم گوئی اور نئے تصورات کے پھیلانے میں اولیت حاصل ہے۔ اس کا

۱۔ عندلیپ شادانی، صحیفہ ۱۰ لاہور اپریل ۱۹۶۲ء

۲۔ کیفی دہلوی مغربی تصانیف کے اُردو تراجم ص ۱۰۴

تسلیم کرنا صحیح تاریخی نقطہ نظر قائم کرنے کے لئے ناگزیر ہے۔ کیونکہ اس طرح ہم ان مناظموں تک پہنچ سکتے ہیں، جنھوں نے نظم کی جگہ لے لی۔ اور اس جدید شاعرانہ تحریک کو نئے رُخ عطاء کئے جو کسی نہ کسی شکل میں آج بھی جاری ہے۔" [۱]

اس ضمن میں کلیم الدین احمد اس طرح رقمطراز ہیں:۔

"بہر کیف یہی غنیمت ہے کہ آزاد نے اس نئی قسم کی نظم کی بنیاد ڈالی۔ اور اس نئے طریقے کو کامیابی سے نبھایا۔" [۲]

دونوں ناقدوں نے محمد حُسین آزاد ہی کو جدید نظم کا پہلا شاعر تسلیم کیا ہے۔۔ اس میں شک نہیں کہ آزاد کی نظمیں موضوع کے اعتبار سے جدّت اور تازگی رکھتی ہیں۔ لیکن اس طرح کے موضوعات کے ابتدائی نقوش قصیدے اور مثنوی میں بھی پائے جاتے ہیں۔

آزاد کی نظمیں ان کے زمانے میں نیچرل شاعری کے نام سے یاد کی جاتی رہی ہیں۔ کیونکہ نظم جدید نظم کے ابتدائی دور میں یعنی انجمن پنجاب کے موضوعی مشاعروں میں مناظرِ فطرت پر نظمیں پڑھی جاتی تھیں خاص طور پر آزاد کی نظموں میں فطری حسن اور سادگی ملتی ہے۔

آزاد کی نظمیں عام طور پر ربط و تنظیم اور معنوی ارتقاء سے عاری ہیں۔ آزاد کے ساتھ ساتھ حالی نے بھی جدید نظم نگاری کے فروغ میں اہم رول ادا کیا۔ شیفتہ کے انتقال کے بعد حالی لاہور آئے اور پنجاب گورنمنٹ بکڈپو میں ملازم ہوئے یہاں انگریزی سے اُردو میں کئے گئے ترجمے کی عبارت کی درستگی کا کام ان کو تفویض ہوا تھا۔ تقریباً چار برس تک وہ یہہ کام کرتے رہے۔ جس کی وجہ سے انگریزی علم و ادب سے فی الجملہ آگاہی کا انھیں موقع نہیں ملا۔

بقول رام بابو سکسینہ

"ان کو انگریزی ادب سے ترجموں کے ذریعہ واقفیت حاصل ہوئی جس کا اثر ان پر بہت اچھا پڑا۔" [۳]

حالی نے انجمن پنجاب کے مشاعروں میں "برکھا رت" "امید" "رحم و انصاف" "حب الوطنی"

۱۔ احتشام حسین اُردو نظم کا تاریخی اور فنی ارتقاء (عکس اور آئینے) ص ۵۲

۲۔ کلیم الدین احمد اُردو شاعری پر ایک نظر حصہ دوم ص ۲۹

۳۔ رام بابو سکسینہ تاریخ ادب اُردو ص ۴۸

جیسی نظمیں پڑھیں۔اور جدید نظم نگاری کے فروغ میں حصّہ لیا۔

حالؔی کی نظموں کے تعلق سے عبادت بریلوی کہتے ہیں۔

''ان نظموں میں مغرب کا گہرا اور براہ راست اثر نہیں ہے لیکن بالواسطہ طور پر یہ مغرب کے زیر اثر ضرور لکھی گئی ہیں اور ان میں موضوع اور اندازِ بیان دونوں اعتبار سے ایک حقیقت نظر آتی ہے۔''

نظم نگاری کی جدید تحریک کا آغاز آزاد نے کیا۔حالؔی نے اُسے آگے بڑھایا حالؔی بھی ان لوگوں میں سے تھے جو ۱۸۵۷ء کے بعد نازل ہونے والے قومی سانحہ سے بے حد متاثر تھے اور جنھوں نے زمانے کی نبض کو پہچان لیا تھا۔انہوں نے نئے زمانے کے بدلتے ہوئے تیور کو بھانپ لیا تھا۔ وقت کی نزاکت کو سمجھ لیا تھا۔اسی لئے قدامت پرستی پس ماندگی اور توہمات کے اندھیروں سے نکل کر مغربی تہذیب کی روشنی میں اپنا مستقبل ڈھونڈنے کی کوشش کر رہے تھے۔

آزادؔ اور حالؔی نے جدید نظم نگاری کے جو خدوخال متعین کئے تھے اُسی کی توسیع کرنے والوں میں ان کے معاصر شعراء بھی شامل تھے جنھوں نے ان کے بعد بھی مغربی اثرات کے زیر اثر اُردو نظم نگاری کو پروان چڑھایا ان شعراء میں شبلؔی ،نذیر احمؔد ،شوق قدوائؔی ،وحید الدین سلیم، اسماعیؔل میرٹھی نظم طباطبائؔی ،سرور جہاں آبادؔی ،بے نظیر شاہ ،شاد عظیم آبادؔی ،نادر کاکوروی، برق دہلوؔی ،کیفؔی ،چکبست ،اکبرالہ آبادی وغیرہ شامل ہیں

مذکورہ تمام شعراء نظم کے صوری اور معنوی اعتبار سے آزادؔ اور حالؔی کے نظریہ کے ساتھ اپنی صلاحیتوں کو کام میں لا رہے تھے۔ان شعراء کی نظموں کے موضوعات اور تصورات بھی حالی کے خیالات کی طرح جدید نکتہ نظر کو واضح کر رہے تھے۔خاص طور پر پیرائے بیان یا ہیئت میں انہوں نے کوئی تبدیلی نہیں کی۔حالؔی کا جو انداز تھا وہی انداز انہوں نے اپنایا ،بیانیہ، ذخیرۂ الفاظ و تراکیب اور تشبیہیں استعمال کیں۔ان شعراء میں کئی ایسے بھی تھے جنھوں نے انگریزی نظموں کے نمونوں میں ہیئت کے تجربے بھی کئے بقول حامدی کاشمیری

''یہ صحیح ہے کہ بعض نظم نگاروں نے مغربی نظم کے نمونوں کے اتباع میں ہیئت کے تجربے کئے مثلاً شرؔر ،نظم طباطبائی اور اسماعیل میرٹھی نے نظم معرّیٰ کو اُردو میں

نہ صرف متعارف کیا بلکہ اُسے فروغ دینے کی بھی کوشش کی۔'' ۱

آزاد اور حالؔی کے علاوہ بعض شعراء مثلاً شوقؔ قدوائی، نادر کاکوروی، سرور جہاں آبادی نے بھی کچھ نظمیں لکھیں اس طرح جو روایت آزاد اور حالؔی نے قائم کی تھی ان کے بعد جدید نظم کے خدو خال زیادہ واضح ہونے لگے۔ ساتھ ہی انگریزی نظموں کے تراجم کی اچھی خاصی تعداد بھی سامنے آنے لگی اس سلسلے میں غلام مولا قلق میرٹھی کا انگریزی نظموں کا اُردو میں منظوم ترجمہ ''جواہر منظوم'' اور بانکے بہاری لال کے منتخب انگریزی نظموں کے تراجم مثال کے طور پر پیش کئے جا سکتے ہیں۔ ان کے علاوہ اس سلسلے میں ایک قابل ذکر اور خاص نام اسماعیل میرٹھی کا ہے جنہوں نے بچوں کے لئے بڑی سبق آموز نظمیں لکھیں اور انگریزی کا اُردو میں ترجمہ کیا۔ انہوں نے بلینک ورس نظمیں بھی لکھیں درگا سہائے سرور نے بھی انگریزی شاعری کا اُردو میں ترجمہ کیا۔

آزاد اور حالؔی کے بعد شبلؔی نعمانی نے بھی جدید اُردو نظم کے لئے راہ ہموار کی جسے ادبی تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ انہوں نے حالؔی اور آزاد کے ساتھ ساتھ سرسیّد سے بھی ربط رکھا اور پروفیسر آرنلڈ سے بھی ان کا تعلق رہا۔ انہوں نے مغربی شاعری کا بھی مطالعہ کیا اور اس پس منظر میں شبلؔی نے جو نظمیں لکھی وہ جدید نظم کی ہی ترجمانی کرتی ہیں انھوں نے شاعری کے لئے محاکات اور تخیل کو ضروری عنصر قرار دیا۔ تنقید پر ان کی گہری نظر تھی اس لئے انہوں نے نظم نگاری کی خصوصیات پر خاص طور پر غور وفکر کیا۔ چنانچہ ان کی نظموں کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ ان میں ایک حساس دل کی دھڑکنوں کا ارتعاش محسوس ہوتا ہے شاعری گو کہ اُن کی فطرت میں شامل تھی اور آزاد وحالؔی کے نقشِ قدم پر چل کر انہوں نے چند بہترین نظمیں اُردو شاعری کو دیں۔ جو اپنی خصوصیات کے اعتبار سے بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔ انہوں نے اپنی نظموں میں مسلمانوں کے موجودہ تنزل اور پستی کو شدّت سے محسوس کیا اور اپنے دور کے اہم سیاسی واقعات کو بھی توجہ کا مرکز بنایا۔

آزاد،، حالؔی اور شبلؔی کے بعد نظم نگاری کے سلسلے میں ایک اہم نام سامنے آیا ہے۔ وہ ہیں حافظ نذیر احمد۔ ان کی پیدائش ۱۸۳۱ء میں ہوئی اور انتقال ۱۹۱۲ء میں ہوا انہوں نے بھی اُردو نظم کو ترقی دینے میں اپنا حصّہ ادا کیا۔ نذیر احمد صاحب اپنے عہد کی تحریکات سے متاثر تھے لیکن ادبی فکر وفن میں سماجی مسائل سے زیادہ

۱۔ حامدی کاشمیری۔ اُردو نظم پر یوروپی اثرات ص ۱۱۶

دلچسپی رکھتے تھے۔ حافظ نذیر صاحب انگریزی تعلیم کو عام کرنے کے حق میں تھے۔ انہوں نے اپنی نظموں میں علوم جدید کی اہمیت کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ان کی نظموں کی خوبی یہ ہے کہ بعض مقامات پر جذبات کے پر جوش انداز کی وجہ سے تاثیر میں شدت پیدا ہو جاتی ہے "فسانہ مبتلا کے آخر میں بطورِ ضمیمہ انہوں نے ایک نظم شامل کی جو مسدّس کے روپ میں ہے اور یہ نظم کثرت ازدواج کے خلاف لکھی گئی ہے اس نظم سے متعلق آمنہ صدیقی رقمطراز ہیں۔

"اگر کوئی یہ پوچھے کہ نذیر احمد کی بہترین نظم کونسی ہے تو بلا خوف و تردید اس مسدّس کی طرف اشارہ کیا جاسکتا ہے" [1]

جدید اُردو نظم کی تحریک جو آزاد اور حالی نے شروع کی تھی اس سے متاثر ہو کر کئی شعراء جدید نظم پر طبع آزمائی کرنے لگے۔ انہی شعرائے کرام میں اسمٰعیل میرٹھی خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ وہ چونکہ پیشہ تدریس سے وابستہ تھے۔ اس لئے بچوں کی نفسیات، عادات اور جذبات کو بخوبی سمجھتے تھے۔ اور یہی ان کی نظموں کا محرک بھی ہے۔ انہوں نے برسات، خدا کی کاریگری، کوا، اونٹ، عجیب چڑیا، گائے، جگنو اور بچہ، جاڑا اور گرمی وغیرہ جیسی موضوعاتی نظمیں لکھیں اور اس طرح جدید اُردو نظم کے فروغ میں حصّہ لیا۔

آزاد اور حالی کے بعد اسماعیل میرٹھی نے قدیم شاعری کے جھوٹ مبالغہ آرائی اور کھوکھلے پن کو سمجھ لیا تھا۔ اسی لئے انہوں نے روائیتی شاعری کے بجائے جدید نظم نگاری پر طبع آزمائی کی۔ ساتھ ہی انگریزی نظموں کے ترجمے بھی کئے۔ ۱۸۵۷ء میں عبدالحلیم شررؔ نے رسالہ "دلگداز" جاری کیا۔ گو کہ شررؔ ناول نگار کی حیثیت سے پہنچانے جاتے ہیں۔ لیکن انہوں نے کچھ نظمیں بھی لکھیں۔ اور نظم نگاری کے ارتقاء میں ان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اسی لئے ان کا تذکرہ ضروری بھی ہے۔ انہوں نے "زمانہ اور اسلام" کے عنوان سے نظم لکھی۔ بقول خلیل الرحمٰن اعظمی

"اُردو نظم میں جدید اسلوب اور جدید ہیئت کو رائج کرنے اور اُسے فروغ دینے کے لئے ایک باقاعدہ تحریک چلانے کا سہرا مولوی عبدالحلیم شررؔ کے سر ہے۔" [2]

جدید اُردو نظم نگاری کے سلسلے میں اکبر الہ آبادی کا نام کافی اہمیت رکھتا ہے انہوں نے نہ

---

[1] آمنہ صدیقی۔ اُردو شاعری۔ ص ۱۱۰ [2] خلیل الرحمٰن اعظمی۔ اُردو نظم کا نیا آہنگ۔ (سوغات جدید نظم ص ۸۱)

صرف جدید نظم کو فروغ دیا بلکہ اُردو نظم میں طنز و مزاح کے طرز کو بھی اپنایا۔ اس لحاظ سے جدید اُردو نظم نگاری کے ارتقاء میں ان کو اہم مقام حاصل ہے۔

اکبرالہ آبادی نے انگریزی نظموں کا مطالعہ کیا تھا۔ لیکن انگریزی ادب میں نظم کے لئے جو فنی باریکیاں موجود تھیں ان میں وہ پوری طرح واقف نہ تھے لیکن طنز و مزاح کے میدان میں انھوں نے جو کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں اسی کی وجہ سے جدید نظم نگاری کے لئے ایک مستحکم روایت قائم ہوتی جارہی تھی۔ اکبرالہ آبادی نے نوجوانوں کے اخلاقی تنزل کا مضحکہ اڑایا ہے۔ جس دور میں سرسیّد اور ان کے رفقاء انگریزی تعلیم و تہذیب کو مسلمانوں کی ترقی کے لئے ضروری قرار دے رہے تھے اسی دور میں کچھ نقادوں کے خیال میں اکبر کی رجعت پسندی اور محدود نظریہ کی نمائندگی ان کی شاعری میں دکھائی دیتی ہے بقول خلیل الرحمٰن اعظمی

"چنانچہ اکبر کا یہی منفی رویہ تھا جس کی وجہ سے نہ صرف وہ کوٹ پتلون، انجن، ریل، بجلی کی روشنی، مشین، بھاپ، اسپتال، کالج اور انگریزی تعلیم کی عمر بھر مخالفت کرتے رہے اور ان کا مضحکہ اُڑاتے رہے بلکہ انہوں نے اس دور کی قومی تحریکوں کی مخالفت میں بھی سارا زور صرف کیا"۔ ١

اکبرالہ آبادی نے اُردو نظم میں طنز و مزاح کے موضوع کو شامل کر کے اُردو نظم کی ترقی و ترویج میں اہم رول ادا کیا۔ حالؔی، شبلؔی، آزاد اور سرسیّد نے جس اصلاحی تحریک کو پروان چڑھایا تھا اس تحریک سے متاثر ہو کر جدید نظم نگاری کی طرف رجوع ہونے والے ایک اہم شاعر شاؔد عظیم آبادی بھی ہیں

بقول محمد ذکی الحق

"سرسیّد اور حالی نے جس اصلاحی تحریک کی بنیاد ڈالی تھی شاد عظیم آبادی اس اصلاحی تحریک کے ہمنوا تھے۔" ٢

شاؔد عظیم آبادی نے حالؔی کے مقدمہ شعر و شاعری سے گہرا اثر قبول کیا تھا ان کا ایک منظوم خط ہے جس میں انہوں نے شعر کی خوبیاں اور صنائع لفظی متروکات اور غزل کے مضامین

١۔ خلیل الرحمٰن اعظمی۔ اُردو نظم کا نیا رنگ (سوغات جدید نظم) ص ٨١

٢۔ محمد ذکی۔ سرفروش ہستی ص ٧٣

وغیرہ پر اظہار خیال کیا ہے۔ اس خط کو پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ شاد انگریزی نظم کے تعلق سے واقف تھے انھیں انگریزی نظموں کے ترجمے سننے کے مواقع ملے تھے۔ جس کا تذکرہ وہ اپنی خود نوشت میں کرتے ہیں۔

> ''اس صحت میں ایک ذی علم پنڈت بشن نرائن اور ایک بنگالی مسلمان اسماعیل ابوالرحمٰن بھی آنے لگے تھے۔ پنڈت جی کو سنسکرت اور کچھ فارسی میں دخل تھا۔ اسماعیل ابوالرحمٰن کو انگریزی میں بہت دخل تھا کئی دنوں ان دونوں صاحبوں کے آپس میں مباحثے ہوئے اسماعیل کا دعویٰ یہ تھا کہ انگریزی شاعری سے بہتر کوئی شاعری نہیں ہے۔ سیّد صاحب (شاد عظیم آبادی) کہتے ہیں کہ میں نے تو فارسی کے اکثر اور بعض عربی کے دیوان دیکھے تھے۔ مگر ان شعروں کے مضامین کچھ ایسے دلچسپ تھے کہ بے اختیار دل کھنچ گیا۔ اکثر دونوں صاحبوں پر شعر پڑھ کر ترجمہ کی فرمائش کرتا اور متلذذ ہوتا تھا۔ ترجمہ لکھ لیتا تھا اور چاہتا تھا کہ اُردو میں بھی یہی اسلوب قائم کروں۔'' [1]

شاد عظیم آبادی کی نظموں میں شخصی سطح پر محسوس کیے گئے تجربات کا عکس نظر آتا ہے۔ جن میں تخیل کی رنگینی نہیں احساس کی باریک بینی ہے۔

اُردو جدید نظم نگاری کے سلسلے میں ایک اور اہم نام سامنے آتا ہے جنھیں ہم نظم طبائی کے نام سے جانتے ہیں۔ بقول حامد کاشمیری

> ''جدید اُردو نظم کے صوری خدوخال واضح کرنے میں اہم رول ادا کیا۔ انہوں نے کچھ انگریزی نظموں کے منظوم ترجمے کیے اس کے علاوہ چند نظمیں ایسی بھی لکھیں جو انگریزی نظموں کے اتباع میں ہیئت کے اعتبار سے جدت رکھتی ہیں۔'' [2]

نظم طبائی نے کئی انگریزی نظموں کا ترجمہ کر کے اُردو میں نظم نگاری کی روایت کو فروغ دیا۔ انہوں نے گرے کی نظم کا ترجمہ ''نوحہ عبرت'' کے عنوان سے کیا۔ انہوں نے خاص طور پر اسٹینز افارم کا انداز اپنایا جو انگریزی نظم کا حصہ ہے انہوں نے گورِ غریباں کے عنوان سے نظم کا

۱۔ شاد عظیم آبادی (خود نوشت سوانح عمری)

۲۔ حامدی کاشمیری۔ اُردو نظم پر یوروپی اثرات ۱۴۵

ترجمہ کیا اس نظم کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کو دیکھ کر کچھ اور نظموں کا ترجمہ کیا ان میں دعوت زہرہ، یادِ رفتگاں، ہمدردی وثابت قدمی، جوہر شرافت ان کے منظوم تراجم میں شامل ہیں۔

یہ کہا جاسکتا ہے کہ درج بالا نظموں کے ترجموں کی وجہ سے جدید اُردو نظم اُردو میں فروغ پاتی رہی۔ اور اُردو نظم نگاروں کے لئے فکروفن کے نئے افق روشن کئے۔ نظم طباطبائی نے ترجموں کے علاوہ کچھ طبع زاد نظمیں بھی لکھیں۔ جس میں منظر نگاری اور اخلاقی موضوعات بھی نظم کئے۔

نظم طباطبائی کے بعد ایک اہم نام وحیدالدین سلیم کا ہے جنہوں نے اُردو نظم کے ارتقاء میں اہم رول ادا کیا۔ انھیں شعروسخن سے لگاؤ تھا۔ اور حالی سے کافی متاثر تھے۔ چنانچہ مخمس سلیم، نغمہ زندگی وطن سے خطاب وغیرہ نظموں میں حالی کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ اور مقدمہ شعروشاعری کی اشاعت کے بعد غزل سے خاص طور پر بیزار ہوگئے تھے بقول خلیل الرحمٰن اعظمی ''سلیم شاعری میں نظم گوئی کو رواج دینے اور اُردو شاعری میں تاریخی بیانیہ اور منظری نظموں کو فروغ دینے میں وہ بہت پیش پیش رہے۔'' [1]

وحیدالدین سلیم کی چند اہم نظمیں ہیں اُن میں۔ تخیل کے کرشمے، مجاز سے حقیقت تک جلوے، نیم کے پتے، رقاصہ، خواب وخیال اور زندگی قابل ذکر ہیں۔ ان نظموں کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں شعری تجربے کی وحدت اور اس کا ارتقاء نظر آتا ہے۔

اُردو نظم کے ارتقاء میں سرور جہاں آبادی کا اہم کردار رہا ہے ان کی نظموں میں موضوعات کی بوقلمونی ملتی ہے اور ساتھ ہی انگریزی نظموں کے تخلیقی رجحان کی نشاندہی بھی ملتی ہے۔

بقول باوا کرشن مغموم کے تراجم زبان وبیان کے محاسن سے مالا مال ہیں۔ اور ''ان کی نقل یعنی (ترجمہ) میں اصل کا مزہ ہے۔ اور محض ان کی قادرالکلامی عمیق مشاہدات اور وسعت معلومات کا کرشمہ ہے۔ ان کے منظوم تراجم پر ان کی طبع زاد نظموں کا گمان ہوتا ہے۔'' [2]

سرور جہاں آبادی کی نظموں میں ''کام زار پستی، آنے والی گھڑی سالِ گذشتہ، کوئل، مرغابی، موسم گرم کا آخری گلاب وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ سرور جہاں آبادی کے دور میں حب الوطنی کے جذبات بھی شاعروں کے عام موضوعات تھے۔ سرور جہاں آبادی کی نظم نگاری میں زبان و

ا۔ خلیل الرحمٰن اعظمی۔ علی گڑھ تحریک ۳۱۸

۲۔ باوا کرشن مغموم۔ ہماری اُردو شاعری ص ۷۱

بیان کا ایک قابل ستائش کارنامہ ہے کہ انہوں نے فارسی ترکیبوں کے ساتھ ساتھ ہندی کے سریلے الفاظ بھی کافی تعداد میں استعمال کیئے۔

اُردو نظم نگاری کے ارتقاء میں نادر کاکوروی بھی اپنا ایک علحیدہ مقام رکھتے ہیں۔ انہوں نے اُردو نظم کو جدید آہنگ اور داخلی گداز عطا کرنے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ کئی انگریزی نظموں کے ترجمے کیئے ان ترجموں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نظم کی روح میں اتر گئے ہیں۔ ان کی نظم نگاری میں ان کے تصورات، جذباتی فضاء کیفیت اور تاثیر کو بخوبی محسوس کیا جاسکتا ہے۔ جو انگریزی نظم کے اوصاف ہیں۔ ان کی مشہور نظمیں گذرے ہوئے زمانے کی یاد، شاعر کا دل، مرحومہ کی یاد میں اور لائٹ آف حرم قابل ذکر ہیں۔

اُردو نظم نگاری کا اگلا پڑاو برج نرائن چکبست ہیں گو کہ ان کی نظموں کی تعداد مختصر ہے لیکن نظم نگاری کو بلند مقام تک پہنچانے میں انھوں انفرادی مقام حاصل کیا بقول پروفیسر احتشام حُسین۔

> ''انیسویں صدی جاتے جاتے ہمیں ایک مبہم سا قومی تصور دیتی گئی اور چکبست اسی دور کی پیداوار ہیں تقریباً ۱۹۱۷ء تک ہندوستانی بیداری کا یہی پیام رہا کہ ہم میں وطن کی محبت پیدا ہو وطن سے محبت کرنے والوں سے محبت پیدا ہو۔ ہندوستان کو ایک قومی حیثیت دی جائے اور ملکی انتظام میں ہندوستانیوں کا بھی ہاتھ ہو۔'' [1]

مطلب یہ کہ چکبست کی نظموں میں سیاسی حالات کی پرچھائی نظر آتی ہے چکبست کی قابل ذکر نظموں میں۔ فریادِ قوم، ہمارا وطن، آوازۂ قوم، خاک ہند، رامائن کا ایک سین وغیرہ ہیں۔

اُردو نظم نگاری کے ارتقاء میں تلوک چند محروم کا کام بھی قابل ذکر ہے۔ انہوں نے انگریزی نظموں کا ترجمہ کیا اور کچھ طبعزاد نظمیں بھی لکھیں۔

اُردو نظم نگاری کے ارتقاء میں بیسویں صدی میں مقامی اور یوروپی سطح پر ابھرنے والی سیاسی، معاشی و ادبی تحریکوں اور تنقید و تجربہ نے بھی اہم رول ادا کیا۔ اس دور کے اہم نظم نگاروں میں اقبالؔ، جوشؔ، سیماب اکبر آبادی، جمیل مظہری، اختر شیرانیؔ، مجازؔ، حفیظ جالندھری، سکندر علی وجد، ن۔م۔راشد میراں جی، فیض احمد فیض، اختر الایمان، سردار جعفری، مخدوم محی الدین، جاں نثار اختر، قتیل شفائی، احسن یوسف زئی، ساحر لدھیانوی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

[1] احتشام حُسین تنقیدی جائزے ص ۱۱۹

اُردو کی ادبی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ۱۹۰۱ء میں رسالہ 'مخزن'' کا اجراء ہوا۔ یہ رسالہ اُردو نظم نگاری کی ارتقائی تاریخ میں بڑی اہمیت کا حامل ہے اس رسالے میں جس شاعر کا کلام شامل ہوا اُس نے نظم نگاری کے لئے اور خاص طور سے جدید نظم کو ایک نئی ترقی کی سمت دینے کا کارنامہ انجام دیا علامہ اقبالؔ یہیں سے ابھر کر ادبی افق پر چھا گئے اقبال کی نظم نگاری اقبال کی نظم نگاری ایک لامتناہی سلسلے کی کڑی ہے۔ انہوں نے اُردو نظم کے لئے نہ صرف فکر و فلسفہ کو اپنایا بلکہ معاشرے اور سماج کے رِستے ہوئے ناسوروں پر مرہم رکھنے کا کام بھی کیا۔

بیسویں صدی دراصل مایوسی ،تشکیک اور انتشار کی صدی ہے اور اس دور کے نظم نگاروں نے اپنی نظموں میں مذکورہ مسائل ہی کو موضوع بنایا ہے۔ اور خاص طور سے اقبال کی نظموں میں ان تمام باتوں کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔

جوش ملیح آبادی بھی اُردو نظم کے اہم ستون ہیں۔ ان کا رجحان رومانوی طرز کا ہے۔ اس کے ساتھ ہی انقلابی رجحان بھی نمایاں ہے ان کی نظموں میں پیمان محکم ،غلاموں سے خطاب، آثارِ انقلاب شکستِ زنداں کا خواب وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

ایسے اور کئی نام اُردو نظم نگاری کے ارتقاء کے سلسلے میں لئے جاسکتے ہیں جن کا تذکرہ اس سے قبل بھی کیا جاچکا ہے۔ اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ جدید نظم نگاری کی ابتداء جو حالؔی سے ہوئی تھی آج بھی جاری ہے اور نئے نظم نگار فنی اصولوں سے مزید استفادہ کرتے ہوئے روایتی اصناف اور اسالیب پر تکیہ کرنے کی بجائے نئے اسالیب بیان فن و تکنیک کو بھی بروئے کار لانے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ اس لئے اگر یہہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ جدید اُردو نظم موجودہ دور میں جس تیز رفتاری کے ساتھ عالمی تحریکوں، ادبی نظریوں ،اور نئے اسالیب سے ہم آہنگ ہوتی جارہی ہے وہ قابل تحسین ہے اس کے علاوہ اُردو نظم نے سیاسی ردوبدل، مسائل اور ہجرت کے علاوہ کئی ایسے موضوعات کو نظم میں شامل کر کے نہ صرف اس صنف کو ہمہ گیری عطا کردی بلکہ نظم کی صنف کو اس قدر وسیع بنادیا کہ آج دنیا کے ہر موضوع کے اظہار کے لئے نظم کا انداز اور آہنگ کا موثر نمائندگی کرتا ہے۔

جدید اُردو نظم میں ہئیت کے تجربے اور پس منظر:۔

یہہ بات تو سبھی جانتے ہیں کہ زندہ ادب کی خصوصیات یہ ہے کہ وہ دوسری زبانوں کے

ادب سے اثرات قبول کرتا ہے۔اور دیگر اصناف ادب سے متاثر ہو کر اپنے لئے نئی راہیں تلاش کرتا ہے۔اس طرح زبانوں کے ادب کا سفر جاری رہتا ہے۔اور نئی منزلوں سے ہمکنار ہوتا رہتا ہے۔

اُردو ادب بھی دیگر عالمی زبانوں کے ادب سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔خاص طور سے جب مغربی ادب ہندوستان میں داخل ہوا اور اُس سے استفادہ کرتے ہوئے محمد حُسین آزاد نے جدید شاعری کا آغاز کیا اسی دور سے اُردو میں انگریزی شعر و ادب کے اثرات کا آغاز ہوتا ہے اور پہلی مرتبہ اُردو شاعری انقلابی فضاء سے آشنا ہوتی ہے۔اور وقت کے ساتھ ساتھ اسکا دائرہ وسیع ہوتا جاتا ہے۔جدید جدید اُردو نظم جو کہ ۱۸۵۷ء کے بعد وجود میں آئی۔اس پر بھی انگریزی شعری ادب کے اثرات نمایاں ہیں۔

☆ شعر و ادب میں تبدیلی:

کائنات کی ہر شئے میں تبدیلی فطری عمل ہے زندگی کے ساتھ ساتھ شعر و ادب میں بھی یہ عمل فطری ہوتا ہے اس میں دو رائے نہیں تبدیلی کا یہ عمل مسلسل جاری رہتا ہے۔تاریخی اعتبار سے سماجی ضروریات تہذیبی اقدار، اجتماعی رجحانات و انفرادی میلانات غرض زندگی کے گوناگوں تقاضے ان تبدیلیوں کا سبب بنتے ہیں۔

ادب میں تبدیلی کے عمل کی نوعیت جداگانہ ہوتی ہے ادب زندگی کا ترجمان ہونے کے ساتھ ساتھ زندگی کا مفسر و مبصر بھی ہے بہ حیثیت فن وہ ایک شعوری عمل کا نتیجہ بھی ہے اس لئے ادب میں تبدیلی غیر شعوری نوعیت سے بھی ہوتی ہے اور شعوری نوعیت کی بھی۔اجتماعی سطح پر بھی اور انفرادی سطح پر بھی اسی لئے ان تبدیلیوں کو جن میں روایت سے واضح انحراف یا کسی نوعیت کا اجتہاد پایا جائے اُسے تجربات کا نام دیا جاتا ہے لیکن تجربہ اُسے کہتے ہیں جو شعر و ادب کی خارجی سطح پر تبدیلی کا عمل ہو۔داخلی سطح پر رونما ہونے والی تبدیلی کو تجربہ نہیں کہا جاسکتا۔کیوں کہ داخلی دنیا تخلیق کار کی اپنی سوچ اور فکر کی دنیا جس میں وہ کسی اور کو شریک نہیں کرتا جذبات واحساسات اور مضامین و موضوعات کا خزانہ اس کے قبضہ اختیار میں رہتا ہے۔جسے وہ اپنی تخلیقات میں پیش کرتا ہے یہ کہا جاسکتا ہے کہ ادب میں تجربے کا تعلق ہیئت ،تکنیک اور اسلوب سے ہوتا ہے مواد اس کے

دائرہ سے خارج ہے۔ ادب میں ہیئت کا محدود و مخصوص مفہوم مراد ہے جسے ساخت یا سانچے کے لئے استعمال کیا گیا بقول حنیف کیفی

"ادب میں جب بھی ہیئت کے تجربوں کا ذکر کیا جاتا ہے تو اس سے ہیئت کا وہ محدود و مخصوص مفہوم مراد لیا گیا ہے جسے ساخت یا سانچے Structure کا نام دیا جاتا ہے۔ اپنے جذبات و خیالات کو مشکل سے مختلف و متمائز ہوتا ہے اور بیک نظر پہچان لیا جاتا ہے کسی فن پارہ کی اس واضح پہچان کو اس کی ہیئت کہا جاتا ہے۔" ۱

اُردو شاعری میں ہیئت کے تجربوں کا آغاز :۔

اُردو شاعری تجربوں کے دور سے گذرتی رہی ہے قدیم شاعری یعنی ۱۸۵۷ء سے پہلے کی شاعری کا دامن بھی ان تجربوں سے خالی نہیں ہے۔ مثلاً مرثیہ کی صنف کے لئے غزل کی ہیئت سے لیکر مسدس تک مختلف ہیئتوں کا استعمال کیا گیا ہے، اگر اُردو شاعری کا مطالعہ کیا جائے تو صحیح معنوں میں ہیئت کے تجربوں کا آغاز انگریزی ادب کے اثرات کے تحت ہی جدید شاعری کے پرچم تلے ہوا ہے۔ اس جدید شاعری کو تمام عملی مقاصد کے تحت جدید نظم نگاری کا نام دیا جاسکتا ہے۔ رفتہ رفتہ اسی جدید اُردو نظم نے تحریک کی شکل اختیار کرلی۔ اور پھر اس میں ہیئت کے تجربے بھی کئے جانے لگے۔

بقول حنیف کیفی

"حالیؔ کے شاگرد کیفیؔ جنہوں نے نظم غیر مقفیٰ لکھنے کے سلسلے میں حالیؔ کا مشورہ قبول نہ کیا تھا بعد میں خود اپنی مرضی سے اس کا تجربہ کرنے پر آمادہ ہوگئے۔" ۲

اُردو میں نظم نگاری کی تحریک انگریزی ادب کے اثرات کی وجہ سے ہی پروان چڑھی لیکن یہ اثرات اپنی نوعیت کے اعتبار سے بالواسطہ تھے۔ اور ان کا دائرہ کار محدود تھا۔ بنیادی طور پر اس جدید شاعری کا تعلق توسیع مضامین تھا۔ مگر جدید شاعری کے معماران کو ہیئت کی تبدیلی کا بھی احساس تھا۔ حالیؔ نے نظم غیر مقفیٰ کا ذکر کیا ہے۔ آزادؔ اور اسمٰعیل میرٹھی نے غیر مقفیٰ نظم کا تجربہ بھی

۱۔ حنیف کیفی اُردو میں نظم معریٰ اور آزاد نظم ابتداء تا ۱۹۴۷ء ۸۹ء ۲۔ ایضاً

کیا۔ یہ بات الگ ہے کہ انہوں نے تبدیلی کا شعور پیدا کیا۔ جو آئندہ شعراء کے لئے شاعری کی ہیئت میں تبدیلیاں کرنے کے لئے زمین ہموار کرنے کا سبب بنی۔

انگریزی ادب کے براہ راست مطالعہ کے نتیجہ میں انیسویں صدی کے اواخر میں انگریزی نظموں کے منظوم ترجموں اور انگریزی نظموں کے طرز پر طبع زاد نظمیں لکھنے کا رواج زور پکڑنے لگا۔

پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی نے اُردو شاعری کو انگریزی کے ایک مخصوص اسٹیزاء سے روشناس کرایا۔ نظم طباطبائی نے اپنی نظم گورِ غریباں کے ذریعہ اُسے مقبول عام کیا۔ عبدالحلیم شرر نے اُردو شاعری کی آزادیوں کی طرف توجہ مبذول کرائی۔ انگریزی ادب کے ذریعہ اُردو میں بھی آزاد نظموں کا چلن عام ہونے لگا اور نظم معریٰ اور سانیٹ کا رواج عام ہوا رفتہ رفتہ تصدق حسین خالد، ن۔م راشد اور میراں جی سے ہوتا ہوا یہ سلسلہ آگے کی جانب سفر کرنے لگا۔

☆ جدید نظم کی ہیئتیں یا قسمیں:

انیسویں صدی میں ایک اہم حادثہ ۱۹۱۴ء میں رونما ہوا جسے پہلی جنگ عظیم کہا جاتا ہے اس حادثہ کی وجہ سے کئی طرح کے اثرات مرتب ہوئے اور سیاسی، سماجی، معاشی اور تہذیبی زندگی کا نیا سفر شروع ہوا ہندوستان میں اس جنگ کے اثرات سیاسی شعور کی ترقی اور معاشی بدحالی کے روپ میں میں نظر آتے ہیں۔ انہی حالات نے شعر و ادب کو متاثر کیا۔ بقول عنوان چشتی

> ”تاجور نجیب آبادی نے ۱۹۱۸ء میں سر عبدالقادر کی صدارت میں ”انجمن اربابِ علم پنجاب میں قائم کی۔ جس کے بہت سے مقاصد میں سے چند مقاصد معریٰ نظم کو فروغ دینا دوسری زبان کے اوزان کو اُردو میں رائج کرنا ہندی الفاظ اور روایت کو برتنا اور شعری تجربوں کو فروغ دینا بھی تھے۔“[1]

یہ کہا جاسکتا ہے کہ پہلی جنگ عظیم کے بعد ادبی دنیا میں بھی کافی ردّ و بدل ہوا۔ ہندوستان اشتراکی خیالات سے روشناس ہوا لوگوں نے معاشی اور مادی نقطہ نظر سے اشیاء و احوال کو دیکھنا شروع کیا۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کا قیام عمل میں آیا۔ فرائڈ کے نفسیاتی خیالات اُردو ادب پر اثر انداز ہوئے آسکر کے جمالیاتی نظریہ سے لوگ واقف ہوئے۔ مغرب کی

---

[1] عنوان چشتی۔ اُردو شاعری میں ہیئت کے تجربے ص ۱۷۲

بہت سی تحریکیں مثلاً اشاریت اور پیکریت کے دبستانوں سے اُردو شعر و ادب متعارف و متاثر ہوئے اور ان تمام عوامل نے اُردو شاعروں کو نئی جذباتی اور ذہنی کیفیت سے آشنا کیا۔ جس کا اظہار نئے تجربوں کی صورت میں ظاہر ہوا۔

اگر غور کیا جائے تو اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ ادبی افق پر نمودار ہونے والی شعری ہیئتیں دو حصّوں میں تقسیم تھیں۔ مغربی زبانوں کی نئی ہیئت (۲) مشرقی زبانوں کی نئی ہیئتیں۔

مغرب کی ہیئتوں میں سانیٹ۔ آزاد نظم اور ترائلے شامل کئے جاسکتے ہیں۔ وہیں مشرقی ہیئتوں میں جاپانی ادب کی ہیئتیں شامل کی جاسکتی ہیں۔ مثلاً ہائیکو۔ ٹنکا وغیرہ اُردو ادب میں جن شعری ہیئتوں کو برتا گیا کچھ اس طرح ہیں۔

☆ سانیٹ:

سانیٹ اطالوی لفظ سانیتو سے ماخوذ ہے جس کے معنی مختصر آواز یا راگ کے ہیں لیکن ادبی اصطلاح میں سانیٹ غنائی شاعری کی ایک ایسی ہیئت کو کہتے ہیں جس میں چودہ (۱۴) مصرعے ہوتے ہیں اور بحر و قوافی کا مخصوص نظام ہوتا ہے۔ اس صنف کا موجد اطالوی شاعر ''پیٹرارک'' کو مانا جاتا ہے۔ یہ صنف اٹلی سے فرانس اور انگلستان ہوتے ہوئے اُردو زبان میں آئی۔ چودھویں صدی کی تیسری دہائی میں عظمت اللہ خان ن۔م۔ راشد اور اختر شیرانی نے اس ہیئت کی بنیادوں کو اُردو میں مستحکم کیا۔
بقول فرمان فتح پوری۔

> ''اُردو زبان میں اس صدی کی تیسری اور چوتھی دہائی میں عظمت اللہ خان ن۔م راشد اور اختر شیرانی نے اس کی طرح ڈالی۔''[۱]

ٹکنک کے اعتبار سے سانیٹ چودہ (۱۴) مصرعوں پر مشتمل ہے جو دو حصّوں میں تقسیم ہوتی ہے پہلے حصّہ میں آٹھ مصرعے ہوتے ہیں اس کو مثمن کہتے ہیں جس میں چار چار مصرعوں کے دو مربع ہوتے ہیں اس میں دو قافیے استعمال کئے جاتے ہیں۔ مثلاً ایک قافیہ الف اور دوسرا قافیہ 'ب' ہے جو درج ذیل ترتیب میں ہوتے ہیں۔

۱۔ اُردو شاعری کا فنی ارتقاء فرمان فتح پوری ص ۵۰۶

الف ،ب، ب، الف الف ۔ب ۔ب ۔الف

یعنی پہلا مصرع چوتھے پانچویں اور آٹھویں مصرع کا ہم قافیہ ہوگا اور دوسرا مصرع تیسرے چھٹے اور ساتویں مصرع کا ہم قافیہ ہوگا۔ سانیٹ کا دوسرا حصّہ چھ مصرعوں کے دو بندوں پر مشتمل ہوتا ہے جنہیں مثلث کہتے ہیں اس حصّہ میں پہلے قوانی سے مختلف دو یا تین قوانی استعمال کئے جاتے ہیں مسدس کی ترتیب قوانی میں تبدیلی اور تنوع کی کافی گنجائش ہے مگر اس میں بھی تین قوانی سے زیادہ استعمال نہیں کئے جاتے ہیں جن کی ترتیب درج ذیل ہے۔

۱) ج ۔د ۔ج ۔دج ۔د ۲) ج ک ل ۳) ح س ص س چ ص

سانیٹ کے دونوں حصّوں یعنی مثمن اور مسدّس کے درمیان وقفہ ہوتا ہے۔ دونوں حصّوں کے درمیان کافی فاصلہ چھوڑا جاتا ہے تا کہ ایک حصّہ دوسرے حصّے کا درمیانی فاصلہ ذہن پر واضح ہو سکے۔ نیز پہلے مصرع سے جو خیال شروع ہوتا ہے وہ آخری یعنی چودھویں مصرع تک جاری رہتا ہے دونوں حصّے ایکدوسرے کے لازمی اور منطقی نتیجہ ہوتے ہیں۔

پروفیسر عنوان چشتی نے اپنی کتاب اُردو شاعری میں ہیئت کے تجربے'' یں ن۔م۔راشد کی درج ذیل سانیٹ کو بطور مثال پیش کیا ہے۔

ستارے

نکل کر جوئے نغمہ خلد زارِ ماہ و انجم سے
فضائی وسعتوں میں ہے رواں آہستہ آہستہ
بہ سوئے نوحہ آباد جہاں آہستہ آہستہ
نکل کر آرہی ہے اک گلستانِ ترنم سے
ستارے اپنے میٹھے مدھ بھری ہلکے ترنم سے
کئے جاتے ہیں فطرت کو جواں آہستہ آہستہ
دیارِ زندگی مدہوش ہے ان کے تکلم سے
یہی عادت ہے روزِ اولین سے ان ستاروں کی

چمکتے ہیں کے دنیا میں مسرت کی حکومت ہو
چمکتے ہیں کہ انسانی فکر ہستی کو مٹا ڈالے

لیے ہے یہ تمنا ہر کرن ان نو پاروں کی
کبھی یہ خاکدان گہوارۂ حسن و لطافت ہو
کبھی انسان اپنی گم شدہ جنت کو پھر پالے

اُردو میں سانیٹ انگریزی زبان کے حوالے سے آئی سیّد احتشام حُسین نے اپنے مضمون ''سانیٹ کیا ہے'' میں لکھا ہے

''سانیٹ چودہ مصرعوں کی ایک ایسی نظم ہے جس میں ایک بنیادی جذبہ یا خیال دو ٹکڑوں میں پیش کیا جاتا ہے۔'' [1]

اگر اُردو ادب میں سانیٹ کی روایت کا جائزہ لیا جائے تو حسرت موہانی کی ایک نظم بربطہ سلمٰی مئی ۱۹۰۱ء میں شائع ہوئی جو سانیٹ سے ملتی جلتی نظم ہے اس پر انگریزی اسٹینز افارم کا اثر ہے لیکن اسے نظم اُردو میں سانیٹ کی ابتداء کے طور پر تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ بعد میں اس صنف کو اُردو میں مروج ہونے میں مدد ملی۔ اس بات پر اختلاف رائے ہے کہ اُردو میں سب سے پہلے سانیٹ کس نے لکھا ن۔م۔راشد کی رائے میں عنوان چشتی بھی کہتے ہیں

اُردو میں سب سے پہلے سانیٹ اختر جونا گڑھی نے لکھا تھا'' ن۔م۔راشد کی رائے صحیح ہے اب تک سب سے قدیم سانیٹ اختر جونا گڑھی کا ملا ہے یہ سانیٹ (شہر خموشاں) کے عنوان سے نومبر ۱۹۱۴ء کے الفاظ (لکھنو) میں شائع ہوا تھا جس کو حنیف کیفی بریلوی نے تلاش کر کے شائع کر دیا تھا۔'' [2]

''شہر خموشاں''

کیا ہی یہ شہر خموشاں دل شکن نظارہ ہے
کتنی عبرت خیز ہے اس کی یہ پُرغم خامشی

۱۔ احتشام حسین۔ نگار پاکستان (ماہ نامہ) ۳۶۱
۲۔ عنوان چشتی۔ ص ۴۶

ایک حسرت سی برستی ہے دم نظارگی
دیکھو کہ جس کو دل مضطر بھی پارہ پارہ ہے
خاک کے تودے پڑے ہیں جابجا کس شان سے
کوئی تو قبر شکستہ ہے کوئی اجڑی ہوئی
سبزہ خود روکہیں ہے اور کہیں کائی جمی ہوئی
ہیں پڑے سنگ لحد بھی قالب بے جان سے
ہو کے بے پروا ہر ایک رنج و مصیبت سے یہاں
سو رہا ہے فکرِ عیش و شادمانی چھوڑ کر
سبزہ ان کی قبر پر ہے لہلہاتا سوگوار
صرف ایک شبنم بہاتی ان پہ ہے اشک بار
آہ کیسی بے کسی ہے خفگان خاک پر
ہے عجب شہرِ خموشاں کا بھی اک اجڑا دیار[1]

اختر جونا گڑھی کے بعد ن۔م۔راشد کا سانیٹ بعنوان ''زندگی'' شائع ہوا اختر شیرانی نے بھی سانیٹ لکھے جو کلیاتِ اختر شیرانی میں تیس کی تعداد میں موجود ہیں ۱۹۴۲ء میں وارثی بریلوی کے سانیٹوں کا مجموعہ نغمات کے نام سے شائع ہوا ان کے بعد عزیز تمنائی نے بھی سانیٹ لکھے اُردو میں اس صنف کی پزیرائی ممکن نہ ہو سکی۔ کم سہی سانیٹ کے لئے اُردو شعرائے کرام نے کوشیش ضرور کی ہیں۔

☆ آزاد نظم:

یہ بات تو سبھی تسلیم کرتے ہیں کہ آزاد نظم کا تصور انگریزی کے توسط سے اُردو میں عام ہوا۔ اگر غور کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ فرانس کی ورس لبر انگریزی ادب میں فری ورس اور اُردو میں آزاد نظم کے نام سے پہچانی جاتی ہے۔ جب کبھی روایتی شاعری میں فن کے اصول وضوابط حد سے تجاوز کر جاتے ہیں تو اس کے ردِعمل کے طور پر عروض اور فنی سانچوں میں لچک اور شکست کا عمل

۱۔ میری بہترین نظم مرتبہ محمد حسن عسکری ۱۸۶

شروع ہو جاتا ہے جس کے نتیجہ میں نئی ہیئتیں جنم لیتی ہیں۔ بقول عنوان چشتی

"جب عروضی شاعری کی سخت گیری حد سے تجاوز کر گئی تو ردِّ عمل کے طور پر عروضی اور فنی سانچوں میں لچک اور شکست کا عمل شروع ہوا۔ جس کے نتیجہ میں نئی ہیئتیں وجود میں آئیں۔" [1]

انگریزی ادب کی شاعری میں بحروں اور انکے متعین اصولوں کی پابندی کی جاتی تھی۔ جس میں بحر کے ارکان کی تعداد کو بنیادی اہمیت حاصل تھی۔ لیکن فری ورس نے عروض و قوافی کے تمام اصولوں کو خیر باد کر دیا۔ اور ان کی جگہ جذبہ کے بہاؤ اور دباؤ کے تحت مصرعوں کے چھوٹا یا بڑا ہونے کے اصول بول چال کی زبان کے آہنگ اور جملے کی نثری ترتیب کو اپنا لیا۔ اس طرح آزاد نظم نے روایتی عروض کے اصولوں کو چھوڑ کر لسانیاتی اصولوں کو اپنایا جس میں بول چال کی صوتیاتی خصوصیات کو اہمیت حاصل ہے جن میں آواز کی شدت، وقفہ، آواز کے اتار چڑھاؤ کے تغیرات شامل ہیں جس کی وجہ سے فری ورس (آزاد نظم) کے بے شمار نمونے سامنے آئے۔

بلاشبہ آزاد نظم شعری تجربے کے وفور تازگی اور توانائی کا بے ساختہ اور براہ راست اظہار ہے۔ اس کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ خیال یا جذبہ پر کوئی پابندی عائد نہیں کی جاسکتی شاعر جسطرح چاہے اپنا اظہار کر سکتا ہے۔ جذبہ کی اس خود کاری اور خود تشکیلی کا نام آزاد نظم ہے۔

☆ بقول کلیم الدین احمد

"تجربے کو ایک چشمہ سمجھئے اس چشمہ کا پانی ایک طرح نہیں بہتا کبھی تیزی سے بہتا ہے تو کبھی آہستہ یہ ایسا نرم سیر ہوتا ہے جیسے تصویر آب کبھی ہلکے ہلکے بلبلے بنتے ہیں اور بگڑتے ہیں تو کبھی جھاگ نظر آتی ہے کبھی دھیمی دھیمی سرسراہٹ کی آواز آتی ہے تو کبھی آواز کی لے تیز ہو جاتی ہے آزاد نظم میں تجربے کی ان گنت ہونے والی تبدیلیوں کو دیکھا یا جاسکتا ہے۔ اس میں بنے بنائے سانچے کو توڑ مروڑ کرنا نہیں ہوتا ہے تجربہ کے دباؤ سے سانچہ بدلتا رہتا ہے اور ہلکی سے ہلکی تبدیلی سانچے میں دکھائی دیتی ہے۔" [2]

---

[1] عنوان چشتی۔ اُردو شاعری میں ہیئت کے تجربے ۱۸۸
[2] کلیم الدین احمد۔ رسالہ سویرا، لاہور ۵۰۳

عام طور پر تجربہ جتنا نازک اور نایاب ہوگا آزاد نظم بھی اُس مناسبت سے نازک اور مہین ہوگی۔ اور تجربہ جتنا کھردرا اور تیز ہوگا آزاد نظم کے آہنگ اور زبان میں اُسی طرح کی خصوصیات ہونگی۔ لیکن ایک خاص بات بھی سامنے آتی ہے اُردو میں آزاد نظم بحر سے آزاد تو ہوگئی مگر وزن سے آزاد نہیں ہو سکی۔

اُردو میں جن شعراء نے آزاد نظمیں لکھیں ان میں میراں جی، ن۔ م راشد، تصدق حسین خالد، ڈاکٹر تاثیر، قیوم نظر، مخدوم محی الدین اور اختر الایمان شامل ہیں۔

شاعری میں خیال کی خودکاری اور خود تشکیلی کا دوسرا نام آزاد نظم ہے اور اس خودکاری اور خود تشکیلی سے اعلیٰ درجہ کی آزاد نظم وجود میں آتی ہے مثلاً مخدوم محی الدین کی درج ذیل نظم اندھیرا

اندھیرا

رات کے ہاتھوں میں اک کاسۂ دریوزہ گری
یہ چمکتے ہوئے تارے یہ دمکتا ہوا چاند
بھیک کے نور میں مانگے کے اجالے میں مگن
یہی ملبوس عروسی ہے یہی ان کا کفن
اس اندھیرے میں وہ مرتے ہوئے جسموں کی کراہ
وہ عزازیل کے کتوں کی کمیں گاہ
وہ تہذیب کے زخم
خندقیں
باڑھ کے تار
باڑھ کے تاروں میں الجھے ہوئے انسانوں کے جسم
اور انسانوں کے جسموں پر وہ بیٹھے ہوئے گدھ
وہ تڑختے ہوئے سر
میتیں ہات کٹی پاؤں کٹی
لاش کے ڈھانچے کے اس پار سے اس پار تلک

سرد ہوا

نوحہ و نالہ و فریاد کناں

شب کے سناٹے میں رونے کی صدا

کبھی بچوں کی کبھی ماؤں کی

چاند کے تاروں کے ماتم صدا

رات کے ماتھے پہ آزردہ ستاروں کا ہجوم

صرف خورشید درخشاں کے نکلنے تک ہے

رات کے پاس اندھیرے کے سوا کچھ بھی نہیں

رات کے پاس اندھیرے کے سوا کچھ بھی نہیں [۱]

اُردو کی آزاد نظموں میں تصدق حسین خالد کی کتبہ ایک شام محمد دین تاثر کی 'سائے' ن،م۔راشد کی 'رقص' سباویراں، فیض احمد فیض کی 'ایک منظر' میراں جی کی 'سمندر کا بلاوا' مخدوم محی الدین کی 'اندھیرا'، دھنک، علی سردار جعفری کی 'میرا سفر' اختر الایمان کی 'بادید' سلیمان اریب کی تسکین انا عزیز قیسی، 'زہریلے' وغیرہ کامیاب آزاد نظمیں ہیں۔ یہ فہرست مکمل نہیں بلکہ اور بھی کامیاب نظموں کا اضافہ کیا جاسکتا ہے۔

☆ نظم معریٰ

جدید نظم نگاری میں نظم معریٰ کی اپنی علحیدہ پہچان ہے آزاد نظم کی طرح اس دور میں نظم معریٰ کو سمت و رفتار دینے میں حلقہ اربابِ ذوق کا بڑا ہاتھ ہے بلکہ یہ کہا جائے تو بے جانہ ہوگا کہ اُسی کے زیر سایہ سمت و رفتار دینے میں حلقہ اربابِ ذوق کا بڑا ہاتھ ہے بلکہ یہ کہا جائے تو بے جانہ ہوگا کہ اُسی کے زیر سایہ نظم معریٰ پروان چڑھی اور اپنے لئے مقام واستحکام حاصل کیا۔ کہا جاتا ہے کہ پابند اور آزاد نظم کی درمیانی کڑی نظم معریٰ ہے اس ضمن میں مسعود احمد قریشی نے پابند نظم اور آزاد نظم کی درمیانی ارتقائی کڑی یعنی نظم معریٰ کے رواج سے متعلق چند دلیلیں پیش کی ہیں۔

"پہلی یہ کہ ارتقائی عمل کا یہی تقاضہ ہے ہم اس درمیانی ارتقائی کڑی کو نظر انداز

۱۔ مخدوم پانچواں مینار۔ مرتبہ امیر عارفی ۱۵۲

کر کے پابند نظم سے آزاد نظم تک چھلانگ نہیں لگا سکتے۔ نظم معریٰ کی صورت میں ہمارے نئے ادب کا رشتہ پرانے ادب سے بہت حد تک قائم رہ سکتا ہے اور اس کا ٹوٹنا بھی مفید نہیں۔ دوسرے یہ کہ ہمارے مخاطب سے میری یہ مراد عوام کی اکثریت سے ہے ابھی ذہنی طور پر اس کے لئے تیار نہیں۔ ہمیں انہیں نئے راستوں سے ہولے ہولے مانوس کرنا ہے اور سب سے مانوس کرنا ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ جب ہم اپنا مقصد بغیر خاص وقت کے نظم معریٰ کے ذریعہ پورا کر سکتے ہیں تو اُسے چھوڑنے کا مطلب؟ آزاد نظم اور نظم معریٰ میں یہی فرق ہے نہ کہ ایک میں مصرعوں کے ارمان کی تعداد شروع سے آخر تک ایک جیسی ہوتی ہے اور دوسری میں اُسے کم و بیش کیا جا سکتا ہے۔'' [1]

نظم معریٰ میں اسلوب اور آہنگ کو اہم گردانا جاتا ہے مصرعوں میں تسلسل کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ نظم کے باطنی تسلسل اور ارتقاء کو خارجی طور پر مصرعوں کے باہمی ربط اور پیش قدمی کے ذریعہ ظاہر کیا جاتا ہے۔ بحروں کے استعمال کے سلسلے میں بھی نظم کے مزاج کو پیش نظر رکھا جاتا ہے۔ عام طور پر ایسی بحریں منتخب کی جاتی ہیں جن میں متحرک توانائی روانی و بلند آہنگی پائی جاتی ہے۔ ان تمام عوامل نے نظم معریٰ کو متحرک قوت بنکر ابھرنے میں مدد کی ہے۔

تصدق حُسین کی چند معریٰ نظمیں ذیل میں پیش ہیں۔
جن میں رمزیہ، محاکاتی انداز، روانی، تسلسل، اور ایجاز و اختصار موجود ہے۔

رات کا روئے ارض پر ہے فشار
انجمی جھلکیاں پُر افشاں ہیں
وسعتِ کائنات میں تا دور
صد جہاں جلوہ مستِ رعنائی
خاکدانِ حیات، تیرہ و تار
تہہ بہ تہہ ظلمتیں افق بکنار

ا۔ مسعود احمد قریشی۔ ادبی دنیا۔ نظم معریٰ ۱۹۳۱ء

وادیاں، کوہسار، لیل و نہار
وسعت چرخ کی فضاؤں میں
گرم رفتار خندہ زن تارے
پستی خاک محبس انساں!
دل فدائے جہاں بے تابی
توڑے گا طلسم بود و نبود! [1]

(سونے سے پہلے)

اس طرح ضیاء جالندھری کی نظم
تنہائی شکستہ پر سمیٹے
آکاش کی وسعتوں پر حیراں
حسرت سے خلا میں تک رہی ہے
یادوں کے سلگتے ابر پارے
افسردہ دھوئیں میں ڈھل چکے ہیں
پہنائے خیال کے دھندلکے
اب تیرو تار ہو گئے ہیں
آنسو بھی نہیں کہ رو سکوں میں
یہ موت ہے زندگی نہیں ہے [2]

نظم معرا کے دیگر شعراء میں محمد دین تاثیر، وشوا متر عادل سلام مچھلی شہری، مسعود احمد قریشی، احسن کلیم وغیرہ شامل ہیں۔ جنہوں نے نظم معرا کو اپنے ذوق کا وسیلہ بنایا اور اُسے جلا بخشی ان کے علاوہ بھی کئی شعرا نے نظم معرا کی تخلیق کی ہے۔ ان میں مزید نام شامل کیئے جا سکتے ہیں۔

۱۔ عنوان چشتی اُردو شاعری میں ہیئت کے تجربے ۲۴۳
۲۔ ضیاء جالندھری ایضاً

☆ ترائیلے:

ترائیلے فرانسیسی شاعری کی ایک مخصوص ہیئت ہے۔یہ آٹھ مصرعوں پر مشتمل نظم ہے۔ ان آٹھ مصروں میں دو قوافی برتے جاتے ہیں اور ان کی ترتیب الف ب الف الف الف ب الف ب ہوتی ہے اس میں پہلا مصرع تین بار اور دوسرا مصرعہ دو بار دہرایا جاتا ہے پہلا اور چوتھا اور ساتواں مصرعہ ایک ہی ہوتا ہے اور دوسرے مصرع کو آٹھواں مصرعہ بنادیا جاتا ہے نریش کمار شاد کا ترائیلے بعنوان ''انتقاماً'' مثال کے طور پر درج کیا جاتا ہے۔

میّسر تو نہیں شادمانی
مگر دل انتقاماً شادماں ہے
بہت پُر درد ہے میری کہانی
میسّر تو نہیں ہے شادمانی
خدائی کیا خدا نامہرباں ہے
میسر تو نہیں ہے شادمانی
مگر دل انتقاماً شادماں ہے!

'انتقاماً'

ترائیلے میں صرف ۵ مصرعوں کو ترتیب دے کر آٹھ بنائے جاتے ہیں۔اس تکنک میں پہلے مصرع کو چوتھے مصرع اور ساتویں مصرع کی جگہ لایا جاتا ہے۔اور دوسرے مصرعہ کو آٹھویں مصرعہ کی جگہ دہرایا جاتا ہے ترائیلے کی کامیابی کا معیار یہ ہے کہ جن مصرعوں کی تکرار ہو وہ فضول معلوم نہ ہوں بلکہ اس جگہ رکھے جانے کے لئے ناگزیز ہوں اور جذبہ وخیال کے زوردباؤ اور معنی کو پوری طرح قارئین تک پہونچاتے ہوں۔ترائیلے کی کامیابی کا انحصار وحدتِ خیال اور مصرعوں کے ربطِ کامل پر ہے۔

اُردو میں ترائیلے کا اولین شاعر عطا محمد خاں شعلہ کو مانا جاتا ہے۔انہوں نے ترائیلے کی ہیئت پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہاہے۔

''تری اولے (ترائیلے) فرانسیسی شاعری کا ایک سانچہ ہے جس میں پانچ مصرعوں کے

الٹ پھیر سے آٹھ مصرعے بنائے جاتے ہیں گویا ایک طرح کا قطعہ ہے۔ اس میں کوئی ایک خیال یا تجربہ لطیف و رنگین سانچے میں ڈھالا جاتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اُردو شاعروں میں اس صنفِ سخن میں میں نے ہی پہلی بار طبع آزمائی۔'' ا؎

عطا محمد خاں کو بعد اس ہئیت پر نریش کمار شاد نے توجہ کی۔ لیکن اس صنف کو اُردو میں قبول عام کا درجہ حاصل نہ ہو سکا شائد یہ صنف بہ اعتبار ہئیت اور عروض اور مقفیٰ اصولوں کی پابند ہونے کی وجہ سے عوامی سطح پر قبول نہیں کی گئی۔

☆ جاپانی ہئیتیں یا قسمیں:

دوسری جنگ عظیم کے بعد یوروپ کے شاعروں نے جاپانی اصنافِ ادب کو اپنی زبانوں میں منتقل کرنے کی کوشش کی اس کوشش میں جاپانی اور چینی زبان کے تراجم کو دخل تھا مگر یہ کوشش سود مند ثابت نہ ہو سکی۔

جاپانی اصناف سخن مخصوص قسم کا تہذیبی پس منظر، فطرت اور مظاہر فطرت کا حسن رکھتی ہیں اور ہئیت کے نقطہ نظر سے آہنگ اور ارکان کا جو نظام ہے وہ انگریزی اور اُردو دونوں زبانوں کے اصول ارکان و آہنگ سے بالکل مختلف ہے اُردو میں دوسری جنگ عظیم کے بعد چینی اور جاپانی نظموں اور ہیئتوں کی طرف توجہ کی گئی۔ چنانچہ عبدالرحمٰن بجنوری نے جاپانی سے ترجمہ کر کے ایک نظم 'یادگل' شائع کی جو نیرنگِ خیال عید نمبر میں شائع ہوئی جو درج ذیل ہے۔

وہ گالوں پہ زردی کی جوں زعفران
پڑی تھیں جہاں اور تہاں پتیاں
اڑی ایک اتنے میں سوئے یہاں
دیا اپنی بانہوں کو گردن میں ڈال
وہ پتی نہ تھی بلکہ تھی تیتری
تصور میں تھی گل کا منہ چومتی ۲؎

ا۔ بحوالہ عنوان چشتی۔ اُردو شاعری میں ہئیت کے تجربے ۲۳۸

۲۔ عطا محمد خاں شعلہ۔ ماہنامہ شاعر نومبر ۱۹۶۶ء ۳۵

یہ بات قابلِ غور ہے کہ ہمارے ادب میں جاپانی اور چینی اصناف، سخن کا محض عکس آیا ہے جو اصلیت سے کافی دور ہے لیکن کچھ اصناف شاعری جاپانی سے اُردو میں آئی ہیں۔اس لئے خاص جاپانی اصناف کا خاکہ دیا جائے تو مناسب رہے گا۔اس خیال سے ہی درج ذیل جاپانی اصنافِ ادب کا ذکر کیا جارہا ہے۔

کیونکہ جاپانی شاعری کی وضع قطع اور ہیئت اُردو شاعری میں بالکل مختلف ہے۔اس میں قافیہ ہوتا ہے نہ بحر ہاں مگر آہنگ ضرور ہوتا ہے۔یہ آہنگ اُردو کے آہنگ سے مختلف اور پیچیدہ ہے جاپانی شاعر اپنی نظم کے ہر مصرعہ کو دو حصّوں میں تقسیم کرتا ہے یہ مصرعے پانچ تا سات رکن کے ہوتے ہیں جس میں ہر مصرع کا جز ۲۔۴۔۳۔۲۔۳ پر مشتمل ہوتا ہے۔ارکان کی مخصوص تعداد اور ترتیب اس کو پُر آہنگ بنا دیتی ہے۔

جاپانی شاعری کی اہم ہیئتیں یا قسمیں درج ذیل ہیں۔

۱) کٹاوٹا:۔

یہہ تین مصرعوں کی نظم ہوتی ہے پہلے مصرع میں پانچ اور دوسرے تیسرے مصرع میں سات سات ارکان ہوتے ہیں۔

۲) سیڈوکا:۔

یہہ چھ مصرعے کی نظم ہے پہلا اور چوتھا مصرع پانچ پانچ رکن کا اور دوسرا تیسرا اور پانچواں اور چھٹا مصرع سات سات ارکان پر مشتمل ہوتے ہیں۔

۳) بسّوسیکیکا:۔

یہ چھ مصرعوں کی ہیئت ہوتی ہے۔پہلا اور تیسرا مصرعہ پانچ پانچ رکن کا اور دوسرا چوتھا اور پانچواں اور چھٹا مصرع سات سات ارکان کا ہوتا ہے۔

۴) چوکا:۔

اِس کا دوسرا نام 'ناگا اوٹا' بھی ہے اس میں پہلا مصرعہ پانچ ارکان کا ہوتا ہے اور دوسرا سات رکن کا اس میں مصرعوں کی تعداد مقرر نہیں ہیں۔ جاپانی طویل ترین چوکا ۱۴۹ مصرعوں کا ہے چوکا میں ایک اضافی مصرع آخر میں ہوتا ہے جو سات رکن کا ہوتا ہے

۵) ٹنکا:

یہ پانچ مصرعوں والی نظم ہے۔ پہلا مصرعہ اور تیسرا مصرعہ پانچ پانچ رکن کا اور دوسرا چوتھا و پانچواں مصرع سات سات رکن کا ہوتا ہے۔ فضل حق قریشی نے جاپانی ٹنکا کا ایک ترجمہ بھی کیا ہے جو عنوان چشتی کی کتاب 'اُردو شاعری میں ہیئت کے تجربے میں درج ہے۔

ایک شئے جو پژمردہ ہو جاتی ہے
کسی بیرونی علامت کے بغیر
ایک پھول ہے
انسان کے دل کا
اس دنیا میں [1]

۶) امایو:

اس نظم میں آٹھ مصرعے ہوتے ہیں اور دو مصرعوں کے چار حصے ہوتے ہیں۔ جو بالترتیب ۷ اور ۵۔ ۷ اور ۵۔ ۷، ۷۔ ۵ اور ۵ کے ہوتے ہیں۔

۷) ہائیکو:

جاپانی ادب کی مقبول صنف سخن ہے جو جاپانی تہذیب اور روزمرہ کی زندگی کا ایک لازمی جز بن گئی ہے۔ جاپان میں ہر بڑے شہر میں ہائیکو کلب موجود ہیں۔ جو اپنی فنی ترقی کی

---

[1] عنوان چشتی اُردو شاعری ہیئت کے تجربے ۲۴۰

نشاندہی اپنے سہ ماہی رسالوں کے ذریعہ کرتے ہیں۔ ہائیکو کی خارجی ہیئت آسان بھی ہے اور خوبصورت بھی۔ یہ سترا سلیبل (ارکان) پر مشتمل سہ سطری نظم ہے۔ جس میں ارکان کی تعداد بالترتیب ۵۔۷۔۵ ہوتی ہے ہائیکو کی داخلی ہیئت کے تعلق سے یہ بات عرض ہے کہ ہائیکو ایک مکمل تخلیق نہیں تخلیق کا ادھا عمل قاری کو مکمل کرنا پڑتا ہے۔ اور جو قاری ہائیکو کی خالی جگہ کو پُر نہیں کر پاتا۔ وہ ہائیکو کی تہہ تک نہیں پہنچ پاتا۔ ہائیکو کے موضوعات فطرت، موسم مناظر، نیا سال، فکر و خیال وغیرہ پر مشتمل ہوتے ہیں۔ اس کی ٹکنک بہت اہم ہے ہائیکو میں کوئی ایک لفظ مرکزی اور بنیادی ہوتا ہے جو ذہن کو معنی کے تمام امکانات کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ ہائیکو میں علامت اور پیکر تراشی کے ذریعہ بدھ تہذیب اور مظاہر فطرت کو بیان کیا جاتا ہے۔ یہ خالص غنائی اور جمالیاتی شاعری ہے۔ اُردو زبان میں ڈاکٹر کرامت نے اس طرح تخلیق کیا ہے۔

من میں ترا غم

کڑی روح اُداس

اور آنکھیں پر نم![1]

اسی طرح فضل حق قریشی نے جاپانی ہائیکو کا ترجمہ کچھ اس طرح کیا ہے۔

چاول کے اک پودے کی بالی جھک گئی بوجھ سے کیونکہ ایک مکڑا اس پر آبیٹھا[2]

اس طرح تمنائی نے بھی یہہ دنیا کے عنوان سے تین مصرعوں کی ہیئت کا ترجمہ کیا

یہ دنیا شبنم کے قطرہ جیسی ہے

بالکل شبنم کے قطرہ جیسی

پھر بھی کوئی حرج نہیں[3]

عالمی سطح کے شعر و ادب کی ہیئتوں کو اُردو ادب نے قبول کیا اُردو شاعری میں نئے شعور کے ساتھ مشرق و مغرب کی نظموں کے ہیئتی رجحان کو فروغ حاصل ہوا لیکن جاپانی ہیئتیں اُردو کے ادبی مزاج و میلان میں جگہ حاصل نہ کرسکیں اس کی سب سے بڑی وجہ یہی رہی کہ اُردو زبان کے صوتی مزاج کے جاپانی شعری اصناف ہم آہنگ نہیں ہیں۔

۱۔ عنوان چشتی۔ اُردو شاعری میں ہیئت کے تجربے ۲۴۳ ۲۔ ایضاً

۳۔ عنوان چشتی اُردو شاعری میں ہیئت کے تجربے ۲۴۳

۸) ماہیئے :۔

تین مصرعوں میں ایک بات پیش کرنے کے لئے اُردو ادب میں کئی اصناف شاعری موجود ہیں۔ مثلاً ثلاثی ہائیکو ماہیئے وغیرہ ماہیئے تین مصرعوں کی ایک مختصر نظم ہے۔ جس کے تینوں مصرعوں کی داخلی شکل ایک جیسی نہیں۔ ماہیا کے لئے اس کے آہنگ کے مطابق بحر ہزج کا انتخاب کیا جاسکتا ہے۔

ماہیا دراصل پنجابی لوک گیتوں کی ایک معروف صنف شاعری ہے۔ جو اپنے ماحول اور علاقے میں مقامی زبان میں آج بھی رائج ہے اُردو زبان میں یہ صنفِ شاعری فلموں کے ذریعہ متعارف ہوئی۔ اس صنف میں سب سے پہلے ہمت رائے شرما نے قلم اٹھایا ان کے بعد قمر جلال آبادی، چراغ حسن حسرت، ساحر لدھیانوی، نقش لائل پوری اور قتیل شفائی نے بھی ماہیئے لکھے۔ ماہیئے کی مقبولیت کا اسی سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ماہیا پر مضمون لکھنے والوں کی کافی تعداد موجود ہے کئی رسالوں نے ماہیا نمبر بھی شائع کئے ہیں۔ کچھ ماہیئے درج ذیل ہیں۔

اسباق ملا مجھ کو
موت سے تھا۔
مشتاق ملا مجھ کو (صابر آفاقی۔ اسباق پونہ ۲۱)

جھوٹے افسانے میں
بے درد زمانے میں (عارف فرہاد نیرنگ خیال راولپنڈی ص ۳۷)

دو پھول گلاب کے ہیں
بھنگڑا اور ماہیا
تحفے پنجاب کے ہیں (ہمت رائے شرما)

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کی مرتب کردہ کتاب رم جھم رم جھم" پر تبصرے میں فاضل مبصر محمد حسن نے ماہیوں کا تعلق پنجاب سے ہونے کی تصدیق کی ہے لکھتے ہیں کی ماہیا پنجابی عوامی شاعری کی مقبول ترین صنف ہے۔ ماہیا تین مصرعوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ جسکے پہلے اور تیسرے مصرعوں کا وزن فعلن فعلن فع ہوتا ہے۔ بحر حال اُردو نظم نگاری کی قسموں میں ماہیئے کا شمار کیا جاسکتا ہے۔

۹) دوہا:

دوہا ہندی زبان کی مقبول صنفِ شاعری ہے اُردو شاعری میں ہندی کے توسط سے رواج پائی دوہے میں دو ہی سطریں ہوتی ہیں۔ ہندی میں دوہوں کو تین ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے۔

۱) دورِ شجاعت

۲) دورِ پرستش اور دورِ موعظت

۳) دورِ جدید

دورِ شجاعت سے قبل عوامی دوہے رائج تھے جن کے موضوع عشق مجازی اور عشق حقیقی تھے کہا جاتا ہے کہ بدھ بھکشوؤں اور جین منیوں نے جو تبلغ مذہب کے لئے کتابیں لکھیں وہ دوہوں میں ہیں موضوع کے اعتبار سے ہر دور میں ہر رنگ میں دوہے لکھے گئے لیکن شاذ و نادر ہی حقیقت و مجاز کے حدود سے باہر قدم رکھے ہوں۔

دوہا جذبات کے دو میدانوں میں ہی اپنی شہسواری دکھاتا ہے۔

مثلاً سیاست کے دوہرے جیوں تاوک کے تیر
دیکھت کے چھوٹے لگیں گھاؤ کریں گھمبیر

پرستش و موعظت کی نمائندگی کرنے والے دوہے کبیر اور میرا بائی نے لکھے ہیں عبدالرحمٰن خان خاناں کی رحمین شتک میں بھی دوہے مل جاتے ہیں۔ اُردو میں دوہے کا چلن عام نہیں لیکن ہندی آمیز الفاظ کے ساتھ ندا فاضلی کے پاس دوہوں کا سرمایہ ملتا ہے۔ مجموعی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ جدید اُردو نظم میں کئی طرح کی قسمیں بلحاظ ہئیت اور موضوع رائج ہیں جنھیں مختلف ناموں سے تخلیق کیا گیا ہے۔

☆ گیت

اُردو نظم نگاری میں گیتوں کی اپنی اہمیت ہے جس سے انکار ناممکن ہے کیونکہ یہ جامع کیفیات و تاثرات کے حامل اور پوری طرح احساسات و جذبات پر مبنی ہوتے ہیں۔ وہ آفاقی تاثر

اور وہ مجلسی اور تہذیبی زندگی کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ کسی ملک کے گیتوں میں مختلف زبانوں کی دھڑکنیں سنائی دیتی ہیں اور یہی گیت کبھی کبھی انقلاب کے نقیب بھی بن جاتے ہیں۔

دراصل گیت جذبات واحساسات کی منہ بولتی تصویریں ہوتی ہیں۔ ان تصویروں کے رنگ وروپ بنتے بگڑتے رہتے ہیں لیکن ان کی باطنی کیفیت ہمیشہ مستقل اور پائدار رہتی ہے۔ اچھے گیت دل ودماغ پر براہِ راست اثر انداز ہوتے ہیں۔ احساسات کو کیف وانبساط بخشتے ہیں عوام کے مزاج اور اوصاف کی تعمیر میں معاون ومددگار ثابت ہوتے ہیں ماضی کے اقدار کو محفوظ رکھتے ہیں۔ ساتھ ہی ورثہ کا تحفظ کرتے ہوئے اس کے امین بھی بن جاتے ہیں۔ گیت کی تعریف بسم اللہ نیاز احمد نے کچھ اس طرح کی ہے

> ''گیت اُردو شاعری کی ایک ایسی صنف ہے جن میں داخلیت موسقیت عروضی قیود سے زبان کی سادگی، طرزِ ادا اور موضوعات کا تنوع پایا جاتا ہے۔'' [۱]

گیت کو زیادہ تر نسوانی خواہشات اور تمناؤں اور آرزوؤں کی شاعری کہا جاتا ہے کیونکہ گیت میں عورت اپنے محبوب کو خوابوں کی دنیا میں دیکھتی ہے اور اس کا انتظار کرتی ہے اور اس کا اظہار بھی کرتی ہے محبوب کی جدائی اور اپنی تنہائی کا بیان گیت کی خصوصیت ہے۔

گیت کی ابتداء اور ان کا ارتقاء انسانی تہذیب وتمدن کی تاریخ کا ایک اہم باب ہے۔ انسان فطری طور پر خوشی اور غم کا اظہار برملا کرتا ہے۔ اس کی فطرت میں یہ بات شامل ہے کہ وہ خوشی کے وقت جھومتا ناچتا اور گاتا ہے۔ اسی طرح غم کے دوران وہ چیختا چلاتا اور آہیں بھرتا ہے۔ زبان اُس کے انہی جذبات واحساسات کے اظہار کا ذریعہ ہے کہا جاتا ہے کہ انہی جذبات کا بے ساختہ اظہار آواز کے سانچوں میں ڈھل کر گلے سے موسیقی کی شکل میں نکلا اور فضاؤں میں گونجنے لگا اور معمولی اور سیدھے سادھے الفاظ اور عبارت میں موزونیت کا جامعہ پہن کر گیت کی شکل اختیار کر لی۔ اور دھیرے دھیرے یہی روایت گیت کہلائی۔ بقول بسم اللہ نیاز احمد

> ''ہر ملک اور ہر زبان میں ادب کی ابتداء شاعری سے ہوئی یا اگر یوں کہا جائے کہ ہر ادب کی ابتداء گیتوں سے ہی ہوئی تو زیادہ صحیح ہوگا۔'' [۲]

۱۔ بسم اللہ نیاز احمد اُردو گیت ص ۷۵

۲۔ بسم اللہ نیاز احمد۔ اُردو گیت ص ۲۷

گیتوں کی دنیا رنگا رنگ ہوتی ہے۔ یہ مختلف انداز کے ہوتے ہیں۔ مختلف طریقوں سے گائے جاتے ہیں اور ع مختلف نوعیت اختیار بھی کر لیتے ہیں۔ ان کی کئی قسمیں ہیں لوک گیتوں کے علاوہ موسمی گیت، تہواروں تقریبوں کے گیت، شادی بیاہ کی رسموں کے گیت، سہاگ کے گیت، بابل کے گیت وغیرہ۔ لیکن اُردو ادب میں گیتوں سے ہمیشہ ہی بے اعتنائی ہی برتی گئی ہے۔ اسی لئے شاید اُردو گیت کی اپنی کوئی تاریخ نہیں بن پائی۔

اُردو گیت سے متعلق جب غور کیا جاتا ہے تو امیر خسرو کی رخصتی ذہن میں آجاتی ہے

کا ہے کو بیاہی بدیس رے لاکھی بابل میرے
ہم تورے بابل ،تیرے کھونٹے کی گیاں
جدھر چاہے دے ہانک رے لاکھی بابل میرے [1]

اس کے بعد دوسرے شعراء نے بھی اُردو گیت تخلیق کئے شعرائے دکن میں ابراہیم عادل شاہ ثانی نے اُردو گیت اور دوہے لکھے ہیں۔ ان کی مشہور تصنیف کتاب ''نورس'' ہے لیکن اُردو میں گیتوں کے آغاز کا سہرا عظمت اللہ خان کے سر جاتا ہے۔ انہوں نے ہندی بحروں میں نظم نما گیت لکھے۔ ان کے گیتوں کا مجموعہ ''سریلے بول'' کافی مشہور ہے۔ انہوں نے عورت کے عشقیہ جزئیات کو منظوم کیا ہے۔ اور اظہارِ عشق بھی عورت کی طرف سے بتایا ہے۔ اور ہر جگہ ہندوستانی فضاء ملحوظ رکھی ہے۔ مثلاً

مجھے پیت کا یاں کوئی پھل نہ ملا
مرے جی کو یہ آگ لگا سی گئی
مجھے عیش یاں کوئی پل نہ ملا
مرے تن کو یہ آگ جلا سی گئی [2]

۱۴ بند پر مشتمل اس گیت میں ایک عورت کے جذبات کی سچی تصور کشی کی گئی ہے۔

عظمت اللہ خاں کے بعد پنڈت اندر جیت شرما، سید مقبول حسین احمد پوری، حامد اللہ افسر، میرٹھی، حفیظ جالندھری، اختر شیرانی، وغیرہ بھی اردو گیت کیلئے راہ ہموار کئے۔

۱۔ بحوالہ راشٹریہ سہارا ادب نمبر مختار ٹونکی۔ اُردو شاعری میں گیت کی صنف ص ۴۸

۲۔ بحوالہ راشٹریہ سہارا ادب نمبر مختار ٹونکی اُردو شاعری میں گیت کی صنف ۴۹

مقبول حسین احمد پوری کا یہ گیت بطور مثال ملاحظہ ہو کیجیے۔

کالے کالے بادل آئے چھائے چاریوں اور
سکھی رے چھائے چاریوں اور
ہوا چلے اور بوند ابرس اور بن میں ناچے مور
سکھی رے بن میں ناچے مور
چھائی گھٹا گھن گور سکھی ری چھائی گھٹا گھنگور
اندر لوک میں باجا باجے ہوا مچاوے شور
سکھی رے ہوا مچاوے شور
کالی کالی رات ڈراوے جیا گھبرائے مور
سکھی رے جیا گھبرائے مور
چھائی گھٹا گھنگور سکھی رے چھائی گھٹا گھنگور[1]

گیتوں کی قابلِ ذکر دُنیا میں اختر شیرانی کا کارنامہ بھی قابلِ ذکر ہے ان کا گیت جس میں انہوں نے ہندی کے نرم و شیریں الفاظ کے حوالے سے انتظار کی کیفیت بیان کی ہے۔

اب بھی نہ آئے من کے چین
بیت چلی ہے آدھی رین
نا کوئی ساتھی نا کوئی ساجن نا کوئی میرے پاس سہیلی
برہ کی لمبی رات گذاروں ڈر کی ماری کیسی
نیر بہائے کب تک نین
بیت چلی ہے آدھی رین
نظریں جمی ہے چوکھٹ پر اور کان لگے ہیں آہٹ پر
آنکھوں سے ننھے آنسو بہتے ہیں اک اک کروٹ پر

۱۔ایضاً

کرتی ہوں چپکے چپکے بین

اب بھی نہ آئے مورے چین [1]

گیتوں کی دنیا میں اس وقت اور رنگینی اور رعنائی آئی جب میراں جی مسعود حسین خان، وامق جونپوری نے اس صنف کو اپنی تخلیقات کا ذریعہ بنایا۔ گیتوں کو ہردلعزیز بنانے میں فلمی شعراء نے بھی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ جن میں ساحرلدھیانوی، شکیل بدایونی، مجروح سلطان پوری، راجہ مہدی علی خان، کیف بھوپالی، بیکل اتساہی اور زبیر رضوی وغیرہ شامل ہیں۔

☆ پیروڈی:

پیروڑی دراصل طنز و مزاح کی ایک قسم ہے۔ یہ صنف اُردو میں براہِ راست انگریزی ادب سے آئی۔ ویسے تو انشاء اور مصحفی کی معاصرنہ چشمکوں ہی سے اس صنف کے آثار اُردو شاعری میں ملتے ہیں جو منتشر حالت میں نظر آتے ہیں۔

صحیح معنوں میں پیروڑی دورِ حاضر کی پیداوار ہے۔

پیروڑی یونانی لفظ 'پیروڑیا' سے مشتق ہے۔ جس کے معنی ہیں 'جوابی نغمہ' صحیح معنوں میں دیکھا جائے تو پیروڑی مضحکہ خیز تصرف کا نام ہے۔ جس میں اصل تخلیق کے الفاظ و خیالات اس حد تک بدل دیئے جاتے ہیں کہ ان میں مزاحیہ تاثر پیدا ہو جائے ڈاکٹر وزیر آغا نے پیروڑی کی تعریف اس طرح کی ہے

> ''پیروڑی یا تحریف کسی تصنیف یا کلام کی ایک ایسی لفظی نقالی کا نام ہے جس سے اس تصنیف یا کلام کی تضحیک ہو سکے۔ اپنے عروج پر اس کا منتہا ادبی یا نظریاتی خامیوں کو منظرِ عام پر لانا ہوتا ہے۔'' [2]

رشید احمد صدیقی نے پیروڑی کی تعریف کچھ اس طرح کی ہے۔

> ''پیروڑی میں جدت اور جودت کا ہونا ضروری ہے اصل کی نقل اس طور پر کرنا یا اس میں ظرافت کا پیوند لگانا تھوڑی دیر کے لئے نقاب یا پیوند کی تفریحی حیثیت

ا۔ بحوالہ راشٹریہ سہارا ادب نمبر مختار ٹونکی اُردو شاعری میں گیت کی صنف ۴۹

۲۔ اُردو ادب میں طنز و مزاح۔ ڈاکٹر وزیر آغا ۵۲

اصل کی سنجیدہ حیثیت کو دبا دے پیروڈی کا ہنر ہے۔'' [1]

دونوں حضرات کے نزدیک کسی تصنیف کی نقل جس کا نمونہ اصل سے ملتا جلتا ہو اور الفاظ میں ردّ و بدل کی جائے اور جس سے ہماری حس مزاح کو تقویت ملے پیروڈی ہے۔

پیروڈی کا فن بہت نازک فن ہے اس کی مثال پُل صراط پر چل رہے شخص سے دی جاسکتی ہے کہ اگر ذرا قدم ڈگمگایا تو جہنم کی آگ میں سما جائے گا۔ اور توازن رہا تو جنت اس کی منتظر ہوگی۔

بقول رشید احمد صدیقی

''پیروڈی کا فن ذہانت وذکاوت کا طلب گار ہے'' [2]

پیروڈی نگار اصل مصنف یا شاعر کے اسلوب بیان اُس کے تیور، اس کے اندازِ فکر کو مزاحیہ شکل میں اس طرح پیش کرتا ہے کہ اصل تخلیق کے سنجیدہ خیالات یکسر بدل جاتے ہیں۔ اور ان کی جگہ مزاح لے لیتا ہے۔ مگر پیروڈی محض ہسنے ہنسانے کی چیز نہیں پیروڈی نگار کو موزوں طبع ہونے کے علاوہ لطافت پسند اور سنجیدہ مزاج ہونا چاہیے۔

اُردو ادب میں پیروڈی کے ابتدائی نمونے ان شعراء کرام کے یہاں مل جاتے ہیں۔ جن میں معاصرانہ چشمکیں ہوتی رہتی تھیں۔ اور ایکدوسرے کے کلام میں نقائص اور عیوب کو نکال کر کبھی کبھی ایک دوسرے کی زمینوں میں شعر کہہ کر ایکدوسرے کا مذاق اڑایا جاتا تھا۔ ان میں انشاء اور مصحفی کی چشمکیں عام ہیں۔

اودھ پنچ کا دور اُردو پیروڈی کے لئے نہایت سازگار رہا اُردو شاعری میں پیروڈی کے نمونے یہیں سے ملتے ہیں یہ بات ذہن نشین رہنا چاہیئے کہ جس ادب پارے کی پیروڈی کی جائے تو عوام میں بہت مقبول ہو اور شاعر بھی مقبولیت کے اعلیٰ مقام پر فائز ہو۔

اقبال کی نظم ''ہمدردی'' کی پیروڈی عاشق محمد غوری نے کچھ اس طرح کی ہے۔

گوشے میں کسی کھنڈر کے تنہا ملاح تھا کوئی اداس بیٹھا
کہتا تھا کہ رات سر پہ آئی جوئیں چننے میں دن گذارا

ا۔ اسکالر پیروڈی نمبر۔ کچھ پیروڈی کے بارے میں رشید احمد صدیقی ۱۰

۲۔ پیروڈی انتخاب ومقدمہ از مظہر احمد ۱۱

ہر چیز پہ چھا گیا اندھیرا	پہنچوں کس طرح اب مکاں تک
اُلّو کوئی پاس ہی سے بولا	سن کے ملاح کی آہ و زاری
احمق ہوں اگر میں تم ہی سا	حاضر ہوں مدد کو جان و دل سے
میں پیش اپنا گھونسلہ کروں گا	کیا غم ہے جورات ہے اندھیری
ایک رات یہیں کرو بیسرا	اللہ نے مجھ کو دی ہے منزل
آتے ہیں جو کام دوسروں کے	اُلّو ہے وہی جہاں میں اچھے

کہا جاسکتا ہے پیروڈی دراصل مزاح کی ایک قسم ہے جسے اصل تصنیف شعروادب میں الفاظ کے ردّوبدل سے تخلیق کیا جاسکتا ہے۔ اوران الفاظ کے ردّبدل سے طنزومزاح ابھر آتا ہے۔

اس صنف میں جن حضرات نے طبع آزمائی کی ہے ان میں کنہیالال کپور، قاضی غلام محمد، عاشق محمد غوری، سیّد محمد جعفری، راجہ مہدی علی خان، صادق مولیٰ، سیّد ضمیر جعفری، دلاورفگار، شہباز امروہی، رضا نقوی واہی، شوکت تھانوی، سلیمان خطیب، طالب خوندیری، شفیق فاطمہ شعریٰ وغیرہ شامل ہیں۔

☆ ثلاثی:

دنیا میں تغیر یا تبدیلی فطری عمل ہے۔ ہر شئے جاندار ہو یا بے جان تبدیلی سے ہمکنار ہوتی رہتی ہے۔ ادب بھی کوئی جامد چیز نہیں۔ وقت اور حالات کے ساتھ ساتھ ادب میں بھی تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں۔ درباروں نے جہاں قصیدے کوعروج بخشا وہیں مذہبی عقائد نے مرثیہ کو پروان چڑھایا۔ اور ساتھ ہی امیروں کی عیش کوشیوں نے غزل کی صنف کو دوام بخشا۔ یعنی ادب میں بھی نئی نئی اصناف وجود میں آتی گئیں۔

اُردوادب کے شعراء نے ہر زمانے میں ادب میں ہیئت کے نئے نئے تجربے کئے۔ ایسے تجربوں نے ثلاثی کو جنم دیا۔ ۱۹۴۰ء کے بعد ثلاثی نے ایک صنف کی حیثیت سے اپنے وجود کو منوایا۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ جدید صنف ہے۔

ثلاثی تین مصرعوں کی ایک نظم ہے۔ جس کا پہلا اور تیسرا مصرع ہم قافیہ ہے اور دوسرا مصرع آزاد۔ تینوں مصرعے ایک بحر کے پابند ہوتے ہیں اور یہ کسی بھی بحر میں لکھی جاسکتی

ہے۔ تین مصرعوں میں شاعر ایک مکمل خیال کو پیش کرتا ہے۔ اور اسی وجہ سے ثلاثی ایک نکتہ کو خوبی کے ساتھ ادا کرنے کے لئے نہایت خوبصورت صنف ثابت ہوئی ہے۔ اور آج ایک مقبول ترین صنف سخن کی حیثیت سے جانی جاتی ہے۔ حمایت علی شاعر کو اس صنف کا موجد مانا جاتا ہے۔ علامہ نیاز فتح پوری نے حمایت علی شاعر کو ایک خط میں لکھا ہے۔

''یہ صنف اس ہیئت کے ساتھ اُردو میں پہلی بار آئی ہے اس لئے آپ ہی سے منسوب ہوگی۔'' [1]

اس سلسلے میں احمد ہمدانی لکھتے ہیں۔

''حمایت نے اصنافِ شاعری کے سلسلے میں ایک صنف ثلاثی کا تجربہ کیا ہے اس لئے یہ تجربہ اس کے باطنی دباؤ کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے یعنی وہ جو کچھ کہنا چاہتا تھا اس کے لئے ایک مناسب صنف درکار تھی جو اس پر اس کے تخلیقی عمل کے دوران منکشف ہوئی جسے اس نے تین مصرعوں کی نظم کی صورت میں پیش کردیا۔ [2]

درج بالا خیالات کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ حمایت علی شاعر اس صنف کے موجد ہیں۔ عقائد۔ مذہبی روایات وغیرہ کو حمایت علی نے اپنی ثلاثی کا موضوع بنایا ہے مثلاً

کوئی تازہ شعر اے ربِّ جلیل
ذہن کے غارِ حرا میں کب سے ہے
فکر محوِ انتظار جبرئیل [3]

ثلاثی کا دوسرا اہم نام قمر اقبال ہیں ان کی ثلاثی پر مشتمل کتاب تتلیاں شائع ہو کر قبولِ عام کا درجہ حاصل کر چکی ہے

روشنی کون کس کو دیتا ہے
شام ہوتی ہے جب تو سورج بھی
اپنی کرنیں سمیٹ لیتا ہے [4]

یا

دو پڑوسی جو ملک ہوتے ہیں

۱۔ مثلث یا ثلاثی مرتبہ راعنا اقبالی ص ۱۰ ۲۔ مطبوعہ ہماری زبان یکم اگست ۱۹۸۶ء
۳۔ حمایت علی شاعر۔ قومی مجاز۔ ص ۱۱۴ ۴۔ قمر اقبال۔ اورنگ آباد ٹائمز حمایت علی شاعر نمبر مورخہ ۲ رجون ۱۹۸۵ء

ان کے بچھڑے ہوئے سبھی رشتے

سرحدوں سے لپٹ کے روتے ہیں

قمر اقبال کے علاوہ شمیم جوہر، عارف خورشید، وحید کلیم وغیرہ نے بھی اس صنف میں طبع آزمائی کی ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ ثلاثی آج کی ایک مقبول صنف ہے۔

☆☆

باب چہارم

اُردو نظم کے موضوعات

کائنات کے گوشے گوشے میں شاعر کے لئے انگنت و بے شمار موضوع بکھرے پڑے ہیں۔ اور ایک حساس ذہن رکھنے والا شخص اُسے اپنی تخلیقات کا موضوع بنا سکتا ہے۔ مناظر قدرت، سمندر کی تڑپتی لہریں، پہاڑوں کی بلندیاں، جنگل کی خوش نمائی، آبشاروں کا گرنا، چمکتی چاندنی، چلچلتی دھوپ، سورج کی تمازت، چاند کی مدھم روشنی اور ہر شئے میں بسی ہوئی زندگی، خدا کی تخلیق کردہ جاندار مخلوق ہاتھی، گھوڑے، اونٹ، گائے، بکریاں، کتا، بلی، طوطا، مینا، چڑیا، چوہے، خرگوش، سانپ بچھو غرض ہر طرف رینگنے والے کیڑے مکوڑوں سے لیکر ہوا میں اڑنے والے پرندے وغیرہ اور پھر ان سب سے بڑھ کر اشرف المخلوقات کہلانے والا انسان جو کئی فطری تقاضوں کے ساتھ فہم وادراک رکھتا ہے۔ ہر انسان اپنے نت نئے مسئلوں سے گھرا ہے۔ ہر انسان کے اپنے عادات و اطوار، اپنا کردار، اپنے جذبات و احساسات اور ان میں پوشیدہ نفسیاتی پیچیدگیاں اس طرح اور نہ جانے کتنے موضوع ہیں جو اعر کی فکر ونظر کو دعوتِ تخلیق دیتے ہیں۔ ہر شاعر کی اپنی علحیدہ نظر ہوتی ہے اس کے سوچنے کا طریقہ مختلف ہوتا ہے اس طرح کائنات کے لامتناہی سلسلے میں بے شمار موضوعات ہیں جو کبھی ختم نہیں ہوتے کبھی ان میں پرانا پن محسوس نہیں ہوتا۔ یا فرسودگی نہیں آتی۔ کہا جا سکتا ہے کہ موضوع کی تلاش کرنے والے کے پاس ایک متجس اور کبھی ایک جگہ نہ رُکنے والی نظر اور کبھی ایک چیز سے مطمئن نہ ہونے والا مضطرب دل ہو تو نظم کے

لئے موضوعات بے شمار ہیں کسی شاعر کے سامنے سے کوئی شئے گذرتی ہے اور وہ شئے جسے خود بخود ذہن میں کوئی نیا موضوع اجاگر کردتی ہے اس کے فکری تخیلی اور جذباتی سرمائے میں گھل مل کر یہ موضوع یا مرکزی خیال ایک نظم کی شکل اختیار کرلیتا ہے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اُردو شاعری کے ایوان میں ہر شاعر کے پاس موضوعات کی کمی نہیں ہے

جدید اُردو نظم کے موضوعات کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اُردو نظم نگاری کی روایت کو توسیع دینے اور ہندوستانی سماجی موضوعات کو اپنی شاعری میں پروان چڑھانے کا کام نظیر اکبرآبادی نے کیا ہے۔ اس لئے نظیر اکبرآبادی کے تذکرے کے بغیر اُردو نظم کی موضوعاتی تشکیل ادھوری رہے گی۔ نظیر اکبرآبادی کی حیثیت صرف ایک شاعر کی نہیں بلکہ سماجی مصلح اور ذہین مفکر کی بھی ہے انھوں نے انسانی زندگی کے تقریباً ہر شعبہ کا مشاہدہ بڑی باریک بینی سے کیا اور کامیاب زندگی گذارنے کا سلیقہ بھی سکھایا ان کی شاعری میں انسان اپنے خدوخال کے ساتھ بہ آسانی دیکھا جاسکتا ہے تاریخی اعتبار سے نظیر اکبرآبادی کے عہد کا جائزہ لیا جائے تو یہ وہ زمانے ہے جب ہندوستان میں سیاسی اعتبار سے انتشار تھا اونچے طبقے کے روبہ زوال ہونے کی چاپ سنائی دے رہی تھی اور حکمراں عیش پرستی کا شکار ہوگئے تھے ڈاکٹر سیّد طلعت حُسین نقوی کے کہنے کے مطابق

> ''اورنگ زیب کے بعد مغلیہ سلطنت کے گیارہ حکمران گذرے۔ جنھوں نے غالباً ایک سو چبیس برس تک حکومت کی یہ کمزور اور عیش پرست حکمرانوں کا دور تھا اس دور میں ملک کا معاشی نظام عدم توجہی کا شکار ہوگیا تھا نتیجہ کے طور پر انتشار بدامنی عام ہوئی۔''

اس پُر آشوب دور میں نظیر اکبرآبادی نے اپنی نظموں کے ذریعے سماجی مسائل اور عام انسان کی خواہشات وفکر کو بیان کیا اپنی شاعری میں ہندوستانی عناصر کو جگہ دی جو ہندوستانی خوصیات کے حامل تھے مضامین کے عنوانات بھی مقامی تجویز کیے۔ ان کے کلام میں مقامی رنگ مکمل طور پر واضح نظر آتا ہے۔

نظیر اکبرآبادی سے پہلے اور خود ان کے عہد میں اُردو شعراء نے عوامی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ لیکن نظیر نے جس شد و مد کے ساتھ عوامی زندگی کی تصویریں اپنی شاعری میں بیان کیں۔ وہ اپنی مثال آپ ہیں اس طرح کی مثالیں اُردو شاعری میں ملنا مشکل ہے نظیر

اکبر آبادی پہلے شاعر ہے۔ جن کا تعلق درباروں یا امیر و امراء کی صحبتوں سے نہیں تھا۔ یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ نظیر سے پہلے اُردو شاعری پر خواص اور تعلیم یافتہ طبقہ کا اثر نمایاں تھا اور ان کا تعلق عام معاملات اور عوامی زندگی سے نہ تھا۔ گویا ادب اور شاعری عوامی زندگی سے غیر مانوس تھے۔
بقول مخمور اکبر آبادی

"کیا یہ طریقہ انسان پر احسان نہیں کہ نظیر نے شعر کی دولت سوسائٹی کے اس طبقہ تک پہنچادی جواب تک ہر اعتبار سے نا اہل سمجھا جاتا تھا اور اس میں سمجھنے اور غور کرنے کی صلاحیت پیدا کردی ۔"[1]

جہاں تک نظم نگاری کا تعلق ہے نظیر اکبر آبادی کی حیثیت اس صنف میں بہت اہم ہے۔ چونکہ اس صنف کے توسط سے نظیر ایک مستقل دور کے بانی قرار دیئے جاتے ہیں ان کی نظموں کے موضوعات بھی عام فہم ہیں۔ اور ہندوستانی سرزمیں کی پہچان ہیں ۔ خاص طور سے ہندوستانی موسم، تہوار لباس، زیور، پھل، پھول یہاں تک کہ جانور، پرندے اور درندے بھی ہندوستانی زمین سے تعلق رکھنے والے ان کی نظموں کے موضوعات قرار پاتے ہیں۔ جس سے یہ ثبوت ملتا ہے کہ نظیر اکبر آبادی خالص ہندوستانی شاعر ہیں۔ جنھیں اپنے وطن کے ذرّے ذرّے سے پیار ہے اور وہ وطن کے علاوہ ہر موضوع کو اپنی شاعری کا وسیلہ بناتے ہیں۔

تہواروں میں ہولی کی بہاریں رنگ افشانی کرتی ہیں ۔ رقص و سرور کا نقشہ ملتا ہے۔ راکھی کے تہوار اور اس کی خصوصیات کا ذکر بھی ان کی نظموں میں موجود ہے۔ ساتھ ہی دیوالی پر بھی ان کی نظم ملتی ہے جو کہ روشنی کا تہوار ہے اس کے علاوہ عام مقامات پر لگائے جانے والے میلے ٹھیلے اور ان کی رونق اہمیت اور سماجی رسومات کی جھلکیاں بھی ان کی نظموں کے موضوعات ہیں۔ ہندو دیوی دیوتاؤں کا تقدس بھی نظر آتا ہے ساتھ ہی قدیم ہندو معاشرت اور رسم و رواج کا ذکر بھی ان کی نظم "کنھیا جی کا جنم" میں ملتا ہے جو ہندو فلسفے اور نجوم سے ان کی واقفیت کا ثبوت ہے عورتوں کے رسم رواج کا سماں بھی فطری انداز میں ان کی نظموں میں نمایاں ہے گھر میں بچہ کی پیدائش کے وقت خواتین کے مشاغل ان کی سرگرمیاں اور خوشیوں کا سماں اس نظم میں جا بجا دکھائی دیتا ہے اتنا ہی نہیں ہندوستان میں چلنے والی آندھی، اندھیرا، چاندنی کے مناظر بھی ان کی نظموں

۱۔ مخمور اکبر آبادی۔ نظیر پر ایک نظر۔ نظیر نامہ مرتبہ شمس الحق عثمانی ص ۴۷

کے موضوعات ہیں۔

صبح کا وقت عبادت کا وقت ہے تسبیح وتقدس کا وقت ہے اس لئے پرندوں کی چہچاہٹ کو وہ وقتِ سحر کی روحیں بتاتے ہیں کوئل، پپیہے، بلبل، فاختہ جیسے پرندوں کی آواز پر وہ جھومتے نظر آتے ہیں۔

موسموں میں سردی، برسات، بسنت، اور اوس وغیرہ کو بھی انھوں نے موضوع بنایا ہے۔ اور ان موسموں کی اہمیت کو بیان کیا ہے۔ کیونکہ انسانی زندگی پر ان موسموں کے اثرات پڑتے ہیں۔ ان کی غذا، رہن سہن، اور طرز معاشرت انہی موسموں کی وجہ سے بدلتے رہتے ہیں۔

نظیر پہلے شاعر ہیں جنہوں نے اپنے عہد میں عوامی زندگی کی جیتی جاگتی تصویر پیش کیں۔ وہ پہلے شاعر ہیں جنہوں نے درباری شان وشوکت کے بجائے ایک عام انسان کی پسند نہ پسند اور معمولی چیزوں کو نظم کا موضوع بنایا جو شاعری صرف امیر وامراء کے ایوانوں کی ترجمانی تھی۔ اُسے عام انسانی جذبات، خواہشات، اور تمناؤں وآرزوؤں کو بیان کرنے کا وسیلہ بنایا۔

بقول مجنوں گورکھپوری

''نظیر ہندوستانی شاعر تھے اور ہندوستان کی جمہوری زندگی کو انہوں نے اپنی شاعری کا موضوع بنایا اور اسالیب اور لب ولہجہ عوام سے ہم سطح رکھا یہاں تک کہ ان کی شاعری کو عامیانہ اور بازاری سمجھا جانے لگا۔ لیکن ان کا نفس اور ان کا ضمیر سماج کا ضمیر تھا۔ جس کو ایسے اعتراضات کی کوئی پرواہ نہیں تھی انہوں نے کہیں کھلے الفاظ میں کہا نہیں ہے مگر ان کا انداز بتاتا ہے کہ وہ شاعری کو جمہوری زندگی کا آئینہ سمجھتے تھے۔''[1]

نظیر اکبر آبادی کی نظموں کا ایک اہم موضوع قومی یکجہتی بھی ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ انسان مل جل کر رہنا پسند کرتا ہے اور سماج میں کئی مذاہب اور عقائد کے لوگ رہتے ہیں ان میں آپسی میل ملاپ ضروری ہے ایک دوسرے کے سماجی اقتصادی، معاشرتی اور تہذیبی بقاء کے لئے آپسی میل ملاپ کو کافی اہمیت حاصل ہے اسی بات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اگر نظیر اکبر آبادی کینظموں کو پرکھا جائے تو یہ بات صاف طور پر نمایاں ہوجاتی ہے کہ انھوں نے قومی یکجہتی کو اپنی نظموں میں کافی اہمیت دی ہے اسی لئے انھوں نے جہاں ہولی، دیوالی، راکھی کے تہواروں کو اپنی

۱۔ مجنوں گورکھپوری۔ نظیر کی شاعری ص ۲۵

نظموں میں جگہ دی وہی عید الفطر، شب برات، بقر عید وغیرہ کو بھی اپنی نظموں کا موضوع بنایا اور ان نظموں کے ذریعے ہندو اور مسلمانوں کی تہذیب و تمدن پر روشنی ڈالی ہے ساتھ ہی یہ بھی بتانے کی کوشش کی ہے کہ تہوار بھائی چارے اور میل ملاپ کا بہترین ذریعہ ہے۔

یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ نظیر اکبر آبادی نے اپنی نظموں کے ذریعے اُردو شاعری کو نئی جہت سے روشناس کرایا اور آگے چل کر اس نوعیت کے موضوعات اُردو نظم کے لئے مشعل راہ بنے۔ اور اُردو نظم نگاری کا کارواں یونہی آگے بڑھتا رہا جب کبھی نظم نگاری کے موضوعات کا ذکر ہوگا سب سے پہلے نظیر اکبر آبادی کے نظموں کے موضوعات قابل اعتبار سمجھے جائینگے اور ان کے تذکرے کے بغیر اُردو نظم نگاری کی روایت اور موضوعات کی اہمیت کو قابل قدر نگاہوں سے نہ دیکھا جائے گا۔

☆ اُردو نظموں میں قدرتی مناظر:

جدید نظم نگاری کے موضوعات میں قدرتی مناظر کی عکاسی کا رجحان سب سے پہلے ملتا ہے ۱۸۵۷ء کے پر آشوب دور کے بعد جب ہم شعر و ادب کے سرمائے پر نظر ڈالتے ہیں تو سوائے غزل کے کوئی اور سرمایہ قابل قدر محسوس نہیں ہوتا۔ غزل کے موضوعات میں نسوانی ناز و ادا اور محبوب کی پیکر تراشی عروج پر نظر آتی ہے لیکن جب تاریخ نے کروٹ بدلی تو حالات بھی بدل گئے حکمرانی چھن گئی تو درباروں سے شعراء کا تعلق منقطع ہوگیا جب حاکم ہی نہ رہے تو بے سر و سامانی کا دور دورہ ہوگا پھر ایک ایسا معاشرہ وجود میں آیا جس میں آہیں، سسکیاں، بے بسی، مایوسی، لاچاری اور نامرادی کے سوا کچھ نہ تھا ایسے ماحول میں نئے مسائل نے سر ابھارا اور شعر و ادب کے لئے نئے راستے بھی وا ہونے لگے۔

ساتھ ہی اُردو شعر و ادب کی دنیا میں انگریزی تعلیم اور انگریزی شعر و ادب کے اثرات بھی مرتب ہونے لگے جس نے اُردو ادب کے دانشور، ادیب و شعراء کو احساس کمتری میں مبتلاء کر دیا جو اپنے ادب کو انگریزی ادب کے مقابلے میں کم تر سمجھنے لگے اسی احساس کی بناء پر اُردو میں نظم نگاری کو فروغ حاصل ہوا یہ بات بھی صحیح ہے کہ نظم نگاری کے لئے جس طرح کا ماحول بنتا گیا اس کا جواز نفسیاتی تھا۔ سماجی، تعلیمی یا سیاسی اعتبار سے اس طرف غور کرنا بھی ضروری ہے بظاہر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ رجحان خالص ادبی تھا بہر حال اُردو میں نظم نگاری کی تحریک چل پڑی اور اس

کے زیرِ اثر اُردو نظم میں مناظرِ قدرت کو موضوع بنایا گیا۔

آزادی سے قبل قدرتی مناظر کی عکاسی کرنے والے اہم شعرا میں محمد حُسین آزاد، الطاف حُسین حالؔی، شبلی نعمانؔی، دُرگا سہائے سرور، برج نارائن چکبست، تلوک چند محروم، سر محمد اقبال، جوش ملیح آبادی وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہے ان شعراء نے اپنی نظموں میں مناظرِ قدرت کو اجاگر کیا اس سلسلے میں خاص طور سے مختلف موسم، صبح و شام اور کل کائنات کے مناظر اور فطرت کے حسین و رنگین نظاروں سے متاثر و مغلوب احساسات و جذبات اور افکار کی عکاسی کی جانے لگی۔

الطاف حُسین حالؔی نے انجمن پنجاب کے زیرِ اہتمام موضوعات پر مشتمل چار مشاعروں میں شرکت کی، اور ''برکھا رُت'' کے ابتدائی بندوں میں گرمی کی شدت کا ذکر بے حد حقیقی انداز میں کیا جیسے کہساروں کا تپنا، جانداروں کا پیاس کے مارے تڑپنا، آبِ دریا کا کھولنا، باغ کا ویران ہو جانا، چھوٹے بچوں اور عام انسانوں کی بے چینی جیسے عوامل کو برسات کے پس منظر میں پیش کیا ہے۔

مثلاً

گرمی سے تڑپ رہے تھے جاندار ۔۔۔ اور دھوپ میں تپ رہے تھے کوہسار
تھیں لومڑیاں زبان نکالے ۔۔۔ اور لو سے ہرن ہوئے تھے کالے
تھے شیر پڑے کچھار میں سُست ۔۔۔ گھڑیال تھے اودبار میں سُست
بچوں کا ہوا تھا حال بے حال ۔۔۔ کملائے ہوئے تھے پھول سے گال
آنکھوں میں تھا انکا پیاس سے دم ۔۔۔ تھے پانی کو دیکھ کرتے سم سم

برسات ہونے سے قبل کا یہ منظر جس میں شدید گرمی پڑتی ہے۔ اس شدید گرمی کو بیان کیا گیا۔ لیکن پھر ماحول بدل جاتا ہے۔ اور کچھ اس طرح کا منظر سامنے آتا ہے۔

برسات کا بج رہا ہے ڈنکا ۔۔۔ اک شور ہے آسماں پہ برپا
ہے ابر کی فوج آگے آگے ۔۔۔ اور پیچھے ہیں دَل کا دَل ہوا کے
گھنگور گھٹائیں چھا رہی ہیں ۔۔۔ جنت کی ہوائیں آرہی ہیں
باغوں نے کیا ہے غسلِ صحت ۔۔۔ کھیتوں کو ملا ہے سبز خلعت
پھولوں سے پٹے ہوئے کہسار ۔۔۔ دولہا بنے ہوئے ہیں اشجار

برکھا رُت

محمد حُسین آزاد نے بھی مناظر قدرت کو اپنی نظموں میں بیان کیا ہے۔ان کی نظم، شب قدر، دراصل مناظر فطرت کی ایک بہترین نظم ہے جس میں مناظرِ فطرت کی حقیقی تصویر کشی ملتی ہے جس میں انہوں نے رات سے متعلق کئی جہتوں کو اس نظم میں سمویا ہے۔رات دراصل مظاہر قدرت کا لازمی جز ہے۔رات مختلف لوگوں کے لئے مختلف طریقے کار کے لئے مفید بھی ہے اور مضر بھی جیسے رات طالب علموں کے لئے کتنی مفید ہے اس بات کو کچھ اس طرح بیان کیا ہے۔

ہیں مدرسے کے طالب علم اپنے حال میں   کل صبح امتحان ہے سو اس خیال میں
مل مل کے یاد کرتے ہیں آپسی رو میں   پڑھتے جدا جدا بھی ہیں کچھ فکر و غور سے
کرلیں جو کچھ کہ کرنا ہے شب درمیان ہے   کل صبح اپنی جان ہے اور امتحان ہے
جی چھوڑ بیٹھے مرد یہ ہمت دور ہے
قسمت تو ہر طرح ہے پئے محنت ضرور ہے

شبِ قدر

اسی طرح رات چوروں کے لئے الگ نوعیت اور اہمیت رکھتی ہے اس کا بیان کچھ اس طرح کیا ہے۔

اے رات تیرے پردہ دامن کی اوٹ میں   سیاہ کار بھی ہے اپنی چوٹ میں
بیٹھا نقب لگائے کسی مکان میں ہے   اور ہاتھ ڈالا اس کے ایں واں
اسباب سب اندھیرے گھر کا ٹٹول کر   ہے چپکے چپکے دیکھ رہا کھول کھول کر
لے جائے گا جو کچھ کہ غرض ہاتھ آئے گا
دیکھو کمایا کس نے ہے اور کون اڑائے گا

(شبِ قدر)

اسی طرح ''صبحِ اُمید'' نظم میں آزاد نے صبح کے منظر کو بہت دلکش انداز میں پیش کیا ہے۔

جب کیا صبح نے روشن فلک مینائی   بسترِ خواب سے میں لے اُٹھا انگڑائی
آنکھ مل کے جو نظر کی سوئے میدانِ جہاں   ذرّہ ذرّہ میں نظر آیا رُخ جانِ جہاں
سبز و شاداب تمام ایک طرف دامنِ کوہ   جس پہ ہے فرش زمین گلشن گردوں کی شکوہ

(صبحِ اُمید)

آزاد کی ایک نظم "ابر کرم" بھی ایک ایسی ہی نظم ہے جس میں مناظر قدرت کی عکاسی ملتی ہے گرمی کا سماں پھر برسات اور گھٹاؤں کا ذکر اور پھر برسات ہوتی ہے تو چاروں طرف شادابی نظر آتی ہے اس کا ذکر کچھ اس طرح کیا ہے۔

بوندوں میں جھومتی وہ درختوں کی ڈالیاں
اور سبز کیاریوں میں وہ پھولوں کی لالیاں
آب رواں کا نالیوں میں لہر مارنا
اور روئے سبزہ زار کو دھو کر سنوارنا
گرنا و آبشار کی چادر کا زور سے
اور گونجنا وہ باغ کا پانی کے شور سے
جل تھل ہیں کوہ دشت میں تالاب آب کے
گویا چھلک رہے ہیں کٹورے گلاب کے
(ابرِ کرم)

مناظرِ قدرت کو اپنی نظموں کا موضوع بنانے والے شاعروں میں اسمٰعیل میرٹھی کا نام بھی خصوصیت کے ساتھ شامل ہیں انھوں نے جو نظمیں لکھیں اُن کے موضوعات ہیں ہوا چلی، گرمی کا موسم، رات، برسات، شفق وغیرہ ایسی نظمیں ہے جن میں مناظرِ قدرت کی بھرپور عکاسی ملتی ہے مثلاً

ہونے کو آئی صبح تو ٹھنڈی ہوا چلی
کیا دھیمی دھیمی چال سے یہ خوش ادا چلی
لہرادیا ہے کھیت کو ہلتی ہے بالیاں
پودے بھی جھومتے ہیں لچکتی ہیں ڈالیاں
پھلواریوں میں تازہ شگوفے کھلا چلی
سویا ہوا تھا سبزہ اُسے تو جگا چلی
(ہوا چلی)

رات کا سماں اپنی نظم کچھ اس طرح بیان کیا ہے۔

گیا دن ہوئی شام، آئی ہے رات
خدا نے عجب شئے بنائی ہے رات
لگے ہونے اب ہاٹ بازار بند
زمانے کے سب کا بہو رابند
اندھیرا اجالے پہ غالب ہوا
ہر ایک شخص راحت کا طالب ہوا
وہ دن بھر کی محنت کے مارے ہوئے
وہ ماندے تھکے اور ہارے ہوئے
نہایت خوشی سے گئے اپنے گھر
ہوئے بال بچے بھی خوش دیکھ کر
گئے بھول سب کام دھندے کا غم
سویرے کو اٹھیں گے اب تازہ دم
(رات کا سماں)

جدید اُردو نظم نگاری کے سلسلے میں مناظر قدرت کے موضوع پر نظمیں لکھنے والے شعراء میں ایک اہم نام سرور جہاں آبادی کا بھی ہے ان کے کلام میں مناظرِ قدرت کے معیاری نمونے ملتے ہیں جیسے شفق کی سرخی، ست رنگی قوس وقزح، ہندوستانی پانی کے چشمے، ندیوں اور آبشاروں کا ذکر، چرند پرند کی آوازیں وغیرہ۔ کہا جاسکتا ہے کہ سرور جہاں آبادی نے مناظرِ قدرت کی بہترین عکاسی اپنی نظموں میں کی ہے۔ مثلاً ان کی نظم ''بیر بہوٹی'' کا یہ بند دیکھئے۔

گل بداماں ہے شفق میں شعلہ تنویر حُسن   خون عاشق یا زمیں پر ہے گریباں گیر حسن
یا عقیق سرخ کی چھوٹی سی ہے تعمیر حسن   نقش نیرنگ فسوں ہے یا کوئی تصویر حسن
جلوہ گل ہے فضائے وادی کہسار میں
سرخ تکمہ ہے قبائے سبزہ کہسار میں

(بیر بہوٹی)

قدرتی مناظر سے متعلق سرور جہاں آبادی نے کئی نظمیں لکھیں مثلاً لالۂ صحرا، شفق، نسیم سحر، گل زار عروس برشگال، نوروز وغیرہ میں فطری منظر نگاری عروج پر ہے۔ ان کی نظم ''نسیم سحر'' سے ایک بند ملاحظہ ہو

گھونگھٹ اُلٹ اُلٹ کے رخِ نازنین سے تو   کرتی ہے چھیڑ سلسلہ عنبریں سے تو
ہونے کو ہمکنار گل و یاسمین سے تو   چلتی ہے بس کہ عطر میں خلدِ بریں سے تو
یوں دھیمی آتی ہے تاروں کی چھاؤں میں
مہندی لگا کے جیسے چلے کوئی پاؤں میں

(نسیم سحر)

قدرتی مناظر پر نظمیں لکھنے والے شعراء میں ایک نام کیفی دہلوی کا بھی ہے۔ جنھوں نے بسنت کی خبر، طلوعِ سحر، سوکھا ساون، بہارِ کشمیر وغیرہ جیسے عنوانات پر نظمیں لکھیں۔ طلوع سحر کا ایک بند درج ذیل ہے۔

چپکے سے کیا نسیم سحر نے سنا دیا   غنچوں کے دل کو فرطِ طرب سے کھلا دیا
بادِ سحر نے معجزہ اپنا دکھا دیا   شبنم کے چھینٹے دے کے چمن کو جگا دیا

غنچے بھی کھلکھلا کے گلستاں میں ہنس پڑے
انگڑائی لے کے سرو بھی جیسے ہوئے کھڑے

(طلوعِ سحر)

اس طرح انہوں نے ''سمندر جھاگ'' نامی نظم میں سمندر کے منظر کو پیش کی اہے بہار کشمیر کے قدرتی حسن کی خوبیوں کا ذکر روایتی انداز میں ملتا ہے مثلاً

سہانی لغزشیں مستانہ آبشاروں کی
وہ والہانہ لٹک چال جوئے باروں کی
تھیں سبزواریاں پیروں میں سر پہ اونچے پہاڑ
لدی پھندی ہوئی پھولوں سے جھاڑیاں اور جھاڑ
وہ کہکشاں کی سی پانی کی سبزے میں لہریں
کہ سبز پل پہ تھیں سیماب کی چھٹی نہریں
وُہ راگ چشموں کے اور وہ ترانے نہروں کے
کہ پانی پانی تھے نغمے ہزار لہروں کے

(بہارِ کشمیر)

قدرتی مناظر کو اپنی نظموں کی زینت بنانے والے ایک اور شاعر ہیں جنکا نام ہے تلوک چند محرؔوم ان کی نظموں میں سادگی، شگفتگی، روانی اور تازگی نظر آتی ہے۔ ان کی قابل ذکر نظموں میں وقت سحر، بندرابن کی ایک صبح، شامِ سرما، شفق، تصویر بہار وغیرہ شامل ہیں وقت سحر کا ایک بند ملاحظہ ہوں۔

چمکتا ہے سورج دمکتی ہے دُنیا
لپکتی ہیں موجیں جھمکتے ہیں دریا
چٹکتی ہے کلیاں مہکتا ہے سبزہ
مہکتا ہے گلزار عالم سراپا
چہکتی اُڑی بلبل نغمہ خواں ہے
سہانا سہانا سحر کا سماں ہے

(وقتِ سحر)

قدرتی مناظر کی عکاسی اقبال کی شاعری میں بھی نظر آتی ہے ان کی کئی نظمیں حسن فطرت کی غم بازی کرتی ہیں ان کے ابتدائی دور کی نظموں میں یہ رجحان زیادہ محسوس کیا جاسکتا ہے۔ یوں کہا جاسکتا ہے کہ اقبال فطرت کی آغوش میں سکون تلاش کرتے ہیں ان کی فکر حسین زرّوں کو چھو لیتی ہے وہ فطرت کے اسرار و رموز کے انکشاف اور انسان اور فطرت کے باہمی تعلق کو چھو لینے والی کیفیت کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کا ذہن انسان اور فطرت کے آغاز اور

انجام کے باہمی رشتوں سے دوچار ہوتا ہے مناظر قدرت سے متعلق ان کی نظموں میں ہمالہ، گل رنگین، آفتاب صبح، ماہ، نو، انسان اور بزم قدرت، چاند اور تارے شامل ہیں۔ سیّد عبداللہ نے کیا خوب لکھا ہے

"ان کی تصانیف میں خاصہ حصّہ ایسے اشعار کا ہے جن میں فطرت نگاری کی گئی ہے مگر اس کا مقصد فطرت نگاری نہیں وہ فطرت کی اس تصویر کو کسی دوسرے موضوع کی تمہید یا پس منظر کے طور پر پیش کرتے ہیں۔"[1]

سیّد عبداللہ نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے فطرت نگاری کے ایسے نمونے ان کی بعد کی نظموں میں بھی ملتے ہیں مثلاً ذوق وشوق، مسجد قرطبہ، ساقی نامہ وغیرہ مناظرِ قدرت کی عکاسی کی مثال نظم "ایک شام" کا یہ بند دیکھیے۔

خاموش ہے چاندنی قمر کی شاخیں ہیں خاموش ہر شجر کی
وادی کے نوافروش خاموش کہسار کے سبزہ پوش خاموش
فطرت بے ہوش ہوگئی ہے آغوش میں شب کے سوگئی ہے

(ایک شام)

اسی طرح نظم "نمود صبح" کا یہ بند ملاحظہ ہو۔

ہو رہی ہے زیرِ داماں افق سے آشکار صبح یعنی دختر دوشیزہ لیل و نہار
آسماں سے آمدِ خورشید کی پاکر خبر عمل پرواز شب باندھا سر دوشِ غبار

(نمودِ صبح)

کہا جاسکتا ہے کہ علامہ اقبال نے اُردو نظم میں قدرتی مناظر کی عکاسی کی ہے یہ ان کا ایک پسندیدہ موضوع رہا ہے۔

علامہ اقبال کے بعد نظم نگاری کے ایوان میں جن شعراء نے قدرتی مناظر کی عکاسی کی ان میں ایک اہم نام جوش ملیح آبادی کا بھی ہے ویسے تو وہ ایک انقلابی شاعر ہیں لیکن بقول ڈاکٹر حامدی کاشمیری

"جب انھیں زندگی نے غموں کا شعور دیا تو غموں سے فرار حاصل کرنے

ا۔ سیّد عبداللہ۔ مقالات اقبال ص ۸

لگے۔ چنانچہ انھوں نے حسنِ فطرت میں پناہ لی۔'' [1]

یہ کہا جاسکتا ہے کہ جوش کی نظموں میں یہ رجحان جذباتی نوعیت کا تھا ان کی طبعیت میں رومانی رجحان تھا انھوں نے فطرت کی رنگینیوں میں خود کو ڈبو دیا تھا۔ ان کی چند نظمیں جو قدرتی مناظر کی عکاس ہے کچھ اس طرح ہیں جو ''روح ادب'' میں شامل ہیں۔ برق عرفان، پانچ نغمے، ہماری سیر وغیرہ ہماری سیر کا یہ بند خوبصورت ہے جس میں فطری مناظر کی عکاسی ہوتی ہے۔

گہرا سکوت شب کا آہوں میں بہہ رہا ہے
تاروں سے بے کسی میں اس طرح کہہ رہا ہے

اے خوشنما ستاروں شمعیں جلانے والو — گردوں پہ سادگی سے اے جگمگانے والو
آرائش جہاں کی خاطر سنور نے والو — ہاں صوتِ سرمدی پر اے رقص کرنے والو
ایک بات میری مانو صدقے میں اس ضیاء کے — جب گلشنوں میں جھونکے چلنے لگے ہوا کے
جس وقت صبح صادق مشرق سے جگمگائے — جیسے ہی آج تم میں حسنِ ازل سمائے
کہنا کہ ایک بندہ مدت سے رو رہا ہے — رو رو کے بے کسی میں جاں اپنی کھو رہا ہے
جب صبح کا ستارہ ذرّوں کو جگمگائے — تو ذرا نکل کے پردے سے مسکرائے

(ہماری سیر)

جوشؔ اپنی نظموں میں قدرتی مناظر میں صرف ان حسین لمحوں کو بیان کرتے ہیں۔ جس سے طبعیت میں ہلکی سی روانی آجائے وہ اپنی نظموں میں رنگ ونور کی ہلکی پھلکی جھلک دکھلا کر قاری کی نگاہوں میں فطرت کے حسین نظاروں کو روشن کرتے ہوئے گذر جاتے ہیں۔ ان کی نظم ''برسات کی ایک شام'' پیغمبر فطرت، نغمہ سحر، البیلی صبح، کلیوں کی بیداری، بدلی کا چاند، اس نوعیت کی نظمیں ہیں۔

برسات کی ایک شام میں راجپوتانہ کی ایک گلابی شام کی منظر کشی ملتی ہے اس طرح نغمہ سحر ایک مختصر نظم ہے جس میں فطرت سے شاعر کے قلبی ربط کو پیش کیا گیا ہے۔

نسیم ہوتی ہے مخورات، سکوت ہوتا ہے جب چمن میں
میں پیش آتا ہوں اپنے آنسو خنک ستاروں کی انجمن میں

[1]۔ ڈاکٹر حامدی کاشمیری۔ اُردو شاعری پر یورپ کے اثرات ص ۲۹۳

میرے گلستانِ شاعری میں لچکنے لگتی ہیں نرم شاخیں
نسیم رقاصہ گلستاں ہنوز چلتی نہیں چمن میں
مجھے سنگھاتی ہیں روح پرور ہوائیں اس وقت بوئے قدرت
شمیم گلشن ہنوز ہوتی ہے بند غنچوں کے پیرہن میں

(نغمہ سحر)

یوں تو قدرتی مناظر پر بہت سے شعراء نے طبع آزمائی کی ہے لیکن ان میں مزید اضافہ کرنے والے شاعروں میں اختر انصاری بھی ہیں جن کی نظمیں چاندنی رات، دل کی دُنیا، ایک ستارہ وغیرہ قابل ذکر ہے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اُردو نظم میں مناظرِ قدرت ایک موضوع بن کر کئی شاعروں کی تخلیقات میں منعکس ہوتا رہا ہے۔

☆ اُردو نظموں میں سیاسی موضوعات:

اُردو نظم نگاری کا بغور مطالعہ کیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ ادب اور سیاست کا گہرا تعلق ہے کیونکہ حاکم وقت کے درباروں اور امراء وسلاطین کی محفلوں میں شعروادب پروان چڑھا ہے۔ ساتھ ہی ہر دور کی شاعری میں کہیں نہ کہیں اُس دور کے خدوخال نمایاں ہوتے رہے ہیں۔ادب وسیاست کا باہمی ربط وتعلق رہا ہے یہ بھی ایک اہم بات ہے کہ علی گڑھ تحریک سے پہلے اُردو ادب میں اُس دور کے سیاسی رجحانات اور حکمران طبقے کے کردار پر تنقیدی واحتسابی نگاہ بہت کم ڈالی گئی ہے یہ بات بھی عام ہے کہ ادب کو براہ راست سیاست کا حصّہ نہیں ہونا چاہئے۔لیکن ادب اپنے دور کے سیاسی حالات سے بے بہرہ بھی نہیں رہ سکتا ہے۔اختر انصاری کی رائے یہ ہے کہ

"ادب اپنے دور کی سیاست کو کسی حال میں نظرانداز نہیں کرسکتا۔جس زمانے میں سیاست اور سیاسی تنظیمیں صاحب اقتدار بالائی طبقہ کی ملکیت تھیں اور عوامی طبقے جمود اور بے حسی کا شکار تھے ادب وسیاست کا تعلق، سرسری، سطحی اور معمولی تھا پھر جب عوام میں سماجی احساس بڑھا اور سیاسی شعور پیدا ہوا اور خود سیاسی مسائل زیادہ اہم اور وزنی ہو گئے تو ادب اور سیاست کا تعلق بھی گہرا

اور جاندار ہو گیا۔''[1]

پروفیسر آل احمد سرور بھی ادب اور سیاست کے رشتے کو ضروری سمجھتے ہیں ان کا کہنا ہے

''ادب اور سیاست کی رفاقت کو زندگی کے لئے فال نیک سمجھا جاسکتا ہے مگر ادیب اربابِ سیاست کی مصلحتوں اور وقتی ضروریات کا پابند نہیں وہ چونکہ انسانی زندگی کا نباض اور حکیمانہ تصور کا مالک سمجھا جاتا ہے اسی لئے اُسے اس بات کا حق حاصل ہے کہ آئے دن وہ سیاسی احکام کے خلاف سوچے سمجھے اور لکھے۔''[2]

اُردو شاعری میں سیاسی رجحانات اس وقت سے ہی پائے جاتے ہیں۔ جب اُردو زبان نے ادب کا درجہ حاصل کیا۔ ولی دکنی سے آج تک اُردو شاعری کی مختلف اصناف میں بے شمار شعراء نے اپنے ماحول کے واقعات اور سیاسی کوائف کو موضوع سخن بنایا ہے ڈاکٹر اعجاز حُسین کا نظریہ ملاحظہ ہو۔

''اُردو ادب میں سیاست کوئی نئی چیز نہیں ہمارے ادب میں سیاست اس وقت شامل ہوگئی تھی جب زبان نے ادب کا درجہ حاصل کیا۔ اتفاق سے اُردو ادب کی ابتداء ایسے زمانے میں ہوئی جب ہندوستان انتشار اور سیاست کی بازی گاہ بنا ہوا تھا''[3]

اگرچہ کہ اُردو شاعری کا ایک بڑا حصہ دربار کے اثرات کے تحت وجود میں آیا لیکن اس دوران بھی اس عہد کے مسائل جن سے عوام الجھی ہوئی تھی یا ان کا استحصال ہوتا تھا اس بات کی طرف اشاروں اور کنایوں میں تنقید کی گئی ہے۔

جدید اُردو نظم کی ابتداء بھی ایسے ہی سماجی، سیاسی انتشار کے زمانے میں ہوئی ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ خیز ماحول اور اس سے پیدا شدہ سماجی سیاسی اور معاشرتی مسائل نظم کے موضوع بنتے رہے ہیں جن کا اظہار اُردو نظم میں ہوا ہے خود بہادر شاہ ظفر نے اپنے کلام میں جابجا اس کا تذکرہ کیا ہے۔ جس میں سیاسی اتار چڑھاؤ اور ردوبدل کا شدید احساس ملتا ہے۔

۱۔ اختر حُسین رائے پوری۔ ادب اور انقلاب ص ۱۱۵

۲۔ پروفیسر آل احمد سرور۔ ادب اور سیاست رسالہ منزل ص ۱۳۰

۳۔ اعجاز حُسین۔ ادب اور ادیب ص ۳۵۴

۱۸۵۷ء کے پُر آشوب دور کے بعد آہستہ آہستہ سیاسی استحکام کو بروئے کار لانے میں انگریزوں نے کوششیں کیں کئی اصلاحی کام بھی کیے۔ تعلیم کو عام کرنے کے لئے کالج قائم کیے گئے لیکن ہندوستانی عوام کے دِل سے وطن کی محبت کو نہ نکال سکے جو بعد میں سیاسی اقتدار کے حصول کا سب سے اہم محرک بنا بیسویں صدی کے نصف اول میں پہلی جنگِ عظیم کا سانحہ پیش آیا برطانیہ کی اتحادی فوجوں نے ترکی پر حملہ کر دیا خلافت عثمانیہ چاروں طرف سے دشمنوں کے نرغے میں گھیر گئی اور اس کے حصے بخرے ہو گئے اٹلی نے لیبیا پر قبضہ کر لیا بلقان کی ریاستیں خلافت سے کٹ گئی اور جب اٹلی کے بادشاہ عمانوید نے اعلان کیا کہ ہمارے ہوائی جہاز مسلمانوں کے کعبہ سے بھی نپٹ سکتے ہیں اس دھمکی سے برصغیر کے مسلمانوں میں زبردست خلجان پیدا ہو گیا علامہ شبلی نے اپنی ایک نظم میں اسی اضطرابی کیفیت کو بیان کیا۔

اگر ہم اُردو نظم کے ابتدائی زمانے پر نظر ڈالے تو حالؔی کی نظم نگاری میں سیاسی رجحان بھی نظر آتا ہے انھوں نے اپنے ہم وطنوں کی غلامی اور بے بسی پر ماتم کیا ہے ان کے اس احساس کا اندازہ اُن کی نظم آزادی کی قدر سے لگایا جا سکتا ہے۔

ایک ہندی نے کہا حاصل ہے آزادی جنھیں
قدرداں ان سے بڑھ کر کے ہیں آزادی کے ہم
ہم کے غیروں کے سوا محکوم رہتے آئے ہیں
قدر آزادی کی جتنی ہم کو ہو اتنی ہے کم

عافیت کی قدر ہوتی ہے مصیبت میں سوا
بے نوا کو ہے زیادہ قدر دینار و درم
تعریف الاشیاء بالا ضداد ہے قول حکیم
دے گا قیدی سے زیادہ کون
آزادی پہ دم سن کے ایک آزاد نے یہ لاف چپکے سے کہا
ہے سقر موری کے کیڑے کے لئے باغِ ارم

(آزادی کی قدر)

حالی نے ہندوستانیوں پر انگریزوں کے تسلط اور اُس کے نتیجہ میں ان کی مجبوریوں کو شدت سے محسوس کیا اور انھیں بھی اپنی نظم کالے اور گورے کی صحت کا میڈیکل امتحان میں بیان کیا ہے۔ شبلی کے یہاں سیاسی رجحان کا گہرا اثر نظر آتا ہے اُس وقت حالات کا تقاضہ تھا کہ سیاسی موضوعات کو محور و مرکز بنایا جائے چنانچہ شبلی نے عصری مسائل پر کھل کر اظہار خیال کیا ہے۔ ۱۹۰۶ء میں جب ہندوستانی سیاست میں مسلم لیگ جیسی سیاسی جماعت کی بنیاد پڑی تو شبلی اس کے مخالفین میں تھے اور انھوں نے مسلم لیگ کی سیاست کو اپنی نظم کا موضوع بنایا اس نظم کا عنوان ہے مسلم لیگ چند بند ملاحظہ ہیں

لیگ کی عظمت و جبروت سے انکار نہیں
ملک میں غلغلہ ہے شور ہے کہرام بھی ہے
ہے گورنمنٹ کی بھی اس پر عنایت کی نگاہ
نظرِ لطف رئیساں خوش انجام بھی ہے
کون ہے جو نہیں اس حلقہ قومی کا اسیر
اس میں ڈُہار بھی ہیں رند میں آشام بھی

(مسلم لیگ)

شبلی نعمانی نے مسلم لیگ ہی کے عنوان سے اور بھی کچھ کہا ہے جس میں طنزیہ انداز نمایاں نظر آتا ہے

برادرانِ وطن کہہ رہے ہیں کیا کیا کچھ
کبھی تو آپ بھی افسانہ جفا کہیئے
کبھی تو رد و قدح کی بھی کیجئے جراء ت
جو بات بات پر ہر بار مرحبا کہیئے
نہ ہوسکے تو اشاروں میں کیجئے اظہار
وگرنہ لطف تو یہ ہے کہ برملا کہیئے
جنابِ لیگ نے سب کچھ سن کر یہ فرمایا
مجھے تو خو ہے کہ جو کچھ ہے بجا کہیئے

(مسلم لیگ)

شبلی آزادی وطن کے لئے قول و فعل میں یکسانیت کے حامی تھے اس وقت مسلم لیگ اس وصف سے محروم تھی چنانچہ شبلی نے ایسی نظم ''حال کے بجائے قال درکار ہے'' کے عنوان سے لکھی اور مسلم لیگ کو نشانہ بنایا۔

لیگ والوں سے کہا میں نے یہ باتیں کب تک
یہ تو کہیئے کہ عمل کی بھی بناء ڈالی ہے
ایک صاحب نے کہا آپ نہ گھبرائیں ابھی
حال بھی آئے گا اب تک تو یہ قوالی ہے

(''حال کے بجائے قال درکار ہے'')

یوں تو شبلی کے یہاں سرسیّد، حالؔی یا اکبر کی طرح انگریزی حکومت سے بغاوت کے جذبات نہیں ملتے ہیں ۱۹۰۸ء تک وہ حکومت سے اتنے بدظن نظر آتے ہیں جب ۱۹۱۷ء میں جنگ بلقان میں انھوں نے دیکھا انگریزوں نے ترکوں کو برباد کر دیا تو اُن کے اندر انگریزوں کی مخالفت کا جذبہ پیدا ہو گیا اور حالات سے مجبور انھیں حکومت کے خلاف قلم اٹھانا پڑا چنانچہ انہوں نے ایک نظم شہر آشوب اسلام لکھی اُس کے اشعار کچھ اس طرح ہے

کوئی پوچھے کہ اے تہذیب انسانی کے اُستادوں
یہ ظلم آرائیاں تا کے یہ حشر انگریزیاں کب تک
یہ جوش انگیزی طوفان بے داد بلاتے کیسے
یہ لطف اندوزی ہنگامہ آہ و فغاں کب تک
یہ مانا تم کو تلواروں کی تیزی آزمانی ہے
ہماری گردنوں پہ ہوگا اُس کا امتحان کب تک
نگاریستانِ خون کی سیر گر تم نے نہیں دیکھی
تو ہم دکھلائیں تم کو زخم ہائے خونچکاں کب تک
یہ مانا گرمی محفل کے ساماں چاہیئے تم کو
دکھائیں ہم تمہیں ہنگامہ آہ وفغاں کب تک

کہاں تک لوگے ہم سے انتقام فتح ایوبی
دکھاؤ گے ہمیں جنگِ صلیبی کا سماں کب تک
سمجھ کر یہ دھندلے سے نشاں رفتگاں میں ہم
مٹاؤ گے ہمارا اسطرح نام و نشان کب تک
زوالِ دولتِ عثمان زوال شرع و ملت ہے
عزیزو! فکر فرزند و عیال و خانماں کب تک"[1]

شبلی نے وقتاً فوقتاً سیاسی موضوعات پر نظمیں لکھی جس میں کانپور کی مسجد کی شہادت کا واقعہ بیان کیا گیا جس کا عنوان "ہم کشتگان معرکہ کانپور" ہے اسطرح علمائے زندانی کے نام سے نظم لکھی انگریزوں نے علمائے دین کو نشانہ بنایا تھا اس کے خلاف غم وغصہ کا اظہار اس نظم میں ملتا ہے اس طرح مسلم لیگ کے ساتھ ہی ایک اور سیاسی جماعت احرار پر وہ برہم نظر آتے ہیں غرض یہ کہا جاسکتا ہے کہ شبلی نعمانی کی نظموں میں سیاسی مسائل کی عکاسی ملتی ہے۔

سیاسی رجحانات کو موضوع بنانے میں ایک اہم نام اکبر الہ آبادی کا ہے اُن کا مزاج انقلابی واصلاحی تھا ان کی شاعری سیاسی رجحانات کی آئینہ دار ہے سیاسی خیالات اُن کے یہاں قدم قدم پر ملتے ہیں اُن کی نظموں کا مطالعہ کرنے پر یہ اندازہ ہوجاتا ہے کہ وہ انگریزوں کے مخالف تھے لیکن ساتھ ہی سرسیّد اوران کی تحریک کو پسند نہیں کرتے تھے کیونکہ سرسیّد انگریزوں کی پیروی کرتے تھے ساتھ ہی گاندھی جی اور کانگریس کی تحریک ترک موالات سے وہ مطمئن نہیں تھے وہ یہ مان کر چلتے تھے کہ انگریزوں کے خلاف طاقت کا استعمال ہونا چاہیے۔

اکبر سرکاری ملازمت میں ہونے کے باوجود انگریزوں کی غلامی پر رضا مند نظر نہیں آتے اوراُن پر چوٹ کرنے سے بھی نہیں چوکتے مثلاً

اوج یہ برٹش راج کا دیکھا
پرتو تخت و تاج کا دیکھا
رنگ زمانہ آج کا دیکھا
رُخ کرزن مہراج کا دیکھا

۱۔ بحوالہ ڈاکٹر فوزیہ یاسمین۔ اُردو نظموں میں سیاسی رجحانات کی جھلکیاں

اوج تخت ملاقی ان کا
چرخ ہفت طباقی ان کا
محفل اُن کی ساقی اُن کا
آنکھیں میری باقی اُن کا

(جلوہ دربار دہلی)

ڈاکٹر خلیل الرحمٰن کے کہنے کے مطابق:

''دہلی دربار پر نظم لکھتے وقت ان کا سارا طنز ساری ظرافت لیمپ، کیمپ اور لیڈی کرزن پر صرف ہوئی۔''[1]

انگریزی حکومت کی جانب سے ہندوستانیوں پر طرح طرح کی پابندیاں تھیں۔ اس حالت میں ہندوستانیوں پر کیا کیا نہ گذری اس کا بیان کچھ اس طرح کیا ہے۔

دل گرانی مراحل کبھی ایسی تو نہ تھی
تند موج لب ساحل کبھی ایسی تو نہ تھی

بد گمانی تیری قاتل کبھی ایسی تو نہ تھی
بات کرنی مجھے مشکل کبھی ایسی تو نہ تھی

(اکبر الہ آبادی تضمین)

سیاسی تحریکوں سے اٹھنے والی بحث اور گرما گرمی کو کچھ اسطرح بیان کیا ہے

ادھر عزیمت گاندھی کو مشرقی کی تلاش
ادھر حلالت مغرب ہوم میں ہے کم باش
کہیں یہ شکوہ کہ انعام میں نہاں ہے قریب
کہیں یہ غصہ کہ شور و وفغاں ہے سمع خراش
کہیں یہ وسوسہ بنیاد سخت ست نہ ہو
کہیں یہ قطرہ کہ گرنے لگے نہ لاش پہ لاش

ا۔ ڈاکٹر خلیل الرحمٰن بحوالہ فوزیہ یاسمین اُردو نظم میں سیاسی رجحانات کی جھلکیاں ص ۱۰۰

انقلاب آیا نئی دنیا نیا ہنگامہ ہے
شاہ ناصر ہوچکا اب دور گاندھی نامہ ہے

(ترکِ موالات)

خلافت تحریک کے بارے میں کچھ اسطرح اظہار کرتے ہیں

بنگلوں سے نماز اور وظیفہ رخصت
کالج سے امام ابو حنیفہ رخصت
صاحب سے سنی ہے یہ قیامت کی خبر
قسطنطنیہ سے ہیں خلیفہ رخصت

اکبرالہ آبادی نے مختصر نظموں کے ذریعے ہندوستان کی آزادی اور سیاسی واقعات کو موضوع بنایا ان کے موضوعات میں مسجد کانپور کا قصہ ہو یا جلیان والا باغ کا خونی حادثہ اور تحریکِ ترک موالات ہو یا گئو رکشا شعیہ سنی جھگڑے ہوں یا بنگال کی تقسیم ہر طرح کے واقعہ پر اُن کی نظر تھی اور وہ اپنی نظموں کا موضوع ہر واقعہ کو بناتے رہے کہا جاسکتا ہے کہ اکبرالہ آبادی نے طنز و مزاح کے ذریعے ہندوستان کی سیاست پر گہری چوٹ کی ہے۔

سیاسی رجحانات کے علمبردار نظم نگاروں میں چکبست کا نام بھی اہم ہے وہ ایک سچے وطن پرست ہے ان کی نظم ''فریادِ قوم'' کے درج ذیل اشعار اُن کی وطن پرستی کا بین ثبوت ہے وطن پرستی اُن کی نظموں کے موضوعات کا اہم حصہ ہے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

مٹا جو نام تو دولت کی جستجو کیا ہے
نثار ہو نہ وطن پر تو آبرو کیا ہے
لگا دے آگ نہ دل میں تو آرزو کیا ہے
نہ جوش کھائے جو غربت میں وہ لہو کیا ہے
فدا وطن پر جو ہو آدمی دلیر ہے وہ
جو یہ نہیں تو فقط ہڈیوں کا ڈھیر ہے وہ

(''فریادِ قوم'')

چکبست کی اہم نظموں میں آوزہ قوم بھی بڑی اہمیت رکھتی ہے جس میں ہوم رول سے متاثر ہوکر انھوں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے

یہ خاک ہند میں پیدا ہیں جوش کے آثار
ہمالہ سے اٹھے جیسے ابر دریا بار
لہو رگوں میں دکھا تا ہے برق کی رفتار
ہوئی ہیں خاک کے پردے میں ہڈیاں بیدار
زمیں سے عرش تلک شور ہوم رول کا ہے
شباب قوم کا ہے زور ہوم رول کا ہے

("آوزہ قوم")

ہوم رول تحریک ڈاکٹر اینی بسنت نے شروع کی تھی جو ہندوستانیوں کو غلامی سے نجات دلانے اور آزاد کرانے کے لئے چلائی گئی تھی جب اینی بسنت گرفتار ہوئی تو چکبست نے اینی بسنت کی خدمت میں قوم کا پیغامِ وفا نظم لکھ کر غم کا اظہار کیا۔

اسطرح فریادِ قوم نے گاندھی جی کی تائید کی اور ہندوؤں اور مسلمانوں کو خطاب کرتے ہوئے انھیں اپنی ذمہ داری کا احساس دِلایا غرض یہ کہا جاسکتا ہے کہ چکبست نے ہندوستان کے سیاسی حالات ورجحانات پر اُردو میں کئی نظمیں لکھیں۔

اُردو نظم نگاری میں علامہ اقبال نے بھی سیاسی موضوعات کو اپنی نظموں کا محور بنایا انھوں نے اپنی مشہور نظم "ابلیس کی مجلس شوریٰ" میں اپنے عہد کے اہم سیاسی مسائل پر اظہار خیال کیا ہے اس نظم سے اقبال کی سیاسی فکر کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے اقبال شہنشاہیت، غلامی، ملوکیت اور فاشزم کو ابلیسیت بتاتے ہیں۔ ابلیس کے مشیر کبھی ملوکیت کو کبھی اشتراکیت کو جمہوریت کے لئے خطرہ بتاتے ہیں لیکن ابلیس یہ مانتا ہے کہ اسلام کا احیاء اور اسلامی تعلیمات کے فروغ سے خطرہ ہے اور وہ اپنے مشیروں کو مشورہ دیتا ہے کہ ملت اسلامیہ کو فضول بحثوں، غلامی کی لذتوں، شعر و تصوف کی گمراہی اور جدو جہد اور معرکہ آرائی

دوری میں گرفتار رکھا جائے وہ کہتا
ہر نفس ڈرتا ہوں اس امت کی بیداری سے میں

ہے حقیقت جس کے دیں کی احتساب کائنات
مت رکھ ذکر و فکر صبح گاہی میں اُسے
پختہ تر کردو مزاج خانقاہی میں اُسے

(''ابلیس کی مجلس شوریٰ'')

اقبال کے مجموعہ کلام ضرب کلیم کا ایک بڑا حصّہ سیاست مشرق ومغرب کے عنوان سے عصر حاضر کے سیاسی مسائل پر مبنی نظموں اور خطاب سے وابستہ ہے۔ وہ آزادی کی فضیلت اور غلامی ومحکومی کی ملامت کو بیان کرتے ہیں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اقبال غالباً بیسویں صدی کا وہ عظیم شاعر ہے جس نے اپنے عہد کے سیاسی رجحانات اور انقلابی تحریکوں سے متاثر ہوکر اپنی نظموں کی تخلیق کی ہے۔اور اپنے خیالات کا برملا اظہار کیا ہے۔

اُردو شاعری میں سیاسی رجحانات فراق گورکھپوری کی شاعری میں بھی ملتے ہیں فراق گورکھپوری کی نظم ''شامِ عیادت'' میں وہ ایک نئی دنیا کا خواب دیکھتے ہیں۔

اس نئے جہاں میں آدمی بنیں گے آدمی
جبیں پہ شاہکار دہر کا نشان لئے ہوئے
اس نئے جہاں میں آدمی بنیں گے دیوتا
طہارتوں کا فرق پاک پر نشان لئے ہوئے

(''شامِ عیادت'')

فراق کی نظموں میں خالص انقلابی انسان دکھائی دیتے ہے جو اپنے عہد کے سیاسی نظام کو بدلنے کا خواب دیکھتے ہیں۔فراق نے صحیح معنوں میں اپنی طویل نظموں میں سرمایہ درانہ نظام کے خاتمہ اور ایک نئے دور کی آمد کی بشارت دی ہے ١٩٣٦ء میں ترقی پسند تحریک کے باضابطہ آغاز نے اُردو شاعری کے افق کو مزید وسیع کردیا نئے موضوعات اُردو شاعری میں داخل ہوئے تمام مظلوم اقوام اور دبے کچلے افراد کی حمایت میں اُردو شاعری نے آواز بلند کی فیض احمد فیض نے سیاسی نوعیت کی نظمیں لکھی علی سردار جعفری نے عوام گے جذبات کی ترجمانی کی مخدوم محی الدین نے نوجوان نسل کو اشترا کی نظریات کا حامی بنادیا کیفی اعظمی نے اپنی نظموں میں آزادی سے قبل کی فرقہ وارانہ منافرت ختم کرنے پر زور دیا۔

ساحر لدھیانوی نے بھی سیاسی مسائل کو موضوع سخن بنایا ۱۹۴۵ء میں شملہ میں وائسرائے نے عارضی حکومت کے قیام کے لئے آل پارٹیز کانفرنس طلب کی تھی اس کی ناکامی پر ساحر نے نظم ''پھر وہی کنج'' لکھی انھوں نے جمہوریت اور خود اختیاری کی حمایت میں اور آمریت وشہنشاہیت کے خلاف اپنی شاعری کے رجحان کو مبذول کیا اسی طرح سیماب اکبر آبادی، روش صدیقی، ساغر نظامی، نازش پرتاپ گڑھی وغیرہ جیسے کئی شعرا سیاسی موضوعات پر نظمیں لکھتے رہے ان تمام شعراء کے کلام کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ اُردو شعراء نے ہنگامہ خیز دور کے تمام اہم سیاسی واقعات نظریات اور فلسفوں کی بھرپور ترجمانی کی یہ کھلی حقیقت ہے کہ صنف نظم نے ہماری سیاسی زندگی کے ایک ایک نقش کو ابھارنے میں بے مثال رول ادا کیا۔

☆ اردو نظموں میں اقدار اور روایت کے موضوعات:

جس طرح فرد سماج اور شاعری میں باہمی رشتہ ہوتا ہے۔اسی طرح ماضی حال اور مستقبل میں بھی ایک طرح کا داخلی ربط ہے۔انسان اپنے ماضی سے منقطع ہو کر زندہ نہیں رہ سکتا۔کیوں کہ ماضی کی تابناک جڑیں جیسے اقدار وروایات ہی حال کو سمت ورفتار عطا کرتی ہیں۔یعنی ماضی کی روایات اور سماجی اقدار حال اور مستقبل کے لئے مشعلِ راہ ہوتی ہیں۔اردو شاعری میں خاص طور سے اردو نظم نگاری میں اس طرح کے اقدار وروایات کو بھی موضوع بنایا گیا۔اپنے اسلاف کے کارنامے اور ان کا حسن سلوک ہی انھیں بلند تر مرتبے پر پہونچاتا ہے۔بقول ڈاکٹر ابواللیث صدیقی۔

> ''عصرِ حاضر کا کوئی نقش بظاہر کتنا ہی اچھوتا نرالا، نیا کیوں نہ ہو اس کی تہہ میں ماضی کے خطوط پنہاں ہوتے ہیں۔۔۔چراغ سے چراغ جلتا ہے۔تجربہ سے تجربہ حاصل ہوتا ہے''۔[1]

تاریخ ہند کے مطالعہ سے ثبوت فراہم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں کئی قومیں آئیں اور انھوں نے اپنی تہذیب، ورثہ اور اقدار کو ہندوستانی سماج میں ضم کر دیا۔ہندوستان کے مذہبی سماجی اور ثقافتی اقدار کو اپنایا اس طرح ہندوستانی سماج کی تعمیر تو ہوئی۔لیکن پھر بھی ایک عرصہ بعد

1۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی۔تجربے اور روایت ص ۵

ہندوستانی سماج کی اصلاح کی ضرورت محسوس کی جارہی تھی۔ وقت کے تقاضوں کے مطابق سماج میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ سارا معاشرہ گھٹن کا شکار تھا۔ مغربی اقوام خاص طور سے انگریزوں کی دخل اندازی ہندوستانی سماج اور مسلمانوں میں کئی طرح کی بدگمانیاں پیدا ہوئی تھیں مسلمان جو حکمران رہ چکے تھے۔ ان سے انگیز خائف تھے کہ کہیں دوبارہ اقتدار کے حصول کی خاطر برسر پیکار نہ ہو جائیں چنانچہ وہ مسلمانوں کو نشانہ بنا رہے تھے۔ اور ہندوستانی مسلمانوں کا بڑا طبقہ جو اپنے مذہبی اقدار کے پاسبانی کا دعویٰ کرتا تھا۔ ہمیشہ ہی انگریزی تہذیب سے نالاں تھا۔ اور اپنے آنے والی نسلوں کو اسلامی روایات اور اقدار کی پاسداری کا درس دیتا تھا۔ اردو شاعری میں خاص طور سے نظم نگاری میں اس تمدنی اقدار کی نشاندہی کی جاسکتی ہے۔

یہ بات تو سبھی جانتے ہیں کہ الطاف حسین حالؔی نے ۱۸۵۷ء کی ناکام جنگِ آزادی کے اثرات اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ ساتھ ہی اس پُر آشوب دور میں تہذیبی و ثقافتی اقدار کا فقدان کرنے لگا۔ اس دور کے ہر فرد کی آنکھوں میں مایوسی تھی۔ خاص طور سے مسلمانوں کی زبوں حالی پر زمانہ اشک بہا رہا تھا۔ حالؔی بھی اس سے مبرا نہیں تھے۔ ان کی نظم ''مرثیہ حکیم محمود خان'' میں اس بات کا ذکر ملتا ہے۔

راگنی نے وقت کی لینے دیا ہم کو نہ دم　　پر ملی ہم کا مجال نغمہ اس محفل میں کم
کوئی یاں رنگین ترانہ چھیڑنے پائے نہ ہم　　نالہ و فریاد کا ٹوٹا کہیں جا کر نہ سم

سینہ کوبی میں رہے جب تک کہ دم میں دم رہا
ہم رہے اور قوم کے اقبال کا ماتم رہا

حالی نے ایک نظم '' زمزمۂ قیصری '' میں بھی ہندوستان کی قدیم تہذیب مسلمانوں کی تہذیب، ہندی عوام اور ہندوستان کے بکھرنے کے اسباب پر اظہارِ خیال کیا ہے جیسے۔

جس بزم یک دلی کو تیرے برہم کر دیا　　اے مقدس آریہ ورتھ آئی کیا تجھ پہ بلا
ہاں مگر نا اتفاقی کی ملی تجھ کو سزا　　تو کہاں اور اہل مغرب کے بھلا حملے کہاں
لڑکھڑا جاتے قدم غیروں کے ہنگام دغا　　گر تیری اولاد میں ہوتا سلوک اور آشتی

حالؔی یہ قبول کرتے تھے کہ موسموں کا اثر تہذیب و تمدن پر پڑتا ہے اور اپنی موسموں میں تہوار اور فصلوں کے کٹنے کے موسم میں منائی جانے والی خوشیاں بھی ہندوستانی تہذیب ہی کے

دائرے میں آتی ہے۔ چنانچہ ان کی بہت سی نظمیں سردی، گرمی، برسات وغیرہ کے منظر کشی کی تصویریں ہیں۔ جب موسم سرسبز وشاداب ہوتا ہے۔ اور فصلیں کھیتوں میں لہلہانے لگتی ہیں تو جذبات انگڑائیاں لینے لگتے ہیں۔ دلوں میں خوشی اور مسرت کے نغمے پھوٹتے ہیں۔ کچھ لڑکیاں باغوں میں جھولے ڈالتی ہے۔ جو دیہی تہذیب کا اہم حصہ ہے۔ ہندوستانی تہذیب میں ایسے موسم میں جھولے جھولنے کی روایت بھی ملتی ہے۔ جس کے اثرات آج بھی نظر آتے ہیں۔ اس کی عکاسی حالی نے اپنی نظم ''برکھارت'' میں اس طرح کی ہے۔

کچھ لڑکیاں بالیاں ہیں کم سن جن کے ہیں یہ کھیل کود کے دن
ہیں پھول رہی خوشی سے ساری اور جھول رہی ہیں باری باری
اک سب کو کھڑی جھلا رہی ہے اک گرنے سے خوف کھا رہی ہے
اک جھولے سے گری ہے جاکر سب ہنستی ہیں قہقہے لگا کر

(برکھارت)

ہندوستانی تہذیب وتمدن کا ایک حصہ یہ بھی تھا کہ ہندو سماج میں عورتوں کی دوسری شادی نہیں ہوسکتی تھی۔ اس کا بیان بھی حالی نے اپنی نظم ''مناجات بیوہ'' میں کیا ہے۔

اپنے بڑوں کی ریت نہ چھوٹے قوم کی باندھی رسم نہ ٹوٹے
ہو نہ کسی کو ہم سے ندامت ناک رہے کنبے کی سلامت
جان کسی کی جائے تو جائے آن میں اپنی فرق نہ آئے

(مناجات بیوہ)

انگریزی تعلیم اور مغربی تہذیب کے اثرات کہیں نہ کہیں ہندوستانی تہذیب اور معاشرے کو متاثر کر رہے تھے اور مغربی تہذیب کو اپنا کر لوگ اپنی روایات واصولوں سے دور ہوتے جارہے تھے ان باتوں کی نشاندہی اسمٰعیل میرٹھی کی نظم ''انگریز فیشن والے'' میں نمایاں ہے۔

رہا وہ جرگہ جسے چڑ گئی انگریزی سو واں خدا کی ضرورت نہ انبیاء درکار
جو ار دلی میں ہے کُتا تو ہاتھ میں ایک بید بجاتے ہیں سیٹی سلگ رہا ہے سگار
وہ اپنے آپ کو سمجھتے ہیں جنٹلمین اور اپنی قوم کے لوگوں کو جانتے ہیں گنوار

(انگریزی فیشن والے)

اسمٰعیل میرٹھی کو اپنی قوم اپنی تہذیب اور اسلامی افکاروں نظریات کی فکر تھی وہ مسلم قوم سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

پلٹ گیا ہے زمانہ بدل گئی ہے رُت — نمو کا وقت ہے اور ابتدائے فصلِ بہار
غرض سب ہیں صلاح و فلاح کے جویا — دیا ہے ولولہ شوق نے دلوں کو ابھار
زمانہ چونک پڑا ہے پرائے مسلمانو! — جھنجھوڑنے سے بھی ہوتے نہیں ہو تم بیدار

(جریدہ عبرت)

ہماری تہذیب وتمدن میں عورتوں کا زیور شرم وحیاء کو سلیم کیا گیا ہے۔ انہوں نے عورتوں کے تہذیبی وتمدنی رویوں کو اجاگر کرنے کے لئے حیااور پاکیزگی کی تلقین کی ہے۔ اور نظم کا عنوان ''حیا''

اور حیااو پاسبانِ آبرو — نیکیوں کی قوتِ بازو ہے تو
دامنِ عصمت کو تو رکھتی ہے پاک — ہے سدا جرم و گند سے تجھکو پاک
گر نہ ہوتا درمیان تیرا حجاب — فعل بد سے کون کرتا ہے اجتناب
خواہشوں کو جو تو نہ دیتی ہے لگام — آدمی حیوان بن جاتے تمام
مفلسوں کی ہے تو ہی پشت پناہ — تو ہی سمجھاتی ہے عرق ریزی کی راہ
ہے ترے نزدیک مرجانا پسند — پر نہیں ہے ہاتھ پھیلانا پسند (حیا)

عظمتِ اسلاف وبرتری کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں

عزت کی ملی تھی انھیں جاگیر دوامی — دولت کے طرفدار تھے اور دین کے حامی
خصلت میں خوشامد تھی نہ عادت میں غلامی — رسموں میں خرابی تھی نہ اطوار میں خامی
گر فہم وفراست کی مجالس میں تھے نامی — تدبیر مما لک میں تھے وہ صدرِ گرامی
گر فتح وظفر میں تھے سکندر سے زیادہ — تھے دانش وحکمت میں ارسطو کے بھی دارہ

(آثارِ سلف)

اردو نظم نگاری کے دوران اپنی تہذیب وروایت کو موضوع بنانے والے شاعروں میں اکبر الہ آبادی بھی شامل ہیں۔ جس وقت اکبر نے شعور وادراک کی عمر میں قدم رکھا اُس وقت ہندوستان میں دو

اس لئے مغربی تہذیب کو ناپسند کرتے تھے۔

دین کو جب ہم نے دنیا پر مقدم کردیا　　دینوی درجہ کو بھی اللہ نے کم کردیا
وقعت مگر محال ہے مسجد کو چھوڑ کر　　ممکن نہیں کہ پائیے پھل جڑ کو توڑ کر

اکبر کی طرح شبلی کو بھی تہذیبی اور اخلاقی اقدار کی پامالی کا شدید احساس تھا۔ وہ اپنی نظم ''مذہب وسیاست'' میں انہی خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔

تم کسی قوم کی تاریخ اُٹھا کر دیکھو　　دو ہی باتیں ہیں کہ جن پر ہے ترقی کا مدار
مدّتوں بحث سیاست کی اجازت ہی نہ تھی　　کہ وفاداری مسلم کا تھا یہ خاص شعار
ہم کو پامال کئے دیتے ہیں اپنائے وطن　　ڈر ہے پس جائے نہ یہ فرقہ اخلاق شعار
وضع میں طرز میں اخلاص میں سیرت میں کہیں　　نظر آتے نہیں کچھ حرمت دین کے آثار
آپ نے ہم کو سکھائے ہیں جو یورپ کے علوم　　اس ضرورت سے نہیں قوم کو ہرگز انکار
بحث یہ ہے کہ وہ اس طرز سے بھی ممکن نہ تھا　　کہ نہ گھٹتا کبھی ناموس شریعت کا وقار

(مذہب اور سیاست)

خاص کر اکبر کی طرح سرور جہاں آبادی نے بھی
ہندوستانی سماج میں ایک بیوہ کو ہندو تہذیب
میں منحوس مانا جاتا ہے۔ چوڑیاں توڑی جاتی ہے۔ اور دنیا کی تمام آرائش اس کے لئے
ختم کردی جاتی ہے۔ اس بات کو موضوع بنایا ہے۔

''اجڑی ہوئی محفل'' نظم میں سماجی وتہذیبی زندگی کے کھوکھلے پن کو بیان کیا گیا ہے۔ چند اشعار اس طرح ہیں۔

اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بتوں سے سکھا
جنگ و جدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے
اک طلسم دلفریب ہستی موہوم ہے
ان کی شوخی ان کی تمکین ، انکا حسن ان کا شباب
دین و دنیا سے گیا جو ان پہ گرویدہ ہوا

(اجڑی ہوئی محفل)

اقبالؔ ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کے قائل تھے۔ اور وہ مذہب کی بنیاد پر ہندو، مسلم، سکھ اور عیسائی کی تفریق کو مٹا دینا چاہتے تھے نظم ''نیا شوالہ'' کے درج ذیل اشعار اس بات کی غمازی کرتے ہیں۔

پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے
خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرّہ دیوتا ہے

(نیا شوالہ)

اقبال دراصل تمام فرقے والوں کو تہذیب و تمدن کے اعتبار سے ایک جگہ ایک پلیٹ فارم پر لانے کی کوشش کرتے ہیں مثلاً

ہر صبح اُٹھ کے گائیں منتر وہ میٹھے میٹھے
سارے پجاریوں کو مے پیت کی پلاویں
شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

(نیا شوالہ)

اقبال نے اپنی نظم ''تہذیب حاضر'' میں بھی مساوات کا درس دیا ہے

حرارت ہے بلا کی بادہ تہذیب حاضر میں
بھڑک اٹھا بھبوکا بن کے مسلم کا تن خاکی
نئے انداز پائے نوجوانوں کی طبیعت نے
یہ رعنائی، یہ بیداری، یہ آزادی، یہ بیباکی
حیات تازہ اپنے ساتھ لائی لذتیں کیا کیا
رقابت، خود فروشی، ناشکیبائی، ہوسنا کی

(تہذیب حاضرؒ)

بیکاری، اور مساوات کا جھوٹا دعویٰ کرنے والے رویہ کو بھی موضوع بنایا ہے۔ مثلاً

یورپ مین بہت روشنئی علم و ہنر ہے
حق یہ ہے کہ بے چشمہ حیواں ہے یہ ظلمات
یہ علم یہ حکمت یہ تدبّر یہ حکومت
پیتے ہے لہو دیتے ہیں تعلیم مساوات
بے کاری و عریانی و میخواری و افلاس
کیا کم ہے فرنگی مدنیت کے فتوحات
ہے دل کے لئے موت مشینوں کی حکومت
احساس مروّت کو کچل دیتے ہیں آلات

(لینین خدا کے حضور میں)

یہ بات تو سبھی جانتے ہیں کہ انگریزی تعلیم کی وجہ سے انگریزی تہذیب دھیرے دھیرے ہندوستانی لوگوں میں سرائیت کر رہی تھی۔ اس رجحان کو کچھ لوگ غلط جانتے تھے۔ ایک حساس ذہن رکھنے والا شاعر بھی اس سے مبرا نہیں تھا انگریزی تہذیب کے بُرے اثرات کی وجہ سے اخلاق و تہذیب کی روایات متاثر ہوتے دیکھ کر اس بات کو موضوع بنایا جا رہا تھا چکبست بھی اس سے متاثر تھے اور انھوں نے کچھ اس طرح اپنی نظم پھول مالا (صبح وطن) میں اظہار خیال کیا ہے۔

روشن خام ہر مردوں کی نہ جانا ہرگز — داغ تعلیم میں اپنی نہ لگانا ہرگز
نقل یورپ کی مناسب ہے مگر یاد رہے — خاک میں غیرتِ قومی نہ ملانا ہرگز
رنگ و روغن تمھیں یوروپ کا مبارک لیکن — قوم کا نقش نہ چہرے سے مٹانا ہرگز

(صبح وطن)

مذہبی عقائد بھی ہندوستان کا حصہ ہیں۔ بس یا ریل جب کبھی گنگا کے پل سے گزرتی ہے تو بہت سے عقیدت مند پانی میں سکے اچھالنے لگتے ہیں۔ اور یہ مان لیتے ہیں کہ دریا کو پار کرنے کا جو پاپ ان سے ہوا ہے۔ اس سے مکتی مل گئی۔ جوش ملیح آبادی نے اپنی نظم ''پیاسی ندی'' میں اس بات کو کچھ اس طرح بیان کیا ہے۔

اے برادر پُل پہ جب گنگا کے آجاتی ہے ریل — پھینکتا ہے کس لئے سکے یہ کیا کرتا ہے کھیل
کیوں نہیں کرتا تو اس خون کی ندی کا پاس — جس کو گنگا سے کہیں بڑھ چڑھ کے ہے سکوں کی پیاس
ڈوب کر گنگا میں ایک پیسہ ابھر سکتا نہیں — ہند کی آنکھوں کے آنسو خشک کر سکتا نہیں
دیکھ کہ تیری یہ نادانی یہ کارِ ناصواب — شرم کے مارے ہوئی جاتی ہے گنگا آب آب

(پیاسی ندی)

حفیظ جالندھری نے ہندوستانی تہذیب اور ہندو مذہب کے اہم دیوتا ''کرشن کھنیا'' کو موضوع بنا کر اپنی نظم میں جن خیالات کا اظہار کیا اس سے خاص تہذیب کا تصور ابھر کر سامنے آتا ہے۔ جو کچھ اسطرح کا ہے

دربار میں تنہا
لاچار ہے کرشنا
سب اہل خصومت
ہیں درپئے عزت

آجا کرے کالے

بھارت کے اجیالے

پریوں میں ہے گلفام — رادھا کے لئے شیام

یہ راج دلارے — بُز دل ہوئے سارے

پروانہ ہوتا راج — بیکس رہے لاج

برام کا بھیّا

ماتھرا کا پیّا

بندرا میں کھیا

(کرشن کھیا۔ مجموعہ کلام)

ہندوستانی تہذیب وتمدن میں کردار عمل کو بہت بڑا دخل ہے۔ کردار سے مراد سیرت بھی ہوسکتی ہے۔ جب انسان اپنی سیرت کو کسی طرح داغدار کرلیتا ہے۔ تو تہذیب یافتہ افراد اُسے بُری نگاہ سے دیکھنے لگتے ہیں اس بات کو حفیظ جالندھری نے اپنی ایک نظم کا موضوع بنایا ہے۔ جس کا عنوان ''رقاصہ'' ہے اس نظم میں انہوں نے یہ بات بتانے کی کوشش کی ہے کہ ہماری تہذیب اور تمدنی زندگی کس قدر آلودہ ہوچکی ہے۔ مثلاً

ہندوستانی تہذیب وتمدن میں کردار عمل کو بہت بڑا دخل ہے۔ کردار سے مراد سیرت بھی ہوسکتی ہے۔ جب انسان اپنی سیرت کو کسی طرح داغدار کرلیتا ہے۔ تو تہذیب یافتہ افراد اُسے بُری نگاہ سے دیکھنے لگتے ہیں اس بات کو حفیظ جالندھری نے اپنی ایک نظم کا موضوع بنایا ہے۔ جس کا عنوان ''رقاصہ'' ہے اس نظم میں انہوں نے یہ بات بتانے کی کوشش کی ہے کہ ہماری تہذیب اور تمدنی زندگی کس قدر آلودہ ہوچکی ہے۔ مثلاً

تیرا تھرکنا خوب ہے — تیری ادائیں دل نشین

لیکن شہر تو کون ہے — او نیم عریاں نازنین

کیا مشرقی عورت ہے تو — ہرگز نہیں ہرگز نہیں

تیری ہنسی بے باک ہے

تیری نظر چالاک ہے

اُف کس قدر دلسوز ہے　　تقریر　　بازاری　　تیری
تجھ میں نہیں شرم و حیا
تجھ میں نہیں مہر و وفا　　(رقاصہ)

حفیظ جالندھری نے ''شاہنامہ اسلام'' جیسی معرکتہ الاراء نظم لکھ کر مسلمانوں کی تہذیب وتمدن کو اردو ادب کا ایک حصہ بنا دیا ہے

ہندوستانی تہذیب وتمدن کو موضوع بنانے والے شاعروں میں اختر شیرانی بھی کسی سے پیچھے نہیں۔ ان کی نظم ''او دیس سے آنے والے بتا'' ایک ایسی نظم ہے جس میں تہذیب و تمدن کی جھلکیاں صاف طور پر نظر آتی ہیں۔ اور خاص طور سے ہندوستان کی دیہی زندگی کا مکمل نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ یہ نظم صحیح معنوں میں ہماری دیہی تہذیب سے قاری کو نہ صرف متعارف کرتی ہے بلکہ دیہی زندگی سے قربت کا احساس دلاتی ہے۔ یہ بند ملاحظہ ہو۔

کیا اب بھی مہکتے مندر سے　　ناقوس کی آوازیں آتی ہے
کیا اب بھی مقدس مسجد سے　　مستانی اذاں تھراتی ہے
اور شام کے رنگین سایوں پر　　عظمت کی جھلک چھا جاتی ہے
او دیس سے آنے والے بتا

کیا اب بھی وہاں کے پنگھٹ پر　　پنہاریاں پانی بھرتی ہیں
انگڑائی کا نقشہ بن بن کر　　سب ماتھے پہ گار گردھرتی ہیں
اور اپنے گھروں کو جاتے ہوئے　　ہنستی ہوئی چہلیں کرتی ہے
او دیس سے آنے والے بتا

کیا اب وہاں میلوں میں وہی　　برسات کا جوبن ہوتا ہے
پھیلے ہوئے بڑ کی شاخوں میں　　جھولوں کا نشیمن ہوتا ہے
اُمڈے ہوئے بادل ہوتے ہیں　　چھایا ہوا ساون ہوتا ہے
او دیس سے آنے والے بتا
او دیس سے آنے والے بتا

ہندوستان کی بدلتی ہوئی تہذیب کا نتیجہ شہروں کے وجود میں لانے اور صنعتی شہروں میں بڑھتی ہوئی بھیڑ نے ہندوستان کی قدیم تہذیب کو کسطرح متاثر کر دیا ہے اس مسئلہ کو بھی شیرانی نے اپنی نظم ''فانی و باقی'' میں نمایاں کیا ہے شہر اور دیہات کی زندگی میں موجود فرق اور ساتھ ہی انسانی رشتوں اور قدروں کو ٹوٹ پھوٹ کو اردو شاعروں نے بیان کیا ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ یہ نظم اس دور کے بدلتے ہوئے تہذیبی پس منظر کی عکاسی کرتی ہے۔

بتاتی ہے یہ کثرت ہوٹلوں کی آج شہروں میں
کہ مہمانی کا جذبہ صرف دیہاتی میں ہے باقی
اِب وجہ کی حکومت مٹ چکی دنیائے فانی سے
حکومت اب بھی لیکن جو ہر ذاتی میں ہے باقی
حق ہمسایہ کا پاس اگلے وقتوں کا جو زیور تھا
نہ اب بدھ سنگھ میں ہے باقی نہ جمعراتی میں ہے باقی
بتوں کی تنگ نظری لکشمی بن کر چمکتی ہے
یہی وِدیا ہے جو لے دے کے اب جاتی میں ہے باقی
وفاداری کا جذبہ، جس پہ کٹ مرتے تھے غیر تمند
نہ پنجاب میں ہے باقی نہ قلاتی میں ہے باقی

ہندوستانی تہذیب وتمدن اور اس پر اثر انداز ہونے والے تمام عوامل کہیں نہ کہیں اردو نظم کا موضوع بنتے رہے ہیں۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اردو نظم کے موضوعات میں ایک اہم موضوع ہندوستانی تہذیب واقدار کی عکاسی بھی ہے جو قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔

اردو نظموں میں تعلیم کی اہمیت:۔

۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی میں ناکامی کے بعد انگریز جس قوت اور برتری کے ساتھ ہندوستان پر قابض ہوتے جا رہے تھے اس سے ہندوستانی عوام میں احساس کمتری پیدا ہو چلی تھی۔ خاص طور سے مسلم قوم کو اپنی تہذیب اور روایت کی فکر ستا رہی تھی۔ وہ خود کو انگریزی تہذیب وادب کے مقابلے میں کمتر سمجھنے لگتے تھے۔ اس قسم کے ماحول سے مسلمانوں کو نکالنے اور ان میں

خود اعتمادی پیدا کرنے کے لیے سر سید احمد خاں جیسی شخصیت سامنے آئی۔ انہوں نے تعلیمی میدان میں مسلمانوں کو انگریزی تہذیب و ادب کے نے روبرو کھڑے رہنے کی کے تحریک چلائی اسی دوران انجمن پنجاب کی بنیاد پڑی اور اردو شاعری میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا۔ کہا جا سکتا ہے کہ اس تحریک کا مقصد تعلیمی تھا۔ جو اتفاق سے ادبی بن گیا۔ محمد حسین کرنل ہالرائیڈ کے حوالے سے لکھا ہے۔

''اردو کے درسی کتابیں جو بالفعل رائج ہیں یا جن کے پڑھانے کی کمیٹی نے سفارش کی ہے۔ ان میں اردو نظم بالکل نہیں۔۔۔۔ آپ اس بات پر غور کریں کہ ہمارے دیہاتی مدارس میں ایک منتخبات اُردو نظم جن میں اخلاق و نصیحت اور ہر ایک کیفیت کی تصویر کھینچی گئی ہو درس میں داخل نہیں ہو سکتی۔ کیا اس قسم کا انتخاب سوداؔ، میر تقی میرؔ، ذوقؔ یا غالبؔ کی تصنیفات سے مرتب ہو سکے گا؟ تو۔۔۔۔ دریافت کیا جا سکتا ہے کہ شعرائے زمانہ حال سے خاص مدارس کے لئے ایک ایسی تصنیف کا کام سرانجام ہو سکتا ہے یا نہیں؟ اگر اس طور پر مدارس سرکار کے وسیلے سے رواج ہو جائے اور واہیات نظم جو بالفعل بہت رائج ہے ختم ہو جائے تو بڑی اچھی بات ہو گی۔''

یہہ وقت و حالات کا تقاضہ تھا کہ تعلیم کو اہمیت دی گئی اور اردو نظموں میں تعلیم کی اہمیت کو موضوع بنایا گیا۔ مثلاً

اب نہ سید کا افتخار صحیح — نہ برہمن کو شدر پر ترجیح
قوم کی عزت اب ہنر سے ہے — علم سے یا سیم و زر سے ہے
کوئی دن میں وہ دور آئے گا — بے ہنر بھیک تک نہ پائے گا

بادہ تہذیب یوروپ کے چڑھاؤں خُم کے خُم
ایشاء کے شیشہ تقویٰ تو کہ دو پاش پاش (حالیؔ)

محمد حُسین آزاد نے میتھالوجی جو کہ خاص علم ہے اس میں علم کو مجسّم کر کے دکھایا گیا ہے آزاد نے خواب امن میں کئی تمثیلی مرقعہ پیش کیے ہیں علم کی تجسیم اسطرح کرتے ہیں؎

دفعتاً دیکھا کہ اک پیر کہن سال آئے — پر عجیب شان سے اک مرد خوش اعمال آئے

چشم پُر نور میں پہنے ہوئے جامہ کالا بر میں جبہ عربی سر پر عمامہ کالا
پاؤں تک شملہ دستار جو آجاتا ہے اُن کے مقدار فضیلت کو بتا جاتا ہے
لاغری چہرے پر ہر چند کہ چھائی تھی بہت رخ کی عینک نے مگر شان بڑھائی تھی بہت
(خواب امن)

انگریزی تعلیم اور فیشن پر طنز کرتے ہوئے اکبر الہ آبادی نے کچھ اس طرح کہا ہے۔

ہوئی تھی تاکید لندن جاؤ انگریزی پڑھو
قوم انگلش سے ملو سیکھو وہی وضع وتراش
لیڈیوں سے مل کے دیکھو ان کے انداز وطریق

دراصل اکبر الہ آبادی انگریزی تعلیم اور نئی تہذیب کو ناپسند کرتے تھے ان کے نزدیک سماجی برائیاں اس نئی تعلیم سے پیدا ہوتی ہے انہوں نے علی گڑھ تحریک پر اس طرح طنز کیا ہے۔

ابتداء کی جناب سیّد نے جس کے کالج کا اتنا نام ہوا
انتہا یونیورسٹی پہ ہوئی قوم کا کام اب تمام ہوا

یا

تم شوق سے کالج میں پھلو یا پارک میں پھولو
جائز ہے غباروں میں اڑو چرخ پہ جھولو
لیکن یہ سخن بندہ عاجز کا رہے یاد
اللہ کو اور اپنی حقیقت کو نہ بھولو

اکبر الہ آبادی نے صنعت وحرفت کا علم حاصل کرنے کی تلقین کچھ اس طرح کی ہے۔

وہ باتیں جن سے قومیں ہو رہی ہیں نامور سیکھو
اٹھو تہذیب سیکھو صنعتیں سیکھو ہنر سیکھو
بڑھاؤں تجربے اطراف دنیا میں سفر سیکھو
خواص خشک وتر سیکھو علوم بحر و بر سیکھو
خدا کے واسطے اے نوجوانوں ہوش میں آؤ
دلوں میں اپنے کو غیرت کو جگہ دو جوش میں آؤ

☆ اردو نظموں میں عورتوں کی حالات زار:

ہندوستانی سماج میں عورتوں کی سماجی حیثیت دوسرے درجہ کی تھی۔ انہیں عزت واحترام نصیب نہ تھا۔ ان پر طرح طرح کے مظالم ڈھائے جاتے تھے۔ انیسویں صدی میں کئی اصلاحی تحریکیں وجود میں آئیں۔ معاشرے سے برائیاں دور کرنے کی کوشش کی جارہی تھیں۔ اور اچھائیوں کی تلقین کی جارہی تھی۔ بیوہ عورت کو ہندوستانی معاشرے میں بہت برا اور منحوس سمجھا جاتا تھا۔ اس کی بے کسی اور بے بسی کو محسوس کرتے ہوئے حالؔی نے اپنی نظم میں بیوہ کی زبانی اس کے رنجیدہ جذبات واحساسات کی اس طرح عکاسی کی ہے یوں محسوس ہوتا ہے۔ کہ ایک بیوہ خود اپنے حالات کی عکاسی کر رہی ہے اپنا درد خود کی زبانی بیان کر رہی ہے کچھ اشعار ملاحظہ ہو۔

میں لونڈی تیری دکھیاری دروازے کی تیرے بھکاری
اپنے پرائے کی دھتکاری میکے اور سسرال پہ بھاری
موت کی خواہاں جان کی دشمن جان سے اپنے آپ اجیرن
سہہ کے بہت آزار چلی ہو دنیا سے بے زار چلی ہوں
پیت نہ تھا جب پایا پتیم جب ہوئی پیت گنوایا پتیم
دن ہیں بھیانک رات ڈراونی یوں گذاری یہ ساری جوانی

(مناجات بیوہ)

اور یہی عورت جب ماں ہوتی ہے تو اپنے بچے کے لئے کسطرح رات و دن ایک کر کے اس کی خدمت کرتی ہے۔ خواہ کی نیند وچین تیاگ کر خدمت میں لگی رہتی ہے۔ جیسے

رات کو لوریاں سناتی ہے گود میں لے کے بیٹھ جاتی ہے
کس قدر زحمتیں اٹھاتی ہے بچہ ہے اور ماں کی چھاتی ہے

کبھی کنڈی بجاکے بہلایا
کبھی کندھے لگائے ٹہلایا

چیخ کو سن کے دوڑی بچاری آنسو ٹپ ٹپ ہے آنکھ جاری
ہوئی بچہ پر صدقہ اور واری کون کرتا ہے یوں خبرداری

جھٹ کلیجے لگا لیا ماں نے
جھاڑا پونچھا اُٹھا لیا ماں نے

(مناجات بیوہ)

اقبالؔ نے اردو شاعری کے ذریعہ عورتوں کی عظمت کا اعتراف کچھ اسطرح کیا ہے۔

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ
اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ دروں

☆ اردو نظموں میں عورتوں کی عظمت

اردو شاعری کی تاریخ میں ایسے شعراء کی کمی نہیں جنہوں نے عورتوں کی تہذیبی و تمدنی رویوں کو اپنی نظموں میں اُجاگر کیا اور ان کی اصلاح کی تلقین بھی کی عورتوں میں شرم وحیا۔ پاکیزگی عزت وعصمت کی پاسداری کی اہمیت کو اجاگر کرنے میں کئی نظمیں ملتی ہے۔ چکبست کی نظم حیا اس کی بہترین مثال ہے۔

سرور جہاں آبادی نے بھی عورت کو ایک وفا شعار بیوی کے روپ میں پیش کیا ہے۔ ہندوستانی معاشرے میں ایک بیوی اپنے شوہر کے بغیر زندگی گذارنے کے لئے ہرگز تیار نہیں رہتی وہ اپنے شوہر کا ہر وقت ساتھ دیتی ہے چاہے خوشی ہو یا غم۔

''بن باس کا ایک سین'' میں اسی طرح کے خیالات کی غمازی ملتی ہے۔

ہمراہ اپنے بن کو مجھے ساتھ لے چلو — ریکھا تمہارے چرنوں کی ہوں ساتھ لے چلو
نازک ہے میرا شیشہ دل ٹوٹ جائے گا — چھوٹا تمہارا دیش تو جی چھوٹ جائے گا
گھر میں جو چھوڑ جاؤ گے سیتا غریب کو — پاؤ گے کے بن سے آ گے نہ جیتا غریب کو

عورتوں کی حیاو ناموس کے تحفظ کو چکبست ضروری سمجھتے تھے۔ ''نظم پھول مالا'' میں اسی قسم کے خیالات کی عکاسی کی ہے۔

تم کو قدرت نے جو بخشا ہے حیا کا زیور — مول اُس کا نہیں قاروں کا خزانہ ہرگز
دل تمہارا ہے وفاؤں کی پرستش کے لئے — اس محبت کے شوالے کو نہ ڈھانا ہرگز

حفیظ جالندھر نے بھی عورتوں کی حیا اور پاکیزگی کو اپنی نظموں کا موضوع بنایا ہے۔ ایک

رقاصہ کو مشرقی عورت ہونے کا احساس دلایا ہے۔

یہ پر فسوں غمزے ترے نامحرموں کے سامنے
ہٹ سامنے سے دور ہو مردود ہو مقہور ہو
تقدیر کی ہیٹی ہے تو شیطان کی بیٹی ہے تو

(رقاصہ)

احسان دانش نے بھی ہندوستانی عورت کا تصور پیش کیا ہے۔ جس میں ایثار و قربانی کے جذبات اہمیت رکھتے ہیں۔ انہی جذبات کو انہوں نے اپنی نظم ''شریکِ زندگی'' میں پیش کیا ہے۔ مشرقی عورت اپنے شوہر کا کس طرح خیال رکھتی ہے۔ اس کے لئے نظم کا بند ملاحظہ ہو۔

برابر ہے مگر بڑھ کر قدم یوں رکھتی جاتی ہے رخ روشن پہ سایہ ٹوکری سے کرتی جاتی ہے
نئی تہذیب کے منہ زور دیوانے ادھر آئیں یہ منظر دیکھ لیں اور منصفی سے غور فرمائیں
جبینِ ہند کی کھوئی ہوئی تابندگی یہ ہے بجا ہے ناز جس پر وہ شریک زندگی یہ ہے
یہ ہے خاتونِ مشرق جانثاری اس کی فطرت ہے سہاگ اس کا وفا ہے یہ محبت ہی محبت ہے

(شریک زندگی)

مخدوم محی الدین نے بھی دیہات کے تہذیبی ماحول کے پس منظر میں خلوص و حیا کی پاسدار عورت کے عکس کو اپنی نظم ''تلنگن'' میں بیان کیا ہے۔ مثلاً نظم کا یہ بند

پھرنے والی کھیت کی مینڈوں پہ بل کھاتی ہوئی
نرم شیریں قہقہوں کے پھول برساتی ہوئی
کنگنوں سے کھیلتی اوروں سے شرماتی ہوئی
دخترِ پاکیزگی، ناآشنائے سیم و زر
دشت کی خود رو کلی تہذیب نو سے بے خبر
تیری خس کی جھونپڑی پر جھک پڑے سب بام و در
اجنبی کو دیکھ کے خاموش مت ہوگائے جا
ہاں تلنگن گائے جا بانکی تلنگن گائے جا

(تلنگن۔ سرخ سویرا)

اسلامی اور ہندوستانی کلچر میں عورت کا جو تصور نہایت ہی پاکیزہ، خاموش طبیعت نقاب پوش، شوہر پرست، امورِ خانہ داری میں ماہر شائستہ ہونے کا ہے۔ مگر اسرار الحق مجازؔ اس سے بغاوت کرتے ہوئے عورت میں خودداری اور تابعداری کے خلاف آواز اُٹھانے اور اپنی عصمت کی خود امین ہونے کی تلقین کرتے ہیں۔ جو عورت کے تئیں نئے رویئے کو جنم دیتا ہے۔ ان کی نظم ''نوجوان خاتون سے'' یہ بند پیش کیا جاتا ہے۔

تیری نیچی نظر، خود تیری عصمت کی محافظ ہے
تو اس نشتر کی تیزی آزما لیتی تو اچھا تھا
گر خلوت میں تو نے سر اٹھایا بھی تو کیا حاصل
بھری محفل میں آکر سر جھکا لیتی تو اچھا تھا
تیرے ماتھے پہ یہ آنچل بہت خوب ہے لیکن
تو اس آنچل سے اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا

(نوجوان خاتون)

یوں تو اردو شعر و ادب کی تمام دنیا پر عورت کا ہی راج رہا ہے۔ خاص طور سے غزل میں عورت کا جو تصور ابھرا اور شاعروں نے کبھی معشوقہ کبھی محبوبہ کبھی دلبر کہہ کر اُسے محبت کی دیوی بنا دیا۔ تو کبھی پو ہڑ قسم کے عاشقوں نے اس کی رسوائی کو ہوا دی۔ غدر کے بعد سے اردو شاعروں نے ملک، ملت، اور سماجی بہبود کے پیش نظر عورت کے معشوق کے موضوع کو اپنی شاعری سے خارج کر دیا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ شائد عشق و عاشقی کو وہ اپنے قومی زوال اور شکست کی وجہ سمجھتے رہے۔ بقول وزیر آغا۔

''چوں کہ محبت اور عورت سے اجتناب کی صورت کے پس پشت یہ اعصابی خوف موجود تھا۔ کہ اگر ایک دفعہ عورت کا ذکر چھڑ گیا تو پھر قومی تعمیر کا سارا منصوبہ دھرے کا دھرارہ جائے گا۔ اس لئے ظاہر ہے کہ اس دور کی اردو نظم میں عورت، موضوع کو نظر انداز کرنے کا ایک غیر فطری اور مصنوعی رجحان پیدا ہو گیا۔''[۱]

۱۔ وزیر آغا۔ اُردو شاعری کا مزاج ص ۳۲۵

اردو نظم میں عورت کے موضوع کو اس کا کھویا ہوا مقام واپس دلانے کا کام اردو ادب کی رومانی تحریک نے انجام دیا۔ عظمت اللہ خاں اور اختر شیرانی جیسے شعراء نے جو رومانی تحریک کے علم بردار تھے۔ رومانی تحریک نے اردو شاعری خاص طور سے نظم کو خارجی مظاہر کے بجائے داخلی کیفیت کے اظہار کو اولیت دی عظمت اللہ خاں نے عشق یا محبت کو بڑی حد تک زندگی کے واقعات اور تجربات سے متعلق بیان کیا مثلاً

تمہیں یاد ہے وہ دن بھی   کہ لگی تھی آگ من میں

وہ دو ان پن کا سن بھی   کہ بھری تھی برق تن میں

مرا دن بھی مری رات بھی تم تھیں میری کائنات تم تھیں

(نظم۔ تمہیں یاد ہیں وہ دن بھی)

اختر شیرانی کی نظموں کا موضوع اسلاف کے کارناموں کو بیان کرنا نہیں بلکہ عورت کی اہمیت کو اجاگر کرنا ہے۔ ان کی نظموں میں عورت زندگی کے ایک خاص رخ کی علامت بن کر نمودار ہوئی ہے۔ اختر شیرانی نے عورت کو جو اہمیت دی ہے کچھ اس طرح ہے۔

ہر تصویر کے رنگوں میں نگہت اس کی آوارہ

حسین اور خوشنما اشعار شاداب اسکے نغموں سے

ہمارے بربطوں کے تار بے خواب اس کے نغموں سے

بتوں کے مرمریں پردوں میں نگہت اس کی آوارہ

غرض جب تک یہ دنیا ہے اور اسکی خوشنمائی ہے

ہماری زندگی پر صرف عورت کی خدائی ہے

یا

وہ جذبہ جو نسائی جذبوں کا منتہا ہے

دنیا میں نام اس کا اک ماں کی ممتا ہے

آغوش ناز گنج اقبال سے بھرا ہے

یا خواب روح مست تعبیر ہو رہا ہے

رہ رہ کے ماتا کا اظہار کر رہی ہے
بے تاب ہو رہی ہے اور پیار کر رہی ہے

(ماتا)

اختر شیرانی نے اپنی نظموں میں شمسہ پروین عزرا، سلمٰی، کے نام علامتی طور پر استعمال کئے ہیں۔ دراصل ان علامتوں کی روشنی میں یہی عورت لیلیٰ، نور جہاں اور شیریں بن کر ابھرتی ہے۔ جو محبت وفا اور ایثار و قربانی اور انصاف شجاعت کی مثالیں ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ اردو نظموں میں عورتوں کی عظمت کو بھرپور انداز میں اجاگر کیا ہے۔

☆ اردو نظموں میں قومی اتحاد و یکجہتی

ہندوستان میں قومی اتحاد کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ یہاں کئی مذاہب کے ماننے والے بستے ہیں۔ ان کے عقائد، ان کا سماجی رتبہ، رہن سہن فکر و سوچ علیحدہ ہے۔ اس لئے یہاں ہم آہنگی محبت و اخوت اور بھائی چارگی ضروری ہے۔ اردو نظموں میں جا بجا اس کا ذکر ملتا ہے۔ جدید نظم کے تحت اردو میں قومی یکجہتی اور قومی اتحاد پر بیش بہا نظمیں لکھی گئی۔ خاص طور سے حالی کی کئی نظمیں ملتی ہیں۔ جن میں تعصب و انصاف اور حبِّ وطن وغیرہ خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ وہ ہندوستانیوں کو قومی اتحاد کا اس طرح درس دیتے ہیں۔

یہ پہلا سبق ہے کتابِ ہدیٰ کا
کہ ہے ساری مخلوق کنبہ خدا کا
وہی دوست ہے خالق دوسرا کا
خلائق سے ہے جسکا رشتہ ولا کا

یہی ہے عبادت یہی دین و ایماں
کہ کام آئے دنیا میں انساں کے انساں

اور ہندو مسلمانوں کو تاکید کرتے ہیں۔

ہندو سے لڑیں نہ گبر وسے بیر کریں
شر سے بچیں اور شر کے عوض خیر کریں
جو کہتے ہیں یہ کہ ہے جہنم دنیا
وہ آئیں اور اس بہشت کی سیر کریں

اکبر الہ آبادی کی نظموں میں قومیت اور بھائی چارگی کا اظہار ملتا ہے۔ وہ اپنے ہم وطنوں کے لئے محبت اور پیار و خلوص کا پیام دیتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ

محرم اور دسہرہ ساتھ ہوگا
نباہ اس کا ہمارے ساتھ ہوگا
کہاں کے ہندو کہاں کے مسلم
بھلائی ہیں سب نے اگلی رسمیں
شیخ نے ناقوس کے سُر میں جو خود ہی تان لی
پھر تو یاروں نے بھجن گانے کی خود ہی ٹھان لی
یہاں تسبیح کا حلقہ وہاں زنار کا پھندا
اسیری لازمی ہے مذہب شیخ و برہمن میں

اقبال کی شاعری میں قومی یکجہتی کے بے شمار عناصر ملتے ہیں وہ اسلامی تہذیب کے ساتھ ہندوستانی تہذیب اور ہندوستانی قوم سے بے انتہا لگاؤ رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے رام، ہندی ترانہ۔ گرونانک۔ پرندے کی فریاد، گوتم بدھ اور نیا شوالہ جیسی نظمیں لکھیں۔ جوان کی قوم پرستی اور قومی یکجہتی کے جذبات کو ظاہر کرتی ہے۔

۱) مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہے ہم وطن ہے ہندوستان ہمارا

۲) آ غیرت کے پردے اک بار پھر اٹھا دے
بچھڑوں کو پھر ملا دیں، نقشِ دوئی مٹا دیں
دنیا کے تیرتھوں سے اُنچا ہو اپنا تیرتھ
دامانِ آسماں سے اس کا کلس ملا دیں

۳)	کہتا ہوں میں ہندو مسلماں سے یہی
اپنی اپنی روش پر تم نیک رہوں
لاٹھی ہے ہوائے دہر پانی بن جاؤ
موجوں کی طرح لڑو مگر ایک رہو

۴)	ہندو مسلم ایک ہیں دونوں
یعنی دونوں ہی ایشائی ہیں
ہم وطن ، ہم زباں، ہم قسمت
کیوں نہ کہہ دو کہ بھائی بھائی ہیں

چکبست نے وطن پرستی کے نغموں کے ساتھ ساتھ ہندو مسلم قومی یکجہتی کے جذبات بھی اکثر جگہ عکاسی کی ہے۔

دل صورتِ آئینہ جو روشن نہیں ہوتا
زنار پہننے سے برہمن نہیں ہوتا

اذاں دیتے ہیں بت خانے میں جا کر شانِ مومن سے
حرم میں نعرہ ناقوس ہم ایجاد کرتے ہیں
بلائے جاں ہیں یہ تسبیح اور زنار کے پھندے
دلِ حق بیں کو ہم اس قید سے آزاد کرتے ہیں

ظفر علی خاں کہتے ہیں کہ

مٹائیں برہمن و شیخ تفرقے اپنے
زمانہ دونوں کے گھر کا غلام ہوجائے

☆ اردو نظموں میں قوم پرستی کے تصورات

قوم انگریزی لفظ Nation کے مترادف ہے۔ اور اس کے معنی ہیں ایک مذہب کے ماننے والے، ایک علاقے میں رہنے والے یا ایک سیاسی نظام کے تحت زندگی گزارنے والے۔

مختلف مفکروں نے Nation یا قوم کی تعریف اپنے اپنے الفاظ میں کی ہے۔

میکائیور کے مطابق

''قومیت مشترکہ جذبہ اور ایکدوسرے سے وابستگی کے اپنے شعور کا نام ہے جسے ایسے تاریخی حالات نے جنم دیا۔ ہو جنھیں مشترکہ رومانی ورثہ ملاحظہ ہو اور یہ خواہش رکھتے ہوں کہ اپنی حکومت بنائیں۔'' [1]

جان اسٹورٹ مل کا کہنا ہیکہ

''قومیت کا جوہر باہمی ہمدردی اور اپنی حکومت کے تحت متحد رہنے کی خواہش ہے جو ماضی کی تاریخ اور سیاست جذبہ افتخار و منزلت سکھ اور دکھ کے مشترکہ تجربات کی بنیاد پر پیدا ہوتی ہے۔'' [2]

لارڈ برٹش کا خیال ہے

''قومیت وہ آبادی ہے جو زبان و ادب اور تصورات و رسم و رواج جیسے رشتوں سے اسطرح بندھی ہو کہ وہ اپنی ٹھوس اکائی کو محسوس کرے اور انہی بنیادوں پر بندھی ہوئی دوسری آبادی کو اپنے سے علیحدہ سمجھے'' [3]

یہہ بات اپنی جگہ صحیح ہے کہ قومیت کا تصور نسل، مذہب زبان، مملکت، تہذیب یا اقتصادی مفادات کی بنیاد پر نہیں ہوتا بلکہ مشترکہ تجربات قومیت کی تشکیل میں معاون ہوتے ہیں۔ اور مختلف خیال اور مختلف مذہب کے ماننے والے خود کو ایک ایسے مضبوط رشتے میں باندھ لیتے ہیں اور مشترکہ کلچر کو اپناتے ہیں اس کلچر کی رگوں میں اُن کے خیال میں مشترکہ اقتصادی و سیاسی مفاد کا خون دوڑتا رہتا ہے۔

اردو ادب خاص طور سے اردو نظموں میں ہندوستان کے اِسی کلچر و قومیت کے جذبہ کو موضوع بنایا گیا ہے۔ یہی جذبہ جنگِ آزادی میں ہندوستان کو ایک رشتہ میں باندھنے کا وسیلہ بنا۔ اور نظم نگاری قومیت کے اس جذبہ کو بیان کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ درج ذیل شعراء کے اشعار

---

1. میکائیور۔ ہسٹری آف انڈیا ص ۹۲
2. جان اسٹورٹ مل۔ ہسٹری آف سوشولوجی ۱۰
3. ڈاکٹر راجندر پرشاد۔ انڈیا ڈیوائیڈ ص ۸

اسی بات کی غمازی کرتے ہیں۔

علامہ شبلی اپنی نظموں میں اسی قسم کے جذبات کا اظہار کرتے ہیں کہ جب خلافتِ عثمانیہ پر چاروں طرف سے یلغار ہوئی تو برِ صغیر کے مسلمانوں میں ایک ہیجان کی کیفیت پیدا ہوئی اور شبلی تڑپ کے کہہ اُٹھے۔

کہیں اُڑ کر یہ دامانِ حرم کو بھی نہ چھو آئے
غبارِ کفر کی یہ بے محابا شوخیاں کب تک
حرم کی سمت بھی سید افگنوں کی جب نگاہیں ہیں
تو پھر سمجھو کہ مرغانِ حرم کے آشیاں کب تک
جو ہجرت کر کے بھی جائیں تو شبلی اب کہاں جائیں
کہ اب امن و امان شام و نجد قیرواں کب تک

قوم پرستی کو پہلی جنگِ عظیم کے دوران فروغ حاصل ہوا ہندوستان میں ہندو مسلم قومیں قومیت کے جذبہ سے سرشار ہوئی اور خلافت تحریک میں ایکدوسرے سے مل جل کر برسرِ پیکار ہوئیں۔

تحریکِ عدم تعاون جب پروان چڑھی تو سینکڑوں علماء نے انگریزوں کی فوج میں ملازمت کو ناجائز قرار دیا۔ اور ولائتی سامان کا بائیکاٹ کرنے کے لئے آواز بلند کی بقول ڈاکٹر بی۔آر۔امبیڈکر

"تحریک خلافت اور تحریک ترکِ موالات کا یہ انجام ہوا کہ برِ عظیم میں انگریزوں سے بیزاری کا اقتصادی مقاطعہ سرکاری ملازمتوں اور درس گاہوں سے علحیدگی عام ہوگئی"۔[1]

ڈاکٹر سید عبدالباری نے اپنی کتاب "اردو نظموں میں سیاسی رجحانات کی جھلک" میں لکھا ہے۔

"سودیشی کے رواج کو عام کرنے میں ایک شاعر نے "رندِ قدیم" کے قلمی نام سے مثنوی دہرِ آشوب لکھ کر اس کی تصویر کشی ان الفاظ میں کی ہے[2]

---

[1] ڈاکٹر سید عبدالباری۔اردو نظموں میں سیاسی رجحانات کی جھلکیاں ص ۵۸،۵۹
[2] ایضاً

ملک کی خیر سب مناتے ہیں
زن و مرد ایک راگ گاتے ہیں
بکنے دیتے نہیں بدیشی مال
جی اس سے ہے دشمنوں کا نڈھال

ساتھ ہی یہ بات بھی بتائی گئی ہے کہ عدم تعاون کی تحریک میں مردوں کے شانہ بہ شانہ عورتیں بھی شریک ہوئیں۔

جیل خانے سدھارے جب شوہر
بیبیاں بھی نکل پڑی باہر
لاٹھیاں جسم زار پر کھائیں
دس پٹیں بیس اسکے بعد آئیں

پر نہیں ہوتا بلکہ مشترکہ تجربات قومیت کی تشکیل میں معاون ہوتے ہیں۔ اور مختلف خیال اور مختلف مذہب کے ماننے والے خود کو ایک ایسے مضبوط رشتے میں باندھ لیتے ہیں اور مشترکہ کلچر کو اپناتے ہیں اس کلچر کی رگوں میں اُن کے خیال میں مشترکہ اقتصادی و سیاسی مفاد کا خون دوڑتا رہتا ہے۔

اردو ادب خاص طور سے اردو نظموں میں ہندوستان کے اِسی کلچر و قومیت کے جذبہ کو موضوع بنایا گیا ہے۔ یہی جذبہ جنگِ آزادی میں ہندوستان کو ایک رشتہ میں باندھنے کا وسیلہ بنا۔ اور نظم نگاری قومیت کے اس جذبہ کو بیان کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ درج ذیل شعراء کے اشعار اسی بات کی غمازی کرتے ہیں۔

علامہ شبلی اپنی نظموں میں اسی قسم کے جذبات کا اظہار کرتے ہیں کہ جب خلافتِ عثمانیہ پر چاروں طرف سے یلغار ہوئی تو برِ صغیر کے مسلمانوں میں ایک ہیجان کی کیفیت پیدا ہوئی اور شبلی تڑپ کے کہہ اُٹھے۔

حرم کی سمت بھی سید افگنوں کی جب نگاہیں ہیں
تو پھر سمجھو کہ مرغانِ حرم کے آشیاں کب تک

جو ہجرت کر کے بھی جائیں تو شبلی اب کہاں جائیں
کہ اب امن و امان شام و نجد قیرواں کب تک

قوم پرستی کو پہلی جنگِ عظیم کے دوران فروغ حاصل ہوا ہندوستان میں ہندو مسلم قومیں قومیت کے جذبہ سے سرشار ہوئی اور خلافت تحریک میں ایکدوسرے سے مل جل کر برسرِ پیکار ہوئیں۔

تحریکِ عدم تعاون جب پروان چڑھی تو سینکڑوں علماء نے انگریزوں کی فوج میں ملازمت کو ناجائز قرار دیا۔ اور ولائتی سامان کا بائیکاٹ کرنے کے لئے آواز بلند کی بقول ڈاکٹر بی۔ آر۔ امبیڈکر

"تحریک خلافت اور تحریک ترکِ موالات کا یہ انجام ہوا کہ برِ عظیم میں انگریزوں سے بیزاری کا اقتصادی مقاطعہ سرکاری ملازمتوں اور درس گاہوں سے علحیدگی عام ہوگئی"[1]

ڈاکٹر سید عبدالباری نے اپنی کتاب "اردو نظموں میں سیاسی رجحانات کی جھلک" میں لکھا ہے۔

"سودیشی کے رواج کو عام کرنے میں ایک شاعر نے "رندِ قدیم" کے قلمی نام سے مثنوی دہرِ آشوب لکھ کر اس کی تصویر کشی ان الفاظ میں کی ہے"[2]

ملک کی خیر سب مناتے ہیں
زن و مرد ایک راگ گاتے ہیں
بکنے دیتے نہیں بدیشی مال
جی اس سے ہے دشمنوں کا نڈھال

ساتھ ہی یہ بات بھی بتائی گئی ہے کہ عدم تعاون کی تحریک میں مردوں کے شانہ بہ شانہ عورتیں بھی شریک ہوئیں۔

جیل خانے سدھارے جب شوہر
بیبیاں بھی نکل پڑی باہر

---

1. بی۔ آر امبیڈکر۔
2. قاضی عدیل عباسی۔ تحریک خلافت ص ۳

لاٹھیاں جسم زار پر کھائیں
دس پٹیں ہیں اسکے بعد آئیں

علامہ اقبال تو فرد و قوم کا درد اپنے دل میں ہمیشہ رکھتے تھے قوم پرستی کے جذبات ان کی کئی نظموں میں ملتے ہیں۔ ایک جگہ قوم پرستی کے جذبات سے سرشار ہو کر کہتے ہیں۔

قوموں کی روش سے مجھے ہوتا ہے یہ معلوم
بے سود نہیں روس کی یہ گرمیٔ گفتار
اندیشہ ہوا شوخیٔ انکار پر مجبور
فرسودہ طریقوں سے زمانہ ہوا بیزار

اسی زمانے میں اشتراکیت کے فلسفہ سیکولر سماج کا نعرہ دیا اور اقبال کہہ اٹھے

جس کھیت سے دہقان کو میسر نہ ہو روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلادو

قوم پرستی کے جذبے میں اتحاد و اتفاق کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے کئی شعراء نے انی نظموں میں اس موضوع کو اپنایا ہے۔

ملک ہیں اتفاق سے آزاد
شہر ہیں اتفاق سے آباد
ہند میں اتفاق ہوتا اگر
کھاتے غیروں کی ٹھوکریں کیونکر
قوم جب اتفاق کھو بیٹھی
اپنی پونجی سے ہاتھ دھو بیٹھی

اس طرح شبلی نعمانی نے ''مسلم لیگ'' کے عنوان سے نظم لکھی اور یہ بتانے کی کوشش کی۔ ملک میں قومیت اور قوم پرستی کو نقصان نہ ہونے پائے۔

برادران وطن کہہ رہے ہیں کیا کیا کچھ
کبھی تو آپ بھی افسانہ جفا کہیے

کبھی تو رد و قدح کی بھی کیجئے حرارت
جو بات بات پہ ہر بار مرحبا کہئے
نہ ہو سکے تو اشاروں میں کیجئے اظہار
وگر نہ لطف تو یہ ہے کہ بر ملا کہئے

۱۹۱۷ء میں جنگ بلقان میں انگریزوں نے ترکوں کو برباد کر دیا۔ تو شبلی تڑپ اٹھے اور انہوں نے انگریزوں کے خلاف نظم لکھی جس کا عنوان ہے شہر آشوب اسلام یہ نظم شبلی بلکہ تمام مسلم قوم کے جذبات واحساسات کی ترجمانی ہے چند اشعار درج ذیل ہے۔

کہاں تک لو گے ہم سے انتقام فتح ایوبی
دکھاؤں گے ہمیں جنگ صلیبی کا سماں کب تک
سمجھ کہ یہ کہ دھندلے سے نشان رفتگان ہیں ہم
مٹاؤ گے ہمارا اس طرح نام نشاں کب تک
زوالِ دولت عثمان زوال شرع و ملت ہے
عزیزو! فکر فرزند و عیال و خانماں کب تک

۱۹۱۳ء میں کانپور کی ایک مسجد مچھلی بازار کا واقعہ پیش آیا شاہراہ کی توسیع کے لئے مسجد کا ایک حصہ منہدم کر دیا گیا۔ مسلمانوں نے احتجاج کیا اور بدلے میں انگریزوں کی گولیوں کا نشانہ بنے جس میں جوان، بچے، بوڑھے سبھی نے جام شہادت نوش کیا۔ اس واقعہ کے خلاف بھی علامہ شبلی نے بڑی درد انگیز نظم لکھی جس کا عنوان ''ہم کشت گانِ معرکہ کانپور ہیں'' کہی یہ نظم بھی قوم پرستی کی مثال ہے چند اشعار ملاحظہ ہوں

کل مجھ کو چند لاشہ بیجان نظر پڑے
دیکھا قریب جا کے تو زخموں سے چور ہیں
کچھ طفل خورد سال ہیں جو چپ تو ہیں مگر
بچپن یہ کہہ رہا ہے کہ ہم بے قصور ہیں
آئے تھے اس لئے کہ بنائیں خدا کا گھر
نیند آگئی ہے منتظر نفخ صور ہیں

کچھ نوجوان ہیں بے خبر نشۂ شباب
ظاہر ہیں گرچہ صاحبِ عقل و شعور ہیں
اُٹھتا ہوا شباب یہ کہتا ہے بے دریغ
مجرم کوئی نہیں ہے مگر ہم ضرور ہیں
پوچھا جو میں نے کون ہو تم صدا یہ آئی
ہم کشت گانِ معرکہ کانپور ہیں

قوم پرستی کے جذبہ کو فروغ دینے میں جن شعراء نے نظمیں لکھیں ان میں اکبرالہ آبادی بھی ہیں ان کا انداز گو کہ طنزیہ ہے۔ لیکن قومیت اور خاص کر مسلمانوں کے لئے اپنی تہذیب و تمدن اور اسلامی روایت سے انحراف نہ کرنے کی تلقین کی ہے۔ وہ انگریزی تہذیب کی مخالفت کرتے ہیں اور مسلمانوں کو باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ قوم کو اپنے اسلاف کے کارناموں اور ان کے اخلاق کو اپنانا چاہیے۔

یہیں کہ پیدا یہیں کے رنگ اور یہیں کی بولی یہیں کا کھانا
تو پھر تفاوت ہو کیوں سروں میں گیت کو بہتر ہے گانا
جو باہمی بحث ہو تو باہم اس پہ قال و قول کرلیں
جو فیصلہ ہو قبول کرلیں جو خار بھی ہو تو پھول کرلیں

انگریزی حکومت کی طرف سے ہندوستانیوں پر طرح طرح کی پابندیاں تھیں۔ ہندوستانی قوم کی بے بسی و بے کسی پر اکبر نے ایک تضمین لکھی۔ جو قوم پرستی کی بہترین مثال کہی جاسکتی ہے۔ چند اشعار پیش ہیں۔

دل گرانی مراحل کبھی ایسی تو نہ تھی
تند موج لب ساحل بھی ایسی تو نہ تھی
بد گمانی تیری قاتل کبھی ایسی تو نہ تھی
جیسی اب ہے تیری محفل کبھی ایسی تو نہ تھی

مہاتما گاندھی کی تحریک ترکِ موالات سے گو کہ اکبر اتفاق نہیں رکھتے تھے لیکن پھر بھی گاندھی جی اور ان کے قومی جذبہ سے متاثر ضروری تھے۔ انہوں نے اپنی نظم میں گاندھی جی کے

اس قوم پرستی کے جذبہ پر نظم لکھی چند اشعار

لشکر گاندھی کو ہتھیاروں کی کچھ حاجت نہیں
ہاں مگر بے انتہا صبر و قناعت چاہیے
گاندھی کے ساتھیوں میں جو ہیں وہ نیک ہی ہیں
مہراج و مہاجر یہ صرف ایک ہی نہیں
سر گاندھی کو اڑانے سے گورنمنٹ ڈری
شور ہر سمت سے اٹھے گا کہ آندھی آندھی
اور یہ اشعار بھی گاندھی جی کی عظمت کے امین ہیں
بدھومیاں بھی حضرتِ گاندھی کے ساتھ ہیں
گومشتِ خاک ہیں مگر آندھی کے ساتھ ہیں
جنابِ شیخ نے داڑھی بڑھائی سن کی سی
مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی

اردو نظم نگاری کے ارتقاء میں چکبست اپنے منفرد مزاج کے مالک ہیں۔ہندوستان کی سماجی، سیاسی اور معاشرتی زندگی اور قدیم تہذیب پر بھی انہوں نے نظمیں کہی ہیں۔اور ساتھ ہی قوم پرستی کے جذبہ سے سرشار نغمے بھی گائے ہیں۔قومیت کے جذبے سے سرشار ان کے چند اشعار ملاحظہ ہوں

اے صور حب قومی اس خواب سے جگادے
بھولا ہوا افسانہ کانوں کو پھر سنادے
مردہ طبیعتوں کی افسردگی مٹادے
اُٹھتے ہوئے شرارے اس راکھ سے دکھادے
حُبِّ وطن سمائے آنکھوں میں نور ہوکر
سرمیں خمار ہوکر دل میں سرور ہوکر

(حب وطن)

''یافریادِقوم''نظم کے یہ اشعار

مِٹا جو نام تو دولت کی جستجو کیا ہے
نثار ہو نہ وطن پر تو آبر و کیا ہے
لگادے آگ دل میں تو آرزو کیا ہے
نہ جوش کھائے جو غربت میں وہ لہو کیا ہے
فِدا وطن پہ جو ہو آدمی دلیر ہے وہ
جو یہ نہیں تو فقط ہڈیوں کا ڈھیر ہے وہ

۱۹۱۴ء میں پہلی جنگِ عظیم کے موقع پر چکبستؔ نے ہندوستانی سپاہیوں کو الوداع کہا جو قوم پرستی کے مثال ہیں۔ کچھ اشعار اس طرح ہیں۔

ساحلِ ہند سے جرارر وطن جاتے ہیں
کچھ نئی شان سے جانباز کہن جاتے ہیں
ان میں باندھے ہوئے شمشیر و کفن جاتے ہیں

چکبستؔ کی ایک اور نظم ''آوازہ قوم'' ہے جس میں انہوں نے ہوم رول کا نعرہ دیا۔ جو قوم پرستی کے جذبہ سے معمور ہے۔ چند اشعار

یہ خاکِ ہند سے پیدا ہیں جو کہ آثار
ہمالیہ سے اُٹھے جیسے ابر دریا بار
لہورگوں میں دکھا تا ہے برق کی رفتار
ہوتی ہے خاک کے پردے میں ہڈیاں بیدار
زمین سے عرش تلک شور ہوم رول کا ہے
شباب قوم کا ہے زور ہوم رول کا ہے

اینی بیسنٹ کو جب گرفتا کیا گیا تو انھوں نے اینی بیسنٹ کی خدمت میں ''قوم کا پیغام'' نامی نظم لکھی۔ جس میں برج نرائن چکبستؔ کی قوم پرستی عیاں ہوتی ہے۔ اس نظم کے چند اشعار مثال کے لئے پیش ہیں۔

قوم غافل نہیں مانا تیری غمخواری سے
زلزلہ ملک میں ہے تیری گرفتاری سے

آگ بھڑکی ہے تیری آہ کی چنگاری سے
خاک حاصل نہ ہوا تیری دل آزادی سے
دل ترا قوم کے دامن میں دیئے جاتے ہیں
ہڈیوں کو گرمی زنداں میں لئے جاتے ہیں

اردو نظم نگاری میں انجمن پنجاب نے ایک اہم رول ادا کیا ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ انجمن پنجاب کے مشاعرے منعقد نہ ہوتے تو اقبالؔ جیسا شاعر اردو کو کبھی نصیب نہ ہوتا۔ اردو نظم نگاری میں اقبال کی اپنی علحیدہ شناخت ہے۔ ان کی نظموں مین قوم پرستی کا جذبہ نمایاں ہے۔

قوم کے لئے ان کے احساسات و جذبات کی شدت ان کی نظم ''جذبہ حریت'' میں دکھائی دیتی چند اشعار اس نظم سے حاضر ہے

ہویدا آج اپنے زخم پنہاں کر کے چھوڑوں گا
لہو رورو کے محفل کو گلستاں کر کے چھوڑوں گا
دکھا دونگا میں اے ہندوستان رنگِ و فاسب کو

جب جلیان والا باغ کا حادثہ پیش آیا تو اقبالؔ اس سے بے حد متاثر ہوئے انہوں نے اپنی اس اضطرابی کیفیت کو جو قوم پرستی کی مثال ہے ان اشعار میں کچھ اس طرح بیان کی ہے۔

ہر ڈائر چمن سے یہ کہتی ہے خاک باغ
غافل نہ رہ جہاں میں گردوں کی چال سے
سینچا گیا ہے خون شہید اں سے اس کا تخم
تو آنسوؤں کا بخل نہ کر اس نہاں سے

اقبالؔ نے اپنی قوم و ملت کی حالت زار پر خون کے آنسو بہائے اور اس قوم کو نئی بلندیاں عطا کرنے کا ہنر بھی بتایا۔ ان ان کی قوم پرستی اپنے آپ میں مسلمانوں کے عروج وزوال کی داستان بھی ہے اور حال کا نوحہ بھی۔

اقبالؔ ترکوں اور عربوں کے باہمی ٹکراؤں کے اسباب اور نتائج سے آگاہ تھے اور بے حد متفکر۔ شریف مکہ کی ملّی غداری کا ذکر انہوں نے کچھ اس طرح کیا ہے۔

بیچتا ہے ہاشمی ناموس دین مصطفیٰ
خاک و خون میں مل رہا ہے ترکمان سخت کوش
ہوگئی رسوا زمانے میں کلاہ لالہ رنگ
جو سراپا ناز تھے ہیں آج مجبور نیاز

اقبالؔ ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کے قائل تھے اور وہ مذہب کی بنیاد پر ہندو مسلم، سکھ، عیسائی کی تفریق کو مٹا دینا چاہتے تھے۔ اور صحیح معنوں میں قوم پرستی کی اس سے بڑی مثال شاعری میں اور کوئی نہیں ملتی۔ انہوں نے اپنی نظم نیا شوالہ میں اس قوم پرستی کو اجاگر کیا ہے چند اشعار اس نظم کے درج ذیل ہے۔

ہر صبح اُٹھ کے گائیں منتر وہ میٹھے میٹھے
سارے پجاریوں کو مئے پیت کی پلادیں
شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

اقبالؔ فرقہ پرستی اور قوم پرستی کو قومی اتحاد کے لئے خطرہ سمجھتے تھے ان کے نزدیک قوم پرستی کو سب سے زیادہ نقصان تعصب سے ہوتا ہے۔ اپنی نظم ''سرسیّد کی لوحِ تربت پر'' کے عنوان سے لکھی جس میں انہی خیالات کی ترجمانی کی گئی ہے۔ چند اشعار اس نظم کے درج ذیل ہیں۔

وانہ کرنا فرقہ بندی کے لئے اپنی زبان
چھپ کے ہے بیٹھا ہوا ہنگامہ حشر یہاں
وصل کے اسباب پیدا ہوں تری تحریر سے
دیکھ کوئی دل نہ دکھ جائے تری تقریر سے
محفل نو میں پرانی داستانوں کو نہ چھیڑ
رنگ پہ جواب نہ آئیں ان فسانوں کو نہ چھیڑ

معاشرے و ماحول سے تہذیب و ثقافت متاثر ہوتی ہے اور صحت مند معاشرہ کی تعمیر ایک کامیاب ملک کے لئے ضروری ہے۔ معاشرے کی صحت مندی کے لئے قوم پرستی اور قوم پروری کے جذبہ کا فروغ پانا انتہائی اہم ہے۔ ''جاوید کے نام'' اس نظم کے ذریعہ اقبالؔ یہی پیغام

دے رہے ہیں۔

ہوئی نہ زاغ میں پیدا بلند پروازی
خراب کر گئی شاہین بچے کو صحبت زاغ
حیا نہیں ہے زمانے کی آنکھ میں باقی
خدا کرے کہ جوانی تری رہے بے داغ

قوم پرستی کے جذبہ کو پروان چڑھانے میں جوشؔ ملیح آبادی بھی ایک اہم شاعری کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ انہوں نے اپنی نظموں میں قوم پرستی کے جذبہ کو ابھارا ہے۔ اس ضمن میں چند اشعار ہیں۔

کس زباں سے کہہ رہے ہو آج تم سوداگرو
دہر میں انسانیت کے نام کو اونچا کرو
جس کو سب کہتے ہیں ہٹلر بھیڑیا ہے بھیڑیا
باغ انسانی میں جلنے کو ہے بادِ خزاں
آدمیت لے رہی ہے ہچکیوں پر ہچکیاں

۱۹۳۰ء میں جب کانپور میں فساد ہوا ہندوستانیوں کو آزادی کی فکر کرنے کی بجائے آپسی جھگڑوں میں مبتلا دیکھ کر جوشؔ نے تلخ لہجہ میں ایک نظم ''مقتل کانپور'' لکھی جو قومیت اور قوم پرستی کے لئے اہم گردانی جاسکتی ہے۔ اس نظم کے اشعار درج ذیل ہیں۔

اے سیّد او بے حیا وحشی کمینے بدگمان
اے جبین ارض کے داغ اے ہندوستان
تجھ پہ لعنت اے فرنگی کے غلام بے شعور
یہ فضائے صلح پرور یہ قتال کانپور
تیری جانب اٹھ رہی ہے دیکھ دوزخ کی نگاہ
سبحہ و زنار میں جکڑے ہوئے دیو سیاہ
تو ابھر تے ہی زمانے کی نظر سے گرگیا
یوں بہایا خون امیدوں پہ پانی پھر گیا

رکھنے والا ہی ہے آزادی کا جاں پرور جہاد
اے فرنگ شادماں باش اے غلامی زندہ باد

فرقہ پسندی درحقیقت قوم پروری میں رکاوٹ پیدا کرتی ہے۔ اور اس دور کی سماجی حالات اس طرح کی فرقہ بندی کے لئے موزوں ومناسب نہیں تھے۔ کیونکہ آزادی حاصل کرنا اس وقت کا پہلا مقصد تھا۔ اس بات کو ''بھوکا ہندوستان'' اس نظم میں جوشؔ نے بیان کیا ہے کہتے ہیں۔

آہ اے ہندوستان اے مفلسوں کی سرزمین
اس زمیں پہ کوئی تیرا پوچھنے والا نہیں
آہ اک دل بھی ترے افلاس پر ہلتا نہیں
اب تو اک روٹی کا ٹکڑا بھی تجھے ملتا نہیں
ہندو مسلم نہیں اٹھتے تری امداد پر
تُف ہے ایسی بے حمیت ناخلف اولاد پر
ہائے کیا کرنا تھا اُن کو اور کیا کرتے ہیں یہ
گانے اور بجانے پہ لڑنے کے لئے مرتے ہیں یہ
اس طرح ہے خوبیٔ قسمت سے باجا اور گانے
جس طرح افلاس کے مارے ہوؤں کی ہائے ہائے

(بھوکا ہندوستان)

جوشؔ نے اپنی قوم کو مذہبی منافرت اور آپسی جھگڑوں سے دور رہنے کی تلقین کی ہے وہ یہ بات مان کر چلتے ہیں کہ سچی قوم پرستی ہندوستان کی مختلف قوموں میں یکجہتی میں ہی مضمر ہے مثلاً اپنی نظم ''آدمی دے اے خدا'' میں انہوں نے بیان کیا ہے۔

اے خدا ہم کو نزاع کفر و ایمان سے بچا
اپنے ہندو سے بچا اپنے مسلماں سے بچا
الغرض میرے وطن کو زندگی دے اے خدا
آدمی دے آدمی دے اے خدا

(آدمی دے اے خدا)

جوشؔ کی نظم ''دین آدمیت'' بھی قوم پرستی پر مبنی ایک اہم نظم ہے چند اشعار ملاحظہ ہوں

یہ مسلماں اور یہ ہندو مسیحی وہ یہود
اس پہ یہ پابندیاں ہیں اور اس پر یہ قیود
شیخ و پنڈت نے بھی کیا احمق بنایا ہے ہمیں
چھوٹے چھوٹے تنگ خانوں میں بٹھایا ہے ہمیں

(دین آدمیت)

صفیؔ لکھنوی نے اپنی نظموں میں واضح طور پر قومیت کا تصور پیش کیا ہے۔ اشعار ملاحظہ ہوں۔

قوم سُنیئے نام ہے مجموعۂ افراد کا
جس میں ہو کچھ مادہ امداد و استمداد کا
کام کرنا کامل کے ناممکن نہیں اضداد کا
دیکھ لیجئے کارخانہ عالم اضداد کا
امتزاج چار عناصر آب و آتش خاک و باد
خود بتاتا ہے کہ ہے منشائے ہستی اتحاد

قوم پرستی کے جذبہ سے سرشار علی سردار جعفری نے بھی نظمیں لکھیں ہیں۔ مثلاً

جب ابھرتا ہے افق سے زندگی کا آفتاب
جب نکھرتا ہے لہو کی آگ میں تپ کر شباب
نسل قومیت کلیسا سلطنت تہذیب و رنگ
صبح کے زرین تبسم میں عیاں ہوتی ہوں میں
رخصت عرش بریں سے پرفشاں ہوتی ہوں میں

ساحر لدھیانوی نے بھی قومی جذبے کو فروغ دینے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے ان کی نظم ''بنگال'' اس کی نمائندگی کرتی ہے۔

جہاں کہنہ کے مفلوج فلسفہ والو
نظام نو کے تقاضے سلام کرتے ہیں

پچاس لاکھ فسردہ گلے سڑے ڈھانچے
نظام زر کے خلاف احتجاج کرتے ہیں
خموش ہونٹوں سے دم توڑتی نگاہوں سے
بشر بشر کے خلاف احتجاج کرتے ہیں

قوم پرستی کے جذبہ کو اردو نظم نگاری میں کافی زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔اور مذکورہ شعراء حضرات کے علاوہ بھی کئی شعراء اس جذبہ سے سرشار ہیں۔اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ قوم پرستی اردو نظم نگاری کا ایک اہم موضوع ہے۔

☆ انسان دوستی

دنیا کے تمام مذہب نے اپنے نظام فکر و عمل میں جس چیز کو مرکزی اہمیت دی ہے وہ انسان ہے۔انسان کی عظمت واحترام محبت واخوت اور آپسی بھائی چارگی نے ہی انسانیت کو بلند مرتبہ حاصل کرنے میں مدد کی ہے۔دنیا کا کوئی مذہب ایسا نہیں جو انسان دوستی کا درس نہ دیتا ہو۔ انسان دوستی کو ہی Humanism کہا جاتا ہے۔اور اس کی تعریف ڈکشنری آف فلاسفی میں کچھ اس طرح درج ہے۔

> ''ہومنزم Humanism خیالات کا وہ نظام ہے جو آدمی کی عظمت اور اس کے حقوق کے احترام پر استوار ہے۔انسان شخصیت کی قدر و قیمت اس کی خوشحالی اس کے ہمہ جہت ارتقاء اور اس کی سماجی زندگی کے لئے مناسب و موزوں احوال کے تشکیل کا مطمع نظر ہے''[1]

انسان دوستی کی تشریح انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا میں ان الفاظ میں درج کی گئی ہے۔

> ''کسی بھی ایسے نظام فکر و عمل پر ہیومنزم کا اطلاق ہوگا جو مجرد و مافوق الفطرت کے بالمقابل انسان کے معاملات میں گہری دلچسپی کا مظاہرہ کرتا ہے''[2]

انسان دوستی یا انسانی محبت واخوت کو اسلامی تعلیم میں اوّل سے آخر تک نہایت اہمیت

---

[1] ڈکشنری آف فلاسفی ۱۷۸

[2] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا ص ۸۷۶

دی گئی ہے۔ اسلام کی رو سے کوئی انسان بلند مقام پر اس وقت تک نہیں پہونچ سکتا جب تک کہ اس کے اندر انسانی محبت وانسانی ہمدردی کا جذبہ نہ ہو۔

اردو شاعری میں انسان دوستی کی مثالیں جا بجا ملتی ہیں۔ چاہے امیر خسؔرو یا قلی قطب شاہ۔ میرؔ ہوں یا غالبؔ اردو شاعری کے تمام اہم شعراء نے انسان دوستی کو اپنے کلام کا موضوع بنایا ہے۔

اسی روایت کو جدید اردو نظم نے بھی اپنایا چونکہ ہندوستان مختلف مذاہب کے ماننے والوں اور مختلف عقائد کے لوگوں کی آماجگاہ ہے۔ اس لئے انسان دوستی کا جذبہ یہاں زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔

جدید اردو نظم کا بغور مطالعہ کیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ جدید اردو نظم کے امام الطاف حسین حالؔی کی نظموں میں انسان دوستی کی قدریں جا بجا ملتی ہے اور حالؔی ایک انسان دوست شاعر کے روپ میں جلوہ گر ہوتے ہے۔ حالؔی کے بارے میں رشید احمد صدیقی رقمطراز ہیں۔

> ”تہذیب و تاریخ کا پورا سواد اعظم حالؔی نے اپنی آنکھوں کے سامنے مسمار ہوتے ہوئے دیکھا۔ اور اس کھنڈر پر حالؔی بے پایاں انسانی ہمدردی، دردمندی اور غیرتِ قومی کے ساتھ کھڑے اپنے ساتھیوں کی غفلت اور خفیف الحرکاتی پر آنسو بہاتے ہیں۔“[1]

حُبِ وطن نامی نظم میں حالؔی نے انسان دوستی کو کچھ اسطرح بیان کیا ہے

بیٹھے بے فکر کیا ہو ہم وطنو! — اٹھو اہلِ وطن کے دوست بنو
مرد ہو تو کسی کے کام آؤ — ورنہ کھاؤ پیو چلے جاؤ
جب کوئی زندگی کا لطف اٹھاؤ — دل کو دکھ بھائیوں کے یاد دلاؤ
پہنو جب کوئی عمدہ پوشاک — کرو دامن سے تا گریباں چاک
کھانا کھاؤ تو جی میں شرماؤ — ٹھنڈا پانی پیو تو اشک بہاؤ
کتنے بھائی تمہارے ہیں نادار — زندگی سے ہے جن کا دل بیزار
جاگنے والو غافلو کو جگاؤ — تیرنے والوں ڈوبتوں کو تیراؤ
ہیں ملے تم کو چشم و گوش اگر — لو، جو لی جائے کو رو گر کی خبر

---

[1] فکر ونظر۔ علی گڑھ ۱۹۵۴ء ص ۲۰۰

تم اگر ہاتھ پانو رکھتے ہو لنگڑے لولوں کو کچھ سہارا دو

(حبّ وطن)

اردو نظموں میں انسان دوستی کے جذبہ کو بیان کرنے والوں میں ایک نام اسمٰعیل میرٹھی کا بھی ہے انہوں نے اپنی نظم ''مشعر کیفیت اکبر آباد موسوم بہ آثار سلف'' کے عنوان سے لکھی جو تقریباً ۷ بندوں پر مشتمل ہے اس کا ایک بند جس میں انھوں نے انسان دوستی کو کچھ اس انداز مین بیان کیا ہے۔ جو نوجوانوں سے متعلق ہے۔

ہے قوم اگر باغ تو تم اس کے شجر ہو ہے قوم اگر نخل تو تم اس کے ثمر ہو
ہے قوم اگر آنکھ تو نور بصر ہو ہے قوم اگر چرخ تو تم شمس و قمر ہو
ہے قوم اگر کان تو تم لعل و گہر ہو نظارگی ہے قوم تو تم حدِ نظر ہو
موسیٰ! بنو اور قوم کو ذلت سے بچاؤ
گو سایہ غفلت کی پرستش سے چھڑاؤ

انسان دوستی اور عظمت سے متعلق پنڈت برج نرائن چکبست نے بھی اپنی نظم ''مرقع عبرت'' میں ذکر کیا ہے۔ اس نظم میں مختلف عنوانات کے تحت طبع آزمائی کی ہے۔ اس نظم میں ''تنبیہ'' کے عنوان سے دوسرے بند میں انسان کی صفات سے متعلق کچھ اس طرح رقمطراز ہیں۔

ہاں ابر کرم سے چمن قوم ہو شاداب واللہ یہی حسن شرافت کا ہے آداب
حیوان بھی یوں رکھتے ہیں سب شغل خور و خواب تہذیب کا آئین ہے دل سوزی احباب
محرم اسی خلق سے حیوان ہوا ہے
انسان اسی بات سے انسان ہوا ہے
(تنبیہ)

منشی دوار کا پرشاد افق نے بھی اپنی نظم ''درس عمل'' میں انسان بننے کے لئے علم و عمل کو اہم گردانا ہے کہتے ہیں۔

کنجی یہ علم ہے در امن و پناہ کی سانچہ ہے جس میں ڈھلتی ہے شکلیں رفاہ کی
آلہ یہ کل بناتا ہے توسیع جاں کی کھو تا ہے فکر منتر یہ قومِ تباہ کی
انسان امیر جس سے ہو یہ کیمیاء ہے وہ
پھونکے جو دل میں روح طرب سیمیا ہے وہ

ہندوستان ایک ایسا ملک ہے جہاں ہر مذہب وملّت کے لوگ بستے ہیں ساتھ ہی یہ امن کا گہوارہ بھی ہے جہاں انسان انسان کے لئے ہر لمحہ مدد کو تیار رہتا ہے۔ ہندوستان کی عظمت اسی بات میں پوشیدہ ہے کہ یہاں کا ہر فرد انسانیت کے اوصاف کو اپنے آپ میں سموئے ہوئے ہے۔ برج نرائن دتاتریہ کیفؔی نے اپنی نظم ''بھارت درپن'' میں اس بات کو کچھ اسطرح بیان کیا ہے۔

وہ دنیا میں گھر اولیں آدمی کا ـــــ وہ مولا وہ منشا منش و انتی کا
سببِ نوع انسان کی برتری کا ـــــ وہ ملجا وَ ماوا جہاں میں سبھی کا
کہاں ہے وہ انسان کا مخزن کہاں ہے
وہ ہے آریہ ورت ہندوستان ہے

آگے پھر ایک بند میں اس طرح کہتے ہیں۔

سبق یہ ملا تھا کتابِ خدا کا ـــــ یہی حکم تھا مالک دوسرا کا
سب انسان کنبہ ہیں پر ماتما کا ـــــ نہ تھا بھید کچھ آتما آتما کا
خدا سے خدا ہم نہ سمجھے خدائی
ہر انسان کو سمجھتے تھے بھائی

انسان دوستی عظمت انسان کی طرفدار دور میں علامہ اقبؔال کسی سے پیچھے نہیں یہ بات تو جانتے ہیں کہ آئی فلسفہ کے مطابق انسان کو خلاصہ کائنات کہا گیا ہے اس کی مادّی ہستی آغاز کار سے ابتک طویل مدّت پر پھیلی ہوئی ہے۔ لیکن انسان کے مرتبے اور مقام کا تعین اس کی فطانت کے لافانی جواہر اور اس کی صلاحیتوں کے بے پناہ امکانات کی وجہ سے ہے اقبؔال نے مثالی انسان کی شبیہ کو اپنی نظم ''والدہ محترمہ کی یاد میں'' اس طرح پیش کی ہے۔

پھر یہ انسان آں سوئے افلاک ہے جس کی نظر
قدسیوں سے بھی مقاصد میں ہے جو پاکیزہ تر
جو مثالِ شمع روشن محفل قدرت میں ہے
آسماں اک نقطہ جسکی وسعت فطرت میں ہے
جس کی نادانی صداقت کے لئے بے تاب ہے
جس کا ناخن ساز ہستی کے لئے مضراب ہے

اردو نظم میں انسان دوستی اور انسانی جذبہ کی نمائندگی موثر انداز میں موجود ہے اور ہر دور کے اردو شاعروں نے اپنے کلام میں امن عظیم رویہ کا شامل کر کے شاعروں کے وقار کو بلند کیا ہے۔

☆ ترقی پسند تحریک اور اردو نظم

سنہ ۱۹۳۶ء کے آس پاس جو جدید شعری رجحانات سامنے آئے انھیں ترقی پسند شاعری کہا جانے لگا۔ ترقی پسند شاعری اپنے مزاج کے اعتبار سے انقلابی اور باغیانہ شاعری کہی جاسکتی ہے۔ کیونکہ اس دور کی شاعری میں سماج کے روائتی فرسودہ نظام اور اقدار سے انحراف پر خصوصی توجہ کی گئی تھی۔ اسی لئے اس تحریک سے جُڑا ہوا ہر شاعر و ادیب فرسودہ نظام اور اقدار سے اپنی بے اطمینانی کا اظہار کرتا تھا۔ اور خود کو ترقی پسند قرار دینے پر فخر کرتا تھا۔

ترقی پسند تحریک کی وجہ سے ادب میں نئے انداز فکر کا آغاز ہوا جسکا مقصد زندگی کو نئی معنویت سے ہمکنار کرنا تھا۔ جو کچھ تو اندرون ملک کے حالات کا نتیجہ تھا اور کچھ پہلی جنگِ عظیم کے بعد کی صورتِ حال کا۔ لیکن سب سے زیادہ جدید تعلیم کے اثرات تھے جس نے ملک کے نوجوان طبقہ کو زندگی کا نیا شعور اور نئی آگہی بخشی تھی۔

علی گڑھ یونیورسٹی میں کئی ایسے نوجوان تعلیم پا رہے تھے جو اس تحریک کے اولین علم برداروں میں شمار ہوئے۔ بدلتے حالات اور نئی تعلیم کی روشنی میں زندگی کو نئے روایے سے دیکھنے اور سمجھنے کا آغاز ہوا۔ زندگی کے روائتی تصورات سے زیادہ حقیقی اور بامعنی کو اپنانے کا رجحان بڑھنے لگا۔ اور یہی وجہ تھی کہ جب ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوا تو نوجوان طالبِ علموں نے تحریک سے اتفاق کرتے ہوئے پرانے سماجی نظام کے خلاف بغاوت کر دی لیکن یہ بات بھی سچ ہے کہ یہ تحریک بنیادی طور پر سیاسی اور معاشرتی تحریک تھی۔ جس کے لئے ادب کو آلہ کار کے طور پر استعمال کیا گیا۔ یہیں سے ترقی پسند شاعری کی ابتداء کے آثار نمودار ہوتے ہیں

''نیا ادب'' کے پہلے شمارے میں اداریہ لکھتے ہوئے پسندی کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے۔

> ''ہمارے نزدیک ترقی پسند ادب وہ ہے جو زندگی کی حقیقتوں پر نظر رکھے۔ ان کا پرتو، ان کی چھان بین کرتا ہوا اور ایک نئی اور زندگی کا رہبر۔ لیکن وہ صرف زندگی

کی ہلچل اور پہچان کا ہی نقیب اور فیض شناس نہیں ہوتا وہ صرف سطح پر کروٹیں لینے والی موجوں کے ہی ساتھ نہیں بہتا بلکہ زندگی کی گہرائیوں میں جا کر ان خاموش اور میٹھے دھاروں سے سیراب ہوتا ہے۔ جو سطح سے نیچے بہتے رہتے ہیں۔"[1]

تحریک کے آغاز میں وہ شاعر ترقی پسند تھا۔ جو معاشرتی اور انفرادی زندگی میں تبدیل کا آرزومند تھا۔ جو اپنے دور کی ترجمانی نئے شعور کی روشنی میں کرتا تھا۔ اس میں وہ شعراء بھی شامل سمجھے جاتے تھے۔ جو فرائڈ سے متاثر تھے اور جن کی شاعری میں اجتماعی مسائل سے زیادہ فرد کی داخلی کشمکش کے اظہار پر زور دیا تھا۔ لیکن وہ بھی اس صورتِ حال کی ذمہ داری روایتی معاشرتی ڈھانچہ اور فرسودہ اخلاقی نظام پر ڈالتے تھے اور اس نظام کو بدلنا چاہتے تھے لیکن جب ترقی پسند تحریک پر اشتراکیت کی گرفت مضبوط ہوگئی تو وہاں ترقی پسند شاعر کہلائے جو سماجی اور تاریخی تصور یقین رکھتے تھے۔ ترقی پسند شاعروں کی فہرست کافی طویل ہو سکتی ہے لیکن جو اہم شعراء ہیں ان میں مجازؔ، فیض، مخدوم، سردار جعفری، کیفی اعظمی، جاں نثار اختر اور ساحر لدھیانوی وغیرہ۔

☆ ترقی پسند شعری موضوعات:

ترقی پسند شاعروں کا پسندیدہ موضوعات قومی اہمیت کے مسائل ہیں۔ ترقی پسند شاعری اساسی طور پر نظریاتی شاعری ہے چنانچہ یہ لازم ہو جاتا ہے۔ کہ اُسی نظریہ کی روشنی میں ان مسائل کو دیکھا جائے اگر ترقی پسند نظریات کے مطابق غور کیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ ۱۹۳۶ء سے دوسری جنگِ عظیم تک ترقی پسند موضوعات آزادی، جمہوریت اور دبے کچلے افراد مثلاً مزدوروں اور کسانوں کے مسائل تھے جنگِ عظیم کے دوران دو مزید موضوعات شامل ہوئے۔

ا۔ امن ۲۔ انسان دوستی

ترقی پسند شاعروں کے عام موضوعات کو نظموں کے عنوانات سے بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ مثلاً وطن، لمحہ آزادی، آثارِ انقلاب، (جوش ملیح آبادی) جنگ، مشرق، آزادی وطن، باغی، جہان نو انقلاب وغیرہ سرمایہ داری، خواب سحر، انقلاب، پردہ وغیرہ (مجاز) جنگ اور انقلاب، آزادی صبح، فردا، امن کا ستارہ وغیرہ (سردار جعفری) قومی حکمراں، خانہ جنگی، قومی اقدار، لال جھنڈا، یلغار آزادی، (کیفی اعظمی) اتحاد، بیدار ہے انسان، امن نامہ وغیرہ (جاں نثار اختر)

---

[1] بحوالہ خلیل الرحمن اعظمی۔ اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک۔ ص ۵۹

اس کے علاوہ ایک اور اہم موضوع وقتی اور ہنگامی واقعات سے بھی مربوط ہے۔

ترقی پسند شاعروں کے لئے یہ بات ضروری سمجھی جاتی ہے کہ شاعری معاصر زندگی سے تعلق رکھے اور ان واقعات و حادثات کو بھی شعری موضوع بنائے جو عوامی زندگی کو مثبت یا منفی انداز میں متاثر کرتے ہے۔ اور اسی بات کے تحت ترقی پسند ادیبوں نے ہنگامی موضوعات پر شاعری اور فکشن بھی لکھا۔ اب کوئی بھی ملکی غیر ملکی حادثہ جو ملک کو براہ راست یا بالواسطہ متاثر کرسکتا تھا۔ ترقی پسند شاعر اُسے موضوع بناتے تھے مثال کے طور پر گاندھی اور جناح کی ملاقات، فتح برلن وغیرہ ان کی شاعری کے موضوعات تھے۔ کیفی اعظمی سردارؔ جعفری نے بھی جیل میں ایک دوست کی موت کی خبر سن کر یوم اقبال پر اقبال۔ یوم غالب پر غالب۔ انقلاب روس اسٹالن وغیرہ پر نظمیں لکھیں

ان ہنگامی موضوعات کے ساتھ ساتھ رہنے والے ایسے مسائل بھی شاعری کا موضوع بنے جن کا تعلق معاشرے کے گھناؤنے حقائق سے تھا مثلاً طوائف، امیروں کی عیاشیاں، غریبوں کی بیماریاں وغیرہ۔

اس طرح کے موضوعات جذبیؔ کی نظم طوائف اور ساحر کی نظم چکلے، میں نمایاں ہیں۔ ترقی پسند نظموں کے انتخاب سے متعلق عقیل احمد صدیقی رقمطراز ہیں۔

> "موضوعات کے انتخاب میں یہ اصول کارفرما ہے کہ شاعر کو اپنے داخلی اور ذاتی احساسات و مسائل اور ذاتی خوشیوں اور غموں سے بلند ہو کر عام انسان برادری کی خوشحالی اور مسرت کی بات کرنی چاہئے یعنی دوسرے لفظوں میں شاعر کو چاہئے کہ وہ خارجی زندگی کے مسائل کو اپنا موضوع بنائے"[1]

ترقی پسند ادیبوں نے اس روشنی میں جب عام انسانوں کی زندگی اور باہمی رشتوں کا مطالعہ کیا تو انہیں زندگی طبقات میں بٹی محسوس ہوئی۔ ایک طرف سرمایہ دار و جاگیرداروں کا طبقہ تھا جو ذرائع پیداوار کے سارے وسائل پر قابض تھا۔ دوسری طرف مزدور اور کسانوں پر مشتمل طبقہ تھا۔ جسے حصول معاش کے لئے سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کا استحصال برداشت کرنا پڑتا تھا۔ ترقی پسند شاعروں نے اس صورتحال کے لئے سماج کے روائتی فرسودہ اقدار کو ذمہ دار مانا اور اس نظام اقدار سے

---

[1] عقیل احمد صدیقی۔ جدید اُردو نظم نظریہ اور عمل ص۔ ۸۱

بغاوت کرتے ہوئے اپنے قلم کے ذریعہ بیداری پیدا کرنے کی کوشش کی اور سماج کے مظلوم طبقہ کو متحد ہوکر اپنے حقوق کی فیض یابی کے لئے اٹھ کھڑے ہونے کی تلقین کی چند مثالیں درج ذیل ہیں۔

بڑھ رہے ہیں دیکھ وہ مزدور در آتے ہوئے
اک جنوان انگیز لے میں جانے کیا گاتے ہوئے
سرکشی کی تند آندھی دم بدم بڑھتی ہوئی
بھوک کے مارے ہوئے انسان کی فریاد کے ساتھ
فاقہ مستوں کے جلو میں خانہ بربادوں کے ساتھ
ختم ہوجائیگا یہ سرمایہ داری کا نظام
رنگ لانے کو ہے مزدوروں کا جوشِ انتقام

(نظم انقلاب۔ مجاز)

ان گنت صدیوں کے تاریک بہمانہ طلسم
ریشم واطلس و کمخواب میں بنوائے ہوئے
جابجا بکتے ہوئے کوچہ و بازار میں جسم
خاک میں لتھڑے ہوئے خون میں نہائے ہوئے
جسم نکلے ہوئے امراض کے تنوروں سے
پیپ بہتی ہوئی گلتے ہوئے ناسوروں سے

(مجھ سے پہلی سے محبت میرے محبوب نہ مانگ۔ فیضؔ)

عرش کی آڑ میں انسان بہت کھیل چکا
خود انسان سے حیوان بہت کھیل چکا
مورِ بے جان سے سلیمان بہت کھیل چکا
وقت ہے دو عالم کو دگر گوں کردیں
قلب گیتی میں تباہی کے شرارے بھردیں
نالہ بے اثر اللہ کے بندوں کے لئے
صلہ داروامن حق کے رسولوں کے لئے

قصر شداد کے در بند ہیں بھولوں کے لئے
پھونک دو قیصر کو کسریٰ کا تماشہ ہے یہی
زندگی چھین لو دنیا سے جو دنیا ہے یہی
(موت کا گیت۔ مخدوم محی الدین)

شاہراہوں میں گلی کوچوں میں انسانوں کی بھیڑ
ان کے مصروف قدم
ان کے ماتھے پہ تردّد کے نقوش
ان کی آنکھوں میں غم دوش اور اندیشۂ فردا کا خیال
سینکڑوں لاکھوں عوام
سینکڑوں لاکھوں عوام
سینکڑوں دھڑکتے ہوئے انسان کے دل
جورِ شاہی سے غم گین، جبرِ سیاست سے نڈھال
جانے کس موڑ پہ دھن سے دھما کا ہو جائیں (قید۔ مخدوم محی الدین)

یہ اشعار ترقی پسند شاعری کے سماجی مقصد اور انقلابی آواز کی غمازی کرتے ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی شعراء ہیں جنھوں نے ترقی پسند تحریک کے اس مقصد کے لئے اپنی تخلیقات کو پروان چڑھایا۔ ان میں سردار جعفری، کیفی اعظمی، اختر الایمان، ساحر لدھیانی وغیرہ شامل ہیں۔

ترقی پسند شاعری میں ایک قسم ایسی نظموں کی بھی ہے جن کے لہجہ میں گھن گرج اور زور خطابت ملتا ہے۔ موقع محل کے اعتبار سے لہجہ میں اتار چڑھاؤ آتا رہتا ہے۔ دوسری قسم کی وہ نظمیں ہیں جن میں ملائم اور نسبتاً دھیما لہجہ اختیار کیا گیا ہے۔ تحریک کے ابتدائی چند برسوں تک پہلی قسم کی نظموں کا زور رہا۔ اس دور کی نظمیں جوش کے آہنگ سے متاثر ہیں۔ کیونکہ عوامی مقبولیت کے لئے عوامی نعروں کا ساتھ دینا ضروری ہے۔ جوشؔ ملیح آبادی نے یہی کیا۔ مثال کے طور پر جوش کی نظم شکست زنداں کا خواب کے چند شعر درج ذیل ہے۔

کیا ہند کا زنداں کانپ رہا ہے گونج رہی ہیں تکبیریں
اکتائے ہیں شاید کچھ قیدی اور توڑ رہے ہیں زنجیریں
دیواروں کے نیچے آ آکر یوں جمع ہوئے ہیں زندانی
سینوں میں تلاطم بجلی کا آنکھوں میں جھلکتی شمشیریں
بھوکوں کی نظر میں بجلی ہے توپوں کے دہانے ٹھنڈے ہیں
تقدیر کے لب کو جنبش ہے دم توڑ رہی ہے تدبیریں
آنکھوں میں گدا کے سرخی ہے بے نور ہے چہرہ سلطاں کا
تقریب نے پرچم کھولا ہے سجدے میں پڑی ہیں تعمیریں
کیا ان کو خبر تھی زیرو زبر رکھتے تھے جو روح ملت کو
ابلیں گے زمیں سے مار سیہ برسیں گی فلک سے شمشیریں
سنبھلو کہ زنداں گونج اٹھا جھپٹوں کہ وہ قیدی چھوٹ گئے
اٹھو کہ وہ بیٹھیں دیواریں دوڑوں کہ ٹوٹیں زنجیریں

اسطرح کا واعظانہ اور خطیبانہ انداز انقلابی نظموں میں پایا جاتا تھا۔ لیکن آہستہ آہستہ یہ عنصر کم ہونے لگا۔ جذبات پرستی میں کمی آئی۔ اور دوسری طرز کی نظموں کا رجحان بڑھتے لگا۔ جس میں ضبط و توازن کا عنصر تھا۔ مثال کی طور پر مخدوم محی الدین کی نظم ”انقلاب“ کے چند اشعار درج ذیل ہیں۔

اے جانِ نغمہ جہاں سوگوار کب سے ہے
تیرے لئے یہ زمین بے قرار کب سے ہے
ہجومِ شوق سرِدہ گذار کب سے ہے
گذر بھی جا کہ تیرا انتظار کب سے ہے

نہ تابناکی رخ ہے نہ کاکلوں کا ہجوم
ہے زرّہ زرّہ پریشان کلی کلی مغموم
ہے کل جہاں متعفن ہوائیں سب مسموم
گذر بھی جا کہ تیرا انتظار کب سے ہے

مخدومؔ کی یہ نظم متوازن لب ولہجہ لئے ہوئے ہے اس طرح ضبط و توازن کے ساتھ اپنے

جذمات کو ٹھوس شکل میں مجازؔ نے اپنی نظم میں پیش کیا ہے اس نظم کے بند پیش ہیں۔

جھلملاتے قمقموں کی راہ میں زنجیر سی
رات کے ہاتھوں میں دن کی موہنی تصویر سی
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں
پھر وہ اک ستارہ پھر وہ چھوٹی پھلجھڑی
جانے کس کی گود مین آئی یہ موتی کی لڑی
ہوک سی دل میں اُٹھی چوٹ سی دل پر پڑی
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

ترقی پسند نظموں میں الفاظ کا استعمال برجستہ اور بندش اس قسم کی استعمال کی گئی ہے کہ جن سے عوام دشمن طاقتوں کے خلاف نفرت اور بغاوت کی جا سکے اور مظلوم طبقہ کے لئے ہمدردی اور رحم کا جذبہ پیدا ہو۔

مخدوم کی نظم باغی اسی طرز کی نظم ہے۔

سر پر نخوت ارباب زماں توڑوں گا
شورِ نالہ سے در ارض و سماں توڑونگا
ظلم پرور روش اہل جہاں توڑونگا
عشرت آباد امارات کا مکاں توڑونگا
توڑ ڈالو نگا میں زنجیر اسیرانِ قفس
دہر کو پنجہ عبرت سے چھڑانے دے مجھے

اس بند میں شاعر خود کو ایک آئیڈیل ہیرو کے روپ میں پیش کرتا ہے جو سماج کو پنجہ عبرت سے چھڑانے کی طاقت رکھتا ہے۔

برق بن کر مت ماضی کو گرانے دے مجھے
رسم کہنہ کو تہہ خاک ملانے دے مجھے
تفرقے مذہب و ملت کے مٹانے دے مجھے
خوابِ فردا کو بس اب حال بنانے دے مجھے

آگ ہوں آگ ہوں ہاں اک دہکتی ہوئی آگ
آگ ہوں آگ میں اب آگ لگانے دے مجھے

ترقی پسند نظموں میں موضوعات کا تنوع موجود ہے عام طور پر ترقی پسند شاعری عوام سے مخاطب ہو کر ان میں سماجی ناانصافیوں اور نابرابری کو ختم کرنے کے لئے بیداری لانا چاہتی ہے۔ساتھ ہی غریب مظلوم اور نادار عوام کو سرمایہ داری جاگیردارانہ

نظام سے چھٹکارا دلا کر آزادی کی فضاء ہموار کرتے ہوئے ایک ایسے سماج کی بنیاد ڈالنا مقصد ہے جہاں امن سکون اور شانتی سے لوگ زندگی بسر کر سکیں۔

☆ حلقہ ارباب ذوق اور اردو نظم نگاری

ترقی پسند تحریک کے فوری بعد ایک اور تحریک نے جنم لیا جسے حلقہ ارباب ذوق کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ویسے ترقی پسند تحریک کے کچھ عرصہ بعد ہی یہ سوال کیا جانے لگا تھا کہ ترقی پسندی کا حقیقت نگاری کا تصور نا کافی ہے شخصی آزادی اور قوتِ تخیل کو خارجی دباؤں سے آزاد رہنا چاہئے۔موضوعات کے لئے شاعر کو پابند نہیں کیا جاسکتا۔ادیبوں اور شاعروں کے لئے جماعتوں سے وابستگی زیادہ اہم ہو جاتی ہے۔تو کم تر درجہ کے شاعر بھی تحریک سے جڑے ہونے کی وجہ سے اہمیت کے حامل ہو جاتے ہیں۔جبکہ با صلاحیت اور ذہین فنکار جن کا تعلق کسی تحریک سے نہ ہو کمتر گردانے جاتے ہیں ساتھ ہی یہ بات بھی محسوس کی جانے لگی تھی کہ پروپیگنڈہ کی شاعری زیادہ پسند کی جاتی ہے۔ادب میں یکسانیت پروان چڑھ رہی تھی۔نئے تجربے کی راہ بند ہوتی دکھائی دے رہی تھی۔اور انفرادی غور وفکر کے بجائے اجتماعیت عام تھی۔

لہذا اس طرح کی سوچ رکھنے والے شاعروں اور ادیبوں کو ترقی پسندوں کی جانب سے شدید مخالفت کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آہستہ آہستہ لوگ اس تحریک سے دور ہوتے چلے گئے اور لاہور میں نصیر احمد جامؔی کے مکان پر ایک نشست میں حلقہ ارباب ذوق کے لئے ماحول بنتا گیا۔ابتداء میں اُسے "بزم داستان گویاں" کے نام سے جانا جاتا تھا۔جس میں صرف افسانوں پر دھیان دیا گیا۔لیکن بعد میں شاعری کو بھی اس میں شامل کیا گیا۔اور یہ حلقہ حلقہ ارباب ذوق کے نام سے ایک تحریک بن کر ابھری۔

یہہ بات اپنی جگہ صحیح ہے کہ نظم کے اعتبار سے حلقہ ارباب ذوق، ایک مقامی تنظیم تھی۔ مگر اس کے اثرات ایک تحریک بنکر پھیلتے رہے۔ اس تحریک سے وابستہ فنکاروں میں قیوم نظر۔ مختار صدیقی، یوسف ظفر، انجم رومانی، شہزاد احمد، میراں جی اورن۔م۔راشد شامل ہیں۔ لیکن اس تحریک کے اہم نام میراں جی اورن۔م۔راشد ہی ہیں جن کو شہرت ملی۔

حلقہ ارباب ذوق کی اصل اہمیت اس بات میں ہے کہ حلقہ نے ایک مخصوص ادبی اور فنی نقطہ نظر پر زور دیا جس کے اثرات اردو شعروادب پر گہرے مرتب ہوئے۔ جو آزادی کے بعد بھی پوری شدت کے ساتھ محسوس کئے جاتے رہے۔

ن۔م۔راشد حلقہ کے مقاصد کے تعلق سے کچھ اس طرح وضاحت کرتے ہیں۔

> ''جدید شاعری'' کی جس تحریک سے میں وابستہ ہوں۔ اس کے دو بنیادی مقاصد تھے فارم کی جکڑ بندیوں سے اردو شاعری کو آزاد کرنا اور دوسرے شاعری کو معاصر زندگی کی حقیقتوں سے قریب لانا''

☆ حلقہ اربابِ ذوق کی نظموں کے موضوعات

حلقہ ارباب ذوق کے شاعروں کی اصل شناخت نظم نگاری ہے۔ ان شعراء نے قدیم روایاتسے انحراف کرتے ہوئے نظم کے مروجہ تصور میں بھی تبدیلی پیدا کردی۔ نظیر اکبرآبادی سے لے کر ترقی پسند اردو نظم تک اردو نظم کا رائج تصور کسی خاص موضوع پر تفصیل کے ساتھ اظہار خیال کرتا رہا ہے۔ نظمیں کسی خیال یا جذبے یا احساس وتجربے کی ارتقائی شکل کو پیش نہیں کرتی تھیں۔ اس وجہ سے قدیم نظموں میں وحدتِ تاثر کی کمی کا احساس ہوتا تھا۔ اتنا ہی نہیں نظمیں غزل کے اثر میں تھیں۔

قدیم نظم کا موضوع وسیع ہوتا تھا۔ اور خود موضوع میں وسعت اور مسلسل ارتقاء کا میلان ہوتا تھا مثلاً ایک شاعر جب برسات پر نظم لکھتا تو وہ برسات کے مختلف پہلوؤں کو باری باری پیش کرتا تھا لیکن جدید شاعر اگر برسات پر نظم لکھے گا تو برسات کی ایک خاص کیفیت کو موضوع بنائے گا حلقہ ارباب ذوق کے شاعروں نے ترقی پسندوں کی طرح عظیم اور اہم موضوعات پر بہت کم نظمیں لکھی۔ کچھ شعراء، مثلاً یوسف ظفر قیوم نظر وغیرہ نے بعض وقتی اور ہنگامی مسائل یا امن و

انسانیت اور تہذیب کو موضوع بنایا۔ لیکن یہ تعداد میں کم ہیں حلقہ کے شاعروں کا عام رجحان فرد کے داخلی محسوسات و تاثرات کو پیش کرنا تھا۔ ان کے نزدیک فرد کا ایک ایسا تصور تھا جس نے اپنی شخصیت کی آزادانہ طور پر تعمیر کی ہے۔ یہ فرد جماعتی اور سماجی ضابطوں کا پابند نہیں ہے۔ بلکہ وہ کسی بھی صورتِ حال سے متصادم ہے جو اس کی شخصی آزادانہ تعمیر میں رکاوٹ بن سکتی ہے۔ حلقہ کے بیشتر شعراء کے یہاں ایک ایسا فرد ملتا ہے جس کی زندگی پر اداسی محرومی اور تاریکی کی حکمرانی ہے۔ فرد کے اسی تصور سے متعلق حلقہ ارباب ذوق پر سخت تنقیدیں ہوتیں۔

سردار جعفری نے کچھ اس طرح اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔

"یہ ہیئت برست، ابہام پرست اور جنس پرست ادیب تھے جن کے مشہور نمائندے میراں جی یوسف ظفر۔ مختار مفتی مختار صدیقی، وغیرہ تھے۔ یہ ذہین اور ہوشیار لکھنے والے تھے جو یورپ کے انحطاطی ادب سے متاثر تھے۔ اور شعور کے بجائے تحت الشعور اور لاشعور پر اور معنویت اور مواد کو چھوڑ کر ہیئت اور اسلوب پر زور دیتے تھے۔۔۔۔۔ ان کی بنیاد یہ تھی کہ ادب کا سماج سے کوئی تعلق نہیں ان کی رومانیت مجہول اور گندی تھی یہ خوابوں کو خارجی حقیقت سے الگ کر کے واہمہ میں تبدیل کر دیتے تھے اور ان اندھے خوابوں سے ذاتی اور انفرادی تاثرات کی جو جنسی تجربوں تک محدود رہتے تھے۔ ایک داخلی دنیا۔ بناتے تھے جس کے جغرافیہ کا پتا لگانا معمولی انسان کا کام نہ تھا"۔[1]

یہ بات صحیح ہے کہ میراں جی اور ن۔م۔ راشد نے جنس کو اہمیت دی ہے۔ لیکن ساتھ ہی انہوں نے اپنی تخلیقات میں سماجی اور سیاسی صورتِ حال میں فرد کی ذہنی اور جذباتی کشمکش کو بھی موضوع بنایا ہے۔ حلقہ کے شاعروں نے جن موضوعات پر نظمیں لکھیں اس میں جنسی جذبہ بھی کارفرما ہے۔

راشد اور میراں جی نے جنسی احساسات کی شاعری ایک خاص تصور کے تحت شروع کی یہ دونوں ہی شاعر فرائڈ کی تحلیل نفسی کے تصور سے متاثر تھے اور لاشعور کو انسانی عمل کا طاقتور محرک مانتے تھے۔ فرائڈ کا ماننا تھا کہ لاشعور ان نا آسودہ جذبات کا منبع ہے جو تکمیل نہ پانے کی صورت

۱۔ سردار جعفری۔ ترقی پسند ادب ص ۱۹۳

میں ختم نہیں ہوتا۔ بلکہ لاشعور میں جمع ہوتا رہتا ہے۔ یہ نا آسودہ جذبات غیر ارادی طور پر انسان کے روز مرہ افعال و اعمال میں ظاہر ہوتے ہیں جنس کی نا آسودہ خواہش بھی ان میں سے ایک ہے۔ فرائڈ کے نزدیک سب سے زیادہ موثر فعال محرک یہی جذبہ ہے میراں جی اور راشد نے اپنی تخلیقات میں ایسے فرد کا تجربہ پیش کیا ہے۔ جو جنسی نا آسودگی کے سبب ذہنی اور جذباتی پیچیدگیوں سے دوچار ہے۔

ن۔م۔راشد کی نظم ''امکانات'' اسی بات کی غمازی کرتی ہے۔

دبائے رکھا ہے سینے میں اپنی آہوں کو
وہیں دیا ہے شب وروز پیچ و تاب انہیں
کیا نہیں کبھی وحشت میں بے نقاب انھیں
خیال ہی میں کیا پرورش گناہوں کو
کبھی کیا نہ جوانی سے بہرہ یاب انھیں
یہ مل رہی ہے مرے ضبط کی سزا مجھکو
کہ ایک زہر سے لبریز ہے شباب مرا
فشار ضبط سے بے تاب ہے رباب مرا
لو آگئی ہیں وہ بنکر مہیب تصویریں
وہ آرزوئیں کہ جنکا کیا تھا خون میں نے
اے کاش چھپ کے کہیں اک گناہ کرلیتا
حلاوتوں سے جوانی کو اپنی بھر لیتا

(امکانات۔ن۔م راشد)

اس نظم میں راشد نے نا آسودہ جنسی جذبہ سے پیدا ہونے والی ذہنی اور جذباتی کشمکش کا اظہار کیا ہے

میراں جی کی نظموں میں جنس اور جنسی وصال کے تعلق سے سماجی جبر اور اس سے چھٹکارا پانے کی کوشش ملتی ہے۔ ان کی نظم ''اغوا'' میں محبوبہ کو گھر سے فرار ہونے کی ترغیب کچھ اسطرح سے دی گئی ہے۔

دھیرے دھیرے قدم اٹھائیں ہم
اور بستی کو چھوڑ جائیں ہم

دیکھ محدود زندگی کیوں ہو؟
غیر کے بس میں سرخوشی کیوں ہو؟

آؤ بھولو سماج کی باتیں
اپنی ہیں اب سے چاندنی راتیں

آؤ پابندیوں کو بھولو تم
آؤ آزادیوں کو چھولو تم

(ماوراء میرا جی)

یہہ ذہنی صورتِ حال فرد کے جبلی تقاضے اور سماجی قوانین و اخلاق کے درمیان کشمکش کا نتیجہ ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ میراں جی کی جنسی شاعری اپنا ایک اخلاقی پہلو رکھتی ہے۔ تو اس کی اخلاقیات سماج کی مروجہ اخلاقیات سے مختلف ہے۔

یہ بات بھی اپنی جگہ اہم ہے کہ راشد اور میراں جی کے علاوہ حلقہ ارباب ذوق کے دوسرے شاعروں نے جنس کو زیادہ اہمیت نہیں دی لیکن ان کی عشقیہ نظمیں عشق کے روایتی تصور سے گریز کرتی ہیں۔ دراصل یہ رجحان اس دور کی نمایاں خصوصیت میں شامل ہے جو جسم سے بے پناہ رغبت رکھتے ہیں۔ اس کی وجہ عشق کا وہ نیا تصور ہے جو علم نفسیات کے اثر سے عام ہوا۔ بقول عقیل احمد صدیقی

"دراصل ان شاعروں کے یہاں روائتی پاک محبت کی گنجائش نہیں تھی۔ وہ نفسی اور لاشعوری محرکات کے مطالعہ سے اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ عشق کا روائتی تصور ایک غیر حقیقی تصور ہے۔ اس تصور کے پیش نظر ان شاعروں نے جنس کا بے باکی کے ساتھ ذکر کیا ہے۔"[1]

بہرحال کہا جاسکتا ہے کہ حلقہ ارباب ذوق کے شعراء نے جنسی رجحان کو بیان کرنے میں کوتاہی نہیں برتی یوں ترقی پسند تحریک کے نمائندہ شاعروں نے حلقہ ارباب ذوق سے متعلق شاعروں کو جنس زدہ جنس پرست ابہام پرست جیسے القاب سے نوازا لیکن بارہا میراں جی اور ن۔م راشد اس کی تردید کرتے رہے اور خود کو سماج کے رشتے کی بیگانگی سے دور رکھتے ہوئے سماج کے تیئں اپنی ذمہ داری کا احساس بھی دلاتے رہے وہ اس بات کے قائل تھے کہ شاعری میں قاری کے لئے مسرت کے علاوہ بصیرت کا ساماں بھی ہونا چاہیے۔

---

1 عقیل احمد صدیقی۔ جدید اُردو نظم نظریہ اور عمل

حلقہ ارباب ذوق کے اہم شاعروں میں راشد میراں جی اور مختار صدیقی ایسے شاعر ہیں جنھوں نے سماجی اور معاشرتی موضوعات پر نظمیں لکھیں۔ ہاں انہوں نے ترقی پسندوں کی طرح اشتراکی نظام برپا کرنے کی وکالت نہیں کی لیکن ایک ایسے سماج کی تمنا کی جس میں فرد کو مکمل طور پر آزادی مل سکے ایک فرد پر سماج میں جو کچھ بیتی ہے اُسے موضوع بنایا جاسکے۔ قیوم نظر، یوسف ظفر، وغیرہ نے تو سیاسی، سماجی، معاشرتی، اور تہذیبی مسائل کے موضوعات پر نظمیں لکھی ہیں۔

راشد کی شاعری ایک ایسے دور میں پروان چڑھی جب ہندوستان آزادی کی جدو جہد اور دوسری جنگ عظیم کی لپیٹ میں تھا۔ راشد زندگی کے ایک نئے زاویہ نظر کے ساتھ شاعری میں داخل ہوئے۔ یہ زاویہ نظر ایک ایسے معاشرے کی آرزو کرتا ہے۔ جس میں فرد مکمل آزاد ہو۔ اس بات کو انہوں نے اپنے مجموعہ کلام ''ماوراء'' کی کئی نظموں میں بیان کیا ہے۔ ان کی بیشتر نظموں کے موضوعات میں اس دور کی سیاسی جدو جہد اور عام معاشرتی صورتِ حال بھی شامل ہیں وہ عام انسانوں کے معاشی اور معاشرتی مسائل میں دلچسپی لیتے رہے ہیں۔ مثلاً ان کی نظم ''انسان'' کا یہ بند

الٰہی تیری دنیا میں ہم انسان رہتے ہیں
غریبوں، جاہلوں مردوں کی بیماروں کی دنیا میں
یہ دنیا بے کسوں کی لاچاروں کی دنیا ہے
ہم اپنی بے بسی پر رات دن حیراں رہتے ہیں
ہماری زندگی ہے ایک داستاں ناتوانی کی

(انسان۔ ماوراء)

اس نظم کے ذریعہ راشد نے معاشرے کے نچلے کمزور طبقہ سے سماج میں نابرابری کے احساس کو بیان کیا ہے۔ لیکن وہ یہیں خاموش نہیں ہیں ایک اور نظم ''وادیِ پنہاں'' میں اس ناہموار صورتِ حال کے اسباب اور علاج کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔

کاش بتلادے کوئی
مجھ کو بھی اس وادیِ پنہاں کی راہ
مجھ کو ہے اب تک تلاش
زندگی کی تازہ جولانگاہ کی

اور بیزاری کہتی ہے
زندگی کے کہنہ آہنگ سے مسلسل مجھے
سرزمین زہست کی افسردہ محفل سے مجھے

(دریچے کے قریب۔ ماوراء)

راشد نے انگریزوں کی غلامی سے آزادی کی جدو جہد کو بھی اہم مانا ہے۔ وہ ماضی کی قدروں سے چھٹکارا بھی حاصل کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ ان میں مذہبی اقدار زیادہ اہم ہیں۔ راشد نے مذہب سے بھی بغاوت کی ہے۔ مثلاً

اونگھتا سورج ہے کس تاریک نہاں خانے میں
ایک افلاس کا مارا ہوا ملاّ بے حزیں
ایک عفریت اداس
تین سو سال کی ذلت کا نشاں
ایسی ذلت کہ نہیں جس کا مداوا کوئی

ایک اور نظم میں انھوں نے روائتوں سے بغاوت تو ضروری قرار دیا ہے۔ نظم کا عنوان ہے ''پہلی کرن''

میں اس قوم کا فرد ہوں جس کے حصے میں محنت ہی محنت ہے نان شبینہ نہیں ہے
اور اس میں بھی یہ قوم دلشاد ہے۔ شوکت پاستاں سے
اور اب بھی ہے امید فردا کسی ساحر بے نشاں سے
بہت ہے کہ ہم اپنے آباء کی آسودہ کوشی کی پاداش میں آج بے دست و پا ہیں
اس آئندہ نسلوں کی زنجیر پا کو تو ہم توڑ ڈالیں

(پہلی کرن۔ ماوراء)

مغرب کی غلامی سے آزادی کامل ن۔م۔ راشد کے نزدیک پورے ایشیاء کے متحدہ جدوجہد سے ہی ممکن ہے۔ اس بات کو انھوں نے نظم ''نارسائی'' میں موضوع بنایا ہے۔

اور اب عہد حاضر کے ضحاک سے
رستگاری کا رستہ یہی ہے
کہ ہم ایک ہو جائیں ہم ایشائی

وہ زنجیر جس کے سرے سے بندھے تھے کبھی ہم
وہ اب سست پڑنے لگی ہے
تو آؤ کہ وقت کا یہ تقاضہ
کہ ہم ایک ہو جائیں

ن۔م۔ راشد نے جہاں مظلوم اور بے کس عوام کو جبر کے پنجے سے آزاد کرانے کی خواہش ظاہر کی ہے۔ وہیں عوامی بے حسی کو موضوع بنایا ہے۔ مثلاً

ہم محبت کے خرابوں کے مکیں
وقت کے طول المناک کے پروردہ ہیں
ایک تاریک ازل نور ابد سے خالی
ہم صدیوں سے چلے ہیں تو سمجھتے ہیں
کہ ساحل پایا
اپنی تہذیب کی پاکوبی کا حاصل پایا

(ریگ دیروز۔ ماورا)

یا نظم ''زندگی'' ایک پیرہ زن کا یہ بند جو ماضی کے دریچوں میں خود کو لا حاصل پاتی ہے۔

زندگی تو اپنے ماضی کے کنویں میں جھانک کر کیا پائے گی
اس پرانے اور زہریلے ہواؤں سے بھرے سونے کنویں میں
جھانک کر اس کی خبر کیا لائے گی؟
اس کی تہہ میں سنگ ریزوں کے سوا کچھ بھی نہیں۔
جز صدا کچھ بھی نہیں

اس طرح میراں جی جو حلقہ اربابِ ذوق کی تحریک کے سب سے فعال شاعر ہیں۔ وہ وقتی اور ہنگامی موضوعات سے دامن بچاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کے یہاں کل زندگی نظم کا موضوع بنتی ہے۔ ان کے نزدیک ساری کائنات ایک وحدت ہے اور یہ وحدت بقا سے جنم لیتی ہے۔ مثلاً ان کی نظم ''یگانگت'' ہے

ہوائیں۔ نباتات اور آسماں پر ادھر سے اُدھر آتے جاتے ہوئے چند بادل

یہ سب کچھ یہ ہر شئے مرے ہی گھرانے سے آئی ہوئی ہے
زمانہ ہوں میں
میرے ہی دم سے ان مٹ تسلسل کا جھولا رواں ہے
مگر مجھ میں کوئی برائی نہیں ہے
یہ کیسے کہوں
مجھ میں فنا اور بقا دونوں آ کر ملتے ہیں

(یگانگت)

میراں جی نے جس دور میں زندگی گزاری وہ دوران کے خیال میں مثبت قدروں کے زوال اور منفی قدروں کے اثبات کا دور تھا۔ میراں جی نے اس حقیقت کو کبھی براہ راست اور کبھی اپنی ذات کے حوالے سے دریافت کیا ہے۔ مثلاً ان کی نظم ''عدم کا خلاء''

یہاں کوئی راہ رو نہیں ہے نہ کوئی منزل
یہاں اندھیرا نہیں اجالا نہیں
کوئی شئے نہیں
گذرتے لمحوں کے آتشیں پاؤں اس جگہ پے بہ پے رواں ہیں
ہر ایک شئے کو جھلتے جاتے ہر ایک شئے کو جلاتے جاتے مٹاتے جاتے
ہر ایک شئے کو سمجھاتے جاتے کہ کچھ نہیں ہست سے بھی حاصل
یہ سب معابد، یہ شہر، گاؤں
فسانہ زیست کے نشاں ہیں۔
مگر ہر ایک در پہ جا کے دیکھا ہر ایک دیوار روند ڈالی ہر ایک
روزن کو دل سمجھ کر یہ بھید جانا
گذرے لمحوں کے آتشیں پاؤں ہر جگہ پے بہ پے رواں ہیں۔
کہیں مٹاتے کہیں مٹانے کے واسطے نقش نو بناتے
حیات رفتہ حیاتِ آئندہ سے ملے گی یہ کون جانے
(عدم کا خلا)

میراں جی سماجی شاعر نہیں اور نہ ہی سیاسی، سماجی موضوعات سے انھیں دلچسپی ہے۔ ان

کا بنیادی مسئلہ فرد اور سماج کا تعلق ظاہر کرنا نہیں بلکہ فرد کو اپنے وجود کا احساس دلانا ہے۔ وہ زندگی جینے کا سلیقہ رومانی انداز میں سمجھانا چاہتے ہیں۔ اور محرومی اور فنا کے اعتقاد سے نکلنے کا راستہ فطرت سے ہم آہنگی میں تلاش کرتے ہیں۔

حلقہ ارباب ذوق کے ایک اور اہم شاعر مختار صدیقی ہیں۔ وہ آغاز ہی سے سیاسی اور سماجی موضوعات میں دلچسپی لیتے رہتے ہیں۔ ہنگامی اور وقتی باتوں کو عوامی علامتوں میں دائمی مسئلہ بنا کر پیش کرنا مختار صدیقی کی انفرادیت ہے۔ ان کی نظم ''آخری بات'' کا موضوع جاپان کے شہروں ہیر شیما اور ناگاساکی پر ایٹمی حملہ اور اس کی تباہی ہے

مثلاً

ہمہماتی ہوئی آبادیاں شمشان ہیں اب
ان گنت شہر ہیں ملبے کے سلگتے تودے
جھلسی دیواریں درو بام پہ ہیں نوحہ کناں
کہتی ہیں اپنا مکیں کوئی کہیں ہو تو سنے
خشت وآہن کے اس انبار سے وحشت نہ کرو
آؤ یہ گھر تھا تمہارا جہاں تم پھولے پھلے
اور اس راکھ کو آنکھوں کا بنالو سرما

مذکورہ دونوں شہر ملبہ کا ڈھیر بنے جو کبھی خوبصورت اور صنعت وحرفت کا گہوارہ تھے کہتے ہیں۔

زلزلے آئے نہ آشوب قیامت سے مٹے
دونوں ایک ذرّے کے جوہر کی کرامت سے مٹے

نظم کے آخری اشعار عالم انسانیت اور عالمی تصورات پر طنز رکھتے ہیں

جو ہر ذرّہ نے یوں پھونکا ہے اپنا افسوں
ضامنِ امن اُسے مانتے جیسے تیسے
خون ہی ہم میں نہیں خون بہے کا کیسے

غرض حلقہ ارباب ذوق کے شعراء نے جہاں جنس کو موضوع بنایا۔ وہیں عام معاشرتی

سیاسی اور تہذیبی مسائل کو بھی اپنی نظموں میں جگہ دی ہے

تاریخی پس منظر میں منصوبہ بند طریقے سے نظم نگاری کا باقاعدہ آغاز مولانا حالیؔ سے ہوتا ہے اور پھر اردو نظم ترقی پسند تحریک سے استفادہ کرتے ہوئے حلقہ ارباب ذوق کے شاعروں کا وسیلہ اظہار بنتی ہے۔ اس دور تک اردو نظم نے ہیئت کے لئے تجربے سے آگاہی حاصل کر کے اظہار کے نئے امکانات کو روشن کرتی ہے۔ اس طرح اُردو کی نظمیہ شاعری ہمہ گیر موضوعات سے مالا مال ہو کر سماج اور معاشرے کی موثر نمائندگی کی امین بن گئی۔ غرض جدید اُردو نظم نے سیاسی، سماجی، قومی، حب الوطنی، معاشرتی اور فطری مناظر کی عکاسی کر کے شعری دنیا میں موضوعات کے تنوع کا حق ادا کیا۔ اور انہی موضوعات کی ہمہ گیری کی وجہ سے نظم نگاری کا دامن وسیع سے وسیع تر ہو جاتا ہے۔

☆☆
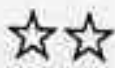
باب پنجم

آزادی سے قبل ''اُردو نظم کا سماجیاتی مطالعہ

انسان ایک سماجی حیوان ہے۔ یہ پرانی کہاوت ہے۔ لیکن آج بھی اس کی معنویت، اہمیت و افادیت مسلم ہے۔ کیونکہ فرد سماج ہی میں زندگی گذارتا ہے اس کے احساسات، جذبات ونظریات بھی کچھ اسی سماج میں پروان چڑھتے ہیں۔ سماج سے کٹ کر یا الگ علحیدہ رہ کرکوئی بھی فرد تنہا زندگی نہیں گزار سکتا یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ آدمی سے انسان بننے کا سفر وہ سماج ہی میں طے کرتا ہے۔ انسان کی زندگی اور اس کے وجود کی بقاء سب کچھ سماج ہی کی مرہون منت ہے۔

بقول پروفیسر مجیب

''افراد کی ذہنیت، ان کا علم، ان کی استعداد ان کے احساسات ان کے حوصلے اور ان کے وہ اصول جن کے مطابق ان کے باہمی تعلقات متعین ہوتے ہیں۔ افراد کی ذہنی نشو و نما سماج میں رہ کر ہی ہوتی ہے شاعر یا ادیب بھی اپنے سماج کا ہی پروردہ ہوتا ہے۔ کوئی بھی ادب سماج سے الگ رہ کر تخلیق نہیں ہوتا۔ ادب اور معاشرہ کے درمیاں گہرا رشتہ ہوتا ہے'' [1]

" Literature is the expression of society"

---

[1] پروفیسر مجیب۔ تاریخ تمدن ہند ۱۹۷۲ء ص ۸

ادب معاشرے کا وسلیہ اظہار ہے۔[1]

ایک اور مفکر البرخت نے ادب کو سماجی کنٹرول کا وسیلہ بھی بتایا ہے

اس طرح یہ کہا جاسکتا ہے کہ ادب سے معاشرے اور ثقافت کے عناصر کی ترتیب بھی ہوتی ہے اور سماج کی صحیح سمت و رفتار کا تعین بھی ہوتا ہے۔

بقول کوثر مظہری

''ذوق وشوق، تعقل، فنی اوصاف، اقدار و معیار حقائق سے متعلق مفروضے، تجربی عقائد، زبان اور بولی اور اسلوب فن وغیرہ ایسے عناصر ہیں جو ادب کی تخلیق میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔''[2]

اس حوالے کے ذریعہ یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے ادیب یا شاعر جو کچھ سونچتا ہے اور اپنے دائرہ فکر میں جو خاکہ بناتا ہے وہ دراصل سماج یا معاشرے کی عکاسی ہی ہے یعنی ادب اور سماج و معاشرے کے درمیان ایک اٹوٹ رشتہ ہوتا ہے۔ لہذا ادب کے مطالعہ میں سماج کے ادبی وثقافتی عناصر کا علم لازمی ہے۔ شعروادب بھی سماج میں ہی تخلیق پاتا ہے۔ کوئی بھی شاعر یا ادیب اپنے دور کے سماجی مسائل معاشی اور تہذیبی مسائل سے لاتعلق ہرگز نہیں رہ سکتا۔ وہ اپنے زمانے کے ہر قسم کے مسائل کسی بھی صنف کے ذریعہ بخوبی ظاہر کرتا رہتا ہے اُردو نظم کا جہاں تک تعلق ہے یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ ۱۸۵۷ء کے بعد پیدا ہونے والے سماجی اور سیاسی اتھل پتھل کے ذریعہ ہی نئی سمت و راہ تلاش کرتی رہی ہے۔

انسانی معاشرے اور سماج میں انقلاب، تبدیلی یا تغیر ناگزیر ہے تغیر و تبدل ایک فطری اور مسلسل جاری رہنے والا عمل ہے اور اسی تغیر و تبدل سے سماج میں کئی مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ کچھ مسائل دب کر رہ جاتے ہیں۔ یا حالات کے تحت پس پشت ڈال دیئے جاتے ہیں۔ اور کچھ نئے مسائل سر اٹھائے کھڑے ہوجاتے ہیں نئے مسائل سے نبرد آزما ہونے کے لئے نیا ذہن، نئی سونچ اور فکر لازمی ہوجاتی ہے۔

انقلاب اور سیاسی تبدیلیوں کی وجہ سے بیشمار نئے اور اہم سماجی مسائل رونما ہوتے

---

[1] سیّد عبدالباری۔ لکھنو کے شعروادب کا معاشرتی وثقافتی پس منظر ۱۹۸۷ء ص ۹۳

[2] مظہر کوثری۔ جدید اُردو نظم حالی سے میراں جی تک ۲۳

ہیں۔ جن میں تہذیبی، فکری، لسانی اور معاشرتی قسم کے مسائل ہی نہیں بلکہ موضوعات بھی سماج کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ہندوستان میں انگریزوں کے اقتدار کے آغاز اور ہندوستانی حکمرانوں کی شکست سے ایسے ہی کئی مسائل سماج میں ابھر کر سامنے آگئے۔ اس ملک کی تاریخ اس بات کی شاہد ہے کئی واقعات ایسے ہیں جن میں فاتح اور مفتوح قوموں میں کشیدگی پیدا کرتے رہے ہیں۔ ان میں کبھی تصادم بھی ہوا۔ اور کبھی مفتوح قوم نے لکچدار رویہ بھی ادا کیا۔ اور معاملہ فہمی کے ذریعہ سماجی طبقہ نے نئے حالات سے صلح جوئی کر کے درمیانی راستہ نکالنے کی کوشش بھی کی۔

سیاسی انقلابات کے علاوہ قدرتی آفات بھی سماجی وثقافتی مسائل کا ذریعہ بنتے ہیں۔ مثلاً سیلاب، خشک سالی، آتش زنی اور وبائی امراض وغیرہ بھی سماج ومعاشرے کو شدید متاثر کرتے ہیں۔ ان آفاتِ ناگہانی میں انسان کبھی گداگری، کبھی بھوک مری تو کبھی خودکشی پر مجبور ہوجاتا ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ایسے ہی حالات اور مصیبت کے اوقات میں انسانیت اور ہمدردی کے جذبات پروان چڑھتے ہیں۔ اور تہذیبی وتمدنی یگانگت کو بھی فروغ حاصل ہورہا ہے

خانگی زندگی سے اجتماعی زندگی تک روزمرہ کے مسائل سماجی مسائل کے دائرے میں آتے ہیں۔ انسانی زندگی میں ہونے والے حادثات وانقلابات اور ان سے پیدا ہونے والے مسائل مثلاً غربت، بیکاری، باہمی کشیدگی، اجتماعی وانفرادی زندگی میں بے راہ روی، ذات پات اور نسلی تفریق عورتوں کے مسائل وغیرہ اور اس وقت تک یہ مسائل پیچھا نہیں چھوڑتے جب تک کہ ان کا حل نہ تلاش کرلیا جائے۔

ایک حساس اور ذہین شاعر یا ادیب ان تمام مسائل کو اپنی تخلیقات کے ذریعہ عوام کے سامنے لاتا ہے جب انفرادی تجزیہ اجتماعی کیفیت بیان کرنے لگتا ہے تو شاعری سماج کی عکاس بن جاتی ہے۔ ۱۸۵۷ء میں بھی دورانِ غدر اور اس کے بعد ایسے ہی کچھ مناظر سامنے آئے، مسلمانوں کی بے بسی مجبوری اور پریشان حال نے اس دور کے شاعروں پر گہرے اثرات مرتب کیے جن کے توسط سے اُردو نظم نگاری میں نیاپن اور نئی حسیت جاگ اُٹھی۔

بقول ڈاکٹر شکیل احمد

"نئے حالات وحادثات میں نئے مطالبات بھی تھے جن سے سب کا سابقہ تھا اور جن سے سب کو نبرد آزما ہونا پڑا تھا۔ سماجی اور معاشرتی مسائل یہیں سے

پیدا ہو گئے اور یہیں سے ان کے فوری حل کی کوششیں کی جاتی ہیں۔"[1]

ہندوستان میں جس وقت انگریزوں نے اپنی عملداری شروع کی مغلیہ سلطنت کا خاتمہ ہوا۔ اور خاص طور سے مسلمانوں کی بے چینی و بے اطمینانی میں اضافہ ہوا۔ تو کچھ لوگوں نے اس صورتِ حال کو بدلنے کے لئے تعلیم کو اہمیت دی۔ اس سلسلہ میں خاص طور پر سر سیّد اور ان کے رفقائے کار کا بڑا اہم رول رہا۔ تاریخ کے مطالعہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستانی سماج مختلف طبقوں میں بٹ چکا تھا۔

بقول عبداللہ یوسف علی:

"اس دور (۱۸۵۷ء) کی معاشرتی زندگی کے تبصرے میں چار امور کو مدِ نظر رکھنا ضروری ہے اوّل یہ کہ دیہاتی آبادی کی کثیر تعداد بدستور پرانے طریق پر زندگی بسر کر رہی تھی۔ اگرچہ حکومت اور اقتصادی حالات کے تغیر و تبدل کی وجہ سے نئی باتیں اور نئے امور نامعلوم طور پر انکی زندگی میں داخل ہو گئے تھے۔ دوسرے یہ کہ شہروں، قصبوں اور اعلیٰ طبقہ کے لوگوں کی معاشرتی زندگی میں نمایاں تغیر اور تبدل اور انقلاب واقع ہو گیا تھا اور انگریزی فیشن پھیل رہا تھا۔ تیسرے نئے اقتصادی اسباب اور ذرائع آمد و رفت کی وجہ سے رفتہ رفتہ نئی عادات اور ضروریات پیدا ہو رہی تھیں جو قدامت پرست طبقہ کو مذہبی اور اخلاقی نظام کے لئے خطرناک نظر آ رہی تھی چوتھے معاشرتی اور سیاسی اصلاح کی کھلی ہوئی تحریک کی وجہ سے وہ حیرت انگیز اور غیر محسوس کشش جو ایک نامعلوم منزل کی طرف لئے جا رہی تھی"[2]

۱۸۵۷ء کے غدر نے ہندوستانی سماج میں ایک طوفان برپا کر دیا۔ کئی لوگوں کی زندگیاں برباد ہو گئیں۔ امیر ترین طبقہ غربت و افلاس میں مبتلا ہو گیا۔ ہر طرف کساد بازاری، طوائف الملوکی، انتشار اور شکست و ریخت کی فضاء مسلط ہو گئی۔ اور اسی دور میں شاعری کی جس صنف نے اپنے وجود کو منوایا وہ صرف اور صرف نظم نگاری تھی اور اس کے علمبرداروں میں محمد حُسین

---

[1] اُردو افسانوں کا سماجیاتی مطالعہ۔ از ڈاکٹر شکیل احمد۔ صفحہ ۸۹

[2] عبداللہ یوسف علی۔ انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ ص ۲۱۱

آزاد اور حالی پیش پیش تھے۔

بقول وزیر آغا:

"حالی اور ان کے رفقاء کے زمانے میں زندگی اور زندگی کے موضوعات پھر بدلے۔ میر اور سودا سے لیکر غالب کے دور تک ہندوستان کی فضاء شکست اور زوال کے احساسات سے لبریز تھی۔ اور انفعالیت کا رجحان سطح پر آچکا تھا آخر میں تو اس زوال اور انفعالیت نے ارضی رجحان کو بھی برانگیختہ کردیا۔ جس کے نتیجہ میں خودغرضی، بے راہ روی اور قدروں کی شکست اور ریخت کا عمل اپنے تمام گھنا ونے پہلوؤں کے ساتھ وجود میں آگیا۔ غدر اس سلسلے کی آخری کڑی تھا کہ اس میں ہندوستانی قوم کو سماجی سطح کے علاوہ قومی اور سیاسی سطح پر بھی ہزیمت کا منھ دیکھنا پڑا[1]"

یہہ بات تو سبھی تسلیم کرتے ہیں کہ حالی کے دور میں نظم کو مرکزی حیثیت حاصل ہوگئی تھی اور غزل کے مقابلے میں نظم نگاری اپنی ضرورت کو منوا رہی تھی سماج میں جو انتشار، بے کسی اور بے بسی کا ماحول پیدا ہوگیا تھا اس کی اصلاح اور موضوعی تسلسل کے بیان کے لئے نظم کارآمد صنف تھی۔ حالی کا دور سماجی اور سیاسی تحریک کا ابتدائی دور تھا۔ اس زمانے میں کئی تبدیلیاں رونما ہورہی تھیں بلکہ سماج ترقی کی سمت گامزن ہو چکا تھا یہہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ سماج ترقی کی جانب دوڑ رہا تھا۔ کیونکہ ریل گاڑی کا آغاز، تار اور بجلی اس زمانے کی ایجادیں ہیں۔ لوگ دیہات سے شہر کی طرف منتقل ہونے لگے۔ یہہ تمام بدلتے ہوئے حالات و مسائل اور سماجی اور معاشرتی زندگی کے بدلتے ہوئے انداز کا اظہار نظم میں بہ آسانی کیا جاسکتا تھا۔

اسی زمانے میں حب الوطنی کے جذبے کو فروغ حاصل ہورہا تھا۔ جس کی غمازی کرنے کے لئے نظم سے بہتر دوسری صنف نہیں تھی۔ اس کے علاوہ تمام مسائل کی عکاسی کے لئے بھی نظم ایک موزوں صنف تھی جس میں کسی بھی موضوع کو تسلسل کے ساتھ بیان کی بھرپور اہلیت موجود تھی۔ اسی طرح نظم میں قدرتی مناظر، موسم، رسم و رواج وغیرہ کی منظر کشی اور اظہار بھی بہ آسانی ہورہا تھا۔ ساتھ ہی مغربی فکر اور اس کی پیروی کا رجحان بھی بڑھ رہا تھا۔ جو نظم نگاری کے لئے اہم

[1] وزیر آغا۔ اُردو شاعری کا مزاج ص ۳۹۶۔۳۹۷

محرک بنا۔

بقول وزیر آغا:۔

''حالیؔ کے دور میں نظم کی ترویج کا منصوبہ عوام کو جذباتی سطح پر تعمیر نو کی طرف متوجہ کرنے کی ایک شعوری کوشش کے سوا کچھ نہیں تھا۔[۱]''

اُردو نظم کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ ابتداء میں نظم دراصل فرد کی ذات کی شخصی رخ کے بجائے اس کے سماجی رخ کو سامنے لانے کا جذبہ زیادہ توانا تھا۔ نظم نگاری کے ابتدائی رجحان میں حب الوطنی کے جذبہ کو برانگیختہ کرنے کی کوشش۔ ملت کو جگانے کا اقدام اور ایک بہتر سماج کی تشکیل کے لئے لوگوں کو ذہنی اور عملی طور پر تیار کرنا شامل ہے۔ اس دور کے نظم گو شعراء میں حالیؔ کے علاوہ محمد حسین آزادؔ، اسمٰعیل میرٹھی، شبلیؔ اور اکبر الہ آبادی کے نام قابل ذکر ہیں۔

۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک کے سماجی حالات کا جائزہ لیا جائے تو ایک بات سامنے آتی ہے کہ دوران غدر ۱۸۵۷ء میں ہندوستانی سماج کئی طرح کی مصیبتوں اور تکلیفوں میں گھرا ہوا تھا۔

بقول تاراچند

''غرض غدر کا پورا زمانہ قتل وغارت گری، لوٹ مار، آتش زنی، ظلم وستم کا دور گذرا ہے لاکھوں انسان قتل ہوئے لاکھوں برباد ہوئے لاکھوں کی آبرو لٹی۔ کروڑوں کی جائدادیں تباہ ہوئیں اور سینکڑوں بستیاں اجڑ گئیں۔'' [۲]

ایسے پر آشوب ماحول میں نفسا نفسی کا عالم تھا اور ہندوستان کی قوم جس میں ہندو مسلم بھی شامل تھے سوائے صبر کے کچھ نہیں کر پا رہے تھے۔ لیکن آہستہ آہستہ ہندوستانی سماج کہیں کہیں سسک سسک کر دم توڑ رہا تھا۔ داغ دہلوی نے اپنی نظم شہر آشوب میں ان تمام حالات کا درد بھرا اظہار کیا ہے۔ مختلف واقعات کی تصویریں آنکھوں کے سامنے آجاتی ہیں۔ مثلاً پوربیوں کی دہلی پر چڑھائی۔ زن وبچوں کا بے پناہ قتل۔ اہل دہلی کی ہجرت، مصائب وحوادث کا ناقابل بیان سلسلہ ساتھ ہی اقتصادی بدحالی کا رونا بھی اس نظم میں موجود ہے۔ داغ کی نظم شہر آشوب کچھ اس طرح شروع ہوتی ہے۔

۱۔ وزیر آغا۔ اُردو شاعری کا مزاج۔ ص ۳۹۹

۲۔ ہسٹری آف فریڈم مومنٹ از:۔ تاراچند صفحہ ۲۰۱

فلک زمین و ملائک جناب تھی دلّی
بہشت و خلد میں بھی انتخاب تھی دلّی
جواب کا ہے کو تھا لا جواب تھی دلّی
مگر خیال سے دیکھا تو خواب تھی دلّی
پڑی ہیں آنکھیں وہاں جو جگہ تھی نرگس کی
خبر نہیں کہ اُسے کھا گئی نظر کس کی

جس کے بعد پوربیوں (باغیوں) کا قہر بن کر نازل ہونا۔ اور انگریزوں کے قتل عام اورشرفائے دہلی کو لوٹنے کا ذکر کچھ اس طرح کیا ہے

خدا پرستی کے بدلے جفا پرستی ہے
جو مال مست تھے اب انکو فاقہ مستی ہے
بجائے ابرِ کرم مفلسی برستی ہے
تنگ جینے سے ایسی تنگ دستی ہے
غضب میں آئی رعیت بلا میں شہر آیا
یہ پوربی نہیں آئے خدا کا قہر آیا
زبان سے کہتے ہوئے دین دین آئے لعین
جو ماتادین تھا کوئی تو کوئی گنگادین
یہ جانتے ہی نہ تھے چیز کیا ہے دین مبین
کئے ہیں قتل زن و بچہ کیسے کیسے حسین
روانہ تھا مذہب میں جو وہ کام کیا
غرض وہ کام کیا کام ہی تمام کیا [1]

اسی طرح نظم کا یہ بند..........

کھلا یا زہرستم گرنے پان کے بدلے
پلایا خونِ جگر پچواں کے بدلے
صِلیب دار ہوئی ہے نشان کے بدلے
ملا نہ گورو گڑھا بھی مکان کے بدلے
کہ طفل و عورت و پیر وجواں روتا ہے
غرض یہاں کے لئے ایک جہاں روتا ہے [2]

نظم کے بند اشارہ کرتے ہیں کہ کیا بوڑھا کیا بچہ کیا مرد وعورت سبھی کو قتل کر دیا گیا تھا۔ بلوائی سماج کے تانے بانے بکھیر نے لگے تھے۔ سارا سماج اس قسم کے انتشار کا شکار تھا۔ سماج کی اس زبوں حالی کا تذکرہ پر درد انداز میں نظم کے پیرائے میں بیان ہورہا تھا۔

اس دور کے اہم شعراء میں الطاف حُسین حالؔی نے اپنی نظموں میں سماج کے کئی مسائل کو بخوبی بیان کیا خاص طور سے عورتوں کے مسائل۔ اسلام کی شان وشوکت اور پھر زوال کے

۱۔ داغ دہلوی۔ شہر آشوب

۲۔ ایضاً

وجوہات اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ اس دور کے تقریباً سبھی شاعروں نے اپنی اپنی طرز پر سماج کی زبوں حالی پر نظمیں لکھیں۔

جب ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ ختم ہوا۔ اور جدید دور کا آغاز ہوا تو ہر طرف ماتم اور ایک سناٹا چھایا ہوا تھا سارا ہندوستانی سماج حیران تھا ایسا لگ رہا تھا کہ ان کی سونچنے سمجھنے کی صلاحتیں ختم ہو چکی ہیں۔ جیسے جیسے دن گذرتے گئے تباہی کے زخم مندمل ہونے لگے۔ دھیرے دھیرے لوگوں نے سونچنا شروع کیا بیسویں صدی کے آغاز تک ہندوستان پرسکون رہا۔ لوگ اپنی کمزوریوں کا جائزہ لینے لگے۔ اور انہیں اپنی اور سماج کی اصلاح کا خیال آیا۔

بیسویں صدی سے حصولِ آزادی تک کا زمانہ نہ صرف تاریخ ہند بلکہ برصغیر اور اس کے آگے ساری دنیا کے لئے نہایت پرآشوب دور رہا۔ دنیا میں ایسے ایسے واقعات رونما ہوئے جنھوں نے تاریخ عالم کو تبدیل کر کے رکھ دیا۔ اور انسان کی سماجی زندگی میں بھی کئی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔

بقول ڈاکٹر محمد سعد اللہ

> "اُس دور میں چھوٹی چھوٹی لڑائیوں کے علاوہ دو خونریز عالم گیر جنگیں لڑی گئیں۔ نئے نظریات، نئے انقلابات۔ نئے ممالک کا جنم ہوا۔ قتل، خونریزیاں، وبائیں، قحط لاکھوں انسانوں کی بھینٹ لے گئیں۔ نئی نئی ایجادات...... انکشافات اور قتل و غارت گری کے ہتھیاروں نے زندگی کے ہر شعبے میں انقلاب برپا کر دیا"۔ [۱]

ہندوستان میں سماجی اور معاشرتی لحاظ سے غدر سے لیکر ۱۹۴۷ء یعنی حصول آزادی تک کا زمانہ جدوجہد اور اصلاح کا زمانہ ہے۔ اس دور میں ہندوستان میں زندگی کے ہر شعبے میں اصلاح کی کوشیش کی گئی۔ خاص طور سے مسلمانوں میں جو مایوسی اور انحطاطی کیفیت پیدا ہوگئی تھی۔ سرسیّد کی تحریک کی وجہ سے نئی روشنی کی کرن پھوٹی۔ ساتھ ہی حب الوطنی کے ساتھ ساتھ تعلیم حاصل کرنے کی سمت لوگوں کی رغبت بڑھی جس کی وجہ سے سماج میں نئے خیالات اور تصورات ابھرنے لگے اور مسلم سماج اپنی بقاء کے لئے جدوجہد میں لگا رہا۔ ان تمام باتوں کے علاوہ سماج

۱۔ ڈاکٹر سعد اللہ: شہر آشوب آغاز، ارتقاء، اہمیت ص ۴۸۹

میں جو برائیاں پھیل گئی تھیں انہیں بھی دور کرنے کی کوشش کی جانے لگی۔ اس دور کی شاعری کا مطالعہ کیا جائے تو ان تمام باتوں سے واقفیت ہوتی ہے۔ خاص طور سے جدید نظم نگاری کی تحریک انہی باتوں سے متاثر ہو کر شروع کی گئی تھی۔

اس دور کے انقلابات، مصائب، انتشار، اضطراب و بے چینی سے مسلم طبقہ ہی نہیں بلکہ سارا سماج متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس دور کے شعراء نے اپنے معاشرے، ماحول اور عہد کی عکاسی نظموں میں کیں۔ اصلاح معاشرت کے مقصد کے تحت حالیؔ، اسمٰعیل میرٹھی وغیرہ نے نظمیں لکھیں۔ حیدرآباد کی رودِ موسیٰ کے حادثہ پر نظم طباطبائی اور ظفر علی خان وغیرہ نے نظمیں لکھیں۔ حالیؔ نے غدر کے حادثہ و سانحہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا انھیں سماج کے اہم لوگوں سے شکایت تھی کہ وہ اپنی حالتِ زار کو بدلنے کے لئے تیار ہی نہیں اور اگر قوم کے ذمہ دار ہی اپنے فرض سے غفلت برتنے لگیں تو عام انسان بے حس و حرکت ہی رہ جائے گا۔ وہ اپنی ایک نظم مسدس میں کچھ اس طرح کی حالت بیان کرتے ہیں۔

یہی حال دُنیا میں اس قوم کا ہے ۔۔۔ بھنور میں جہاز آکے جسکا گرا ہے
نہیں لیتے کروٹ مگر اہل کشتی ۔۔۔ پڑے سوتے ہیں بے خبر اہل کشتی
گھٹا سر پر اِدبار کی چھا رہی ہے ۔۔۔ فلاکت سماں اپنا دکھلا رہی ہے۔
لیا عقل و دیں سے نہ کچھ کام انھوں نے ۔۔۔ کیا دینِ برحق کو بدنام انھوں نے [1]

آگے چل کر اس طرح بیان کرتے ہیں۔

بُرے ان پہ وقت آکے پڑنے لگے اب ۔۔۔ وہ دنیا میں بس کر اجڑنے لگے اب
بھرے ان کے میلے اب اجڑنے لگے اب ۔۔۔ بنے تھے وہ جیسے بگڑنے لگے اب
نہ ثروت رہی ان میں قائم نہ عزت ۔۔۔ گئے چھوڑ ساتھ ان کا اقبال و دولت
ہوئے علم و فن ان سے ایک ایک رخصت ۔۔۔ مٹی خوبیاں ساری نوبت پہ نوبت
ہماری ہر ایک بات میں سفلہ پن ہے ۔۔۔ کمینوں سے بد تر ہمارا چلن ہے
نہ قوموں میں عزت نہ جلسوں میں وقعت ۔۔۔ نہ اپنوں میں الفت نہ غیروں سے ملت
مزاجوں میں سستی دماغوں میں نخوت ۔۔۔ خیالوں میں پستی کمالوں سے نفرت

[1] الطاف حُسین حالی۔ مسدس ص

بہت دور پہنچی ہے نکبت ہماری تنزل نے کی ہے بری گت ہماری

ان تمام خیالات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مسلم سماج نہ صرف تنزل کا شکار تھا بلکہ اس قوم کی اقتصادی حالت بھی خراب ہو چکی تھی۔ افلاس ہر سمت چھا گیا تھا۔ بڑے بڑے خاندان تباہ ہو گئے تھے صاحب دولت بھیک مانگنے اور گداگری پر مجبور ہو گئے تھے۔ عام لوگ محنت سے جی چراتے تھے۔ نہ صرف یہ بلکہ نفاق، تعصب، تنگ نظری جیسی برائیوں میں مبتلا تھے۔ کچھ واعظوں نے بھی فرقہ پرستی میں مبتلا کر دیا تھا اور کچھ لوگ شعبدہ بازی کا شکار بھی ہو گئے تھے مثلاً

شریفوں کی اولاد بے ترتیب ہے تباہ ان کی حالت بری ان کی گت ہے
کسی کو کبوتر اڑانے کی لت ہے کسی کو بٹیریں لڑانے سے رغبت ہے
چرس اور گانجے کا شیدائی ہے کوئی سوک اور چنڈو کا رسیا ہے کوئی
یہی ہیں وہ نسلیں مبارک ہماری کہ بخشیں گی جو دین کو ا

حالی نے اس زمانے میں جو دیکھا محسوس کیا وہی اپنی نظموں میں بیان کیا یہ تمام اشعار سماج کی ابتر حالت بیان کرتے ہیں۔ حالی نے بڑے نفرین الفاظ سے جن کا تذکرہ کیا ہے۔

شبلی نعمانی نے بھی اپنے سماجی حالات کا تذکرہ اپنی نظموں میں کیا ہے۔ انہوں نے اپنی نظموں میں سماجی اصلاح کو موضوع بنایا۔ یعنی سماج میں جو برائیاں پھیل چکی تھیں۔ انہیں درست کرنے کی تلقین اپنی نظموں کے ذریعہ کی۔ انہوں نے اپنی نظم ''صبح اُمید'' میں سماج کے تہذیبی و تمدنی عناصر کے بکھرنے اور ثقافتی ڈھانچے کو ٹوٹنے پھوٹنے کی داستان بیان کی ہے۔ اس نظم کا اقتباس کچھ اس طرح ہے۔

اپنی تو ہمیں نہ کچھ خبر تھی اوروں کے عیوب پر نظر تھی
ڈوبے تھے تعصبات میں ہم ٹرپتے تھے بات بات میں ہم
(صبح اُمید)

بقول کوثر مظہری

''قوم مسلم نے اپنی صنعت و حرفت اور تجارت جو اسلامی تہذیب کی علامت ہے سب کو بھلا دیا ہے۔'' ۲

۱۔ الطاف حسین حالی مسدس ۲۔ کوثر مظہری اُردو نظم میراجی تا حالی ص ۶۷

شبلی کی شاعری میں پوری ملتِ اسلامیہ کا درد تھا۔ مسلمانوں کی پس ماندگی اور خستہ حالی سے وہ بخوبی واقف تھے۔ اور اس کے اسباب وعلل پر بھی اس کی نظر تھی۔

دہلی کی تباہی کے ساتھ ساتھ پورا سماج اور ہندوستان کی تہذیبی بساط دونوں ہی متاثر ہوئے۔ معاشرے کی صورتِ حال بدل چکی تھی۔ سیاسی اور اقتصادی بساط کی الٹ پھیر سے سماجی عوامل بدل رہے تھے ان حالات میں سر سید احمد خان نے مسلمانوں کی ڈوبتی نیا کو تھام کر ساحل تک لانے کا عظیم کام انجام دیا۔ انہوں نے انگریزی تعلیم وتہذیب سے اکتساب کرنے کی تلقین کی۔ اور یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ انحطاط پذیر معاشرے سے نکل کر ترقی کا دامن تھامنا ہے تو انگریزی تعلیم حاصل کرنا ضروری ہے۔ اور انگریزی سرکار سے ملکر ہی زندگی کو خوشحال بنایا جاسکتا ہے۔ حالی نے اس بات کو اپنی مسدس میں کچھ اسطرح بیان کیا ہے۔

حکومت نے آزادیاں تم کو دی ہیں ترقی کی راہیں سراسر کھلی ہیں
صدائیں یہ ہر سمت سے لے آرہی ہیں کہ راجا سے پرجا تلک سب سکھی ہیں
تسلط ہے ملکوں میں امن و امان کا
نہیں بند رستہ کسی کارواں کا
کھلی ہیں سفر اور تجارت کی راہیں نہیں بند صنعت کی حرفت کی راہیں
جو روشن ہیں تحصیل حکمت کی راہیں تو ہموار ہیں کسب دولت کی راہیں
نہ گھر میں غنیم اور دشمن کا کھٹکا
نہ باہر ہے قزاق اور رہزن کا کھٹکا

اس کے ساتھ ہی سماج کا ایک طبقہ ایسا بھی تھا جو مغربی تہذیب کی چمک دمک اور تعلیم کو سماج اور معاشرے کے لئے نقصان دہ سمجھتا تھا اور ایسے لوگوں کی نمائندگی اکبر الہ آبادی نے کی اپنی نظموں کے ذریعہ کچھ اس طرح کے خیالات کا اظہار کیا:۔

ہوئے اسقدر مہذب کبھی گھر کا منہ نہ دیکھا
کٹی عمر ہوٹلوں میں مرے اسپتال جا کر
حامدہ چمکی نہ تھی انگلش سے جب بیگانہ تھی
اب ہے شمع انجمن پہلے چراغ خانہ تھی

ا۔ اکبر الہ آبادی کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ ۱۱۲

اس دور کے خیالات نئی تہذیب وتمدن کو اپنانے کے لئے تیار نہیں تھے۔ لیکن سماج کا زیادہ تر طبقہ یہی سوچ رہا تھا کہ زندگی کو اگر خوشحال بنانا ہے تو مغربی تعلیم اور مغربی خیالات کا اپنانا چاہیئے۔ اور یہی بات صحیح معنوں میں جدید شاعری اور خاص طور سے جدید نظم کے لئے فضاء تیار کر رہی تھی۔ شاعری سماج کے اخلاق پر اثر انداز ہوتی ہے بقول حالؔی

''اگر چہ شاعری کو سوسائٹی کا مذاق فاسد بگاڑتا ہے مگر شاعری جب بگڑ جاتی ہے تو اسکی زہریلی ہوا سوسائٹی کو بھی نہایت سخت نقصان پہنچاتی ہے۔'' [1]

۱۸۵۷ء میں غدر کی وجہ سے جو تباہی بربادی ہوئی اُس میں ہندوستانی سماج بری طرح متاثر ہوا اور اُردو نظم نگاری کی روایت میں تبدیلی آئی۔ اور نظم میں اس زمانے کی سماجی زبوں حالی کو بیان کیا گیا۔ سماج کے مختلف طبقوں کا حال، ان کی سوچ وفکر، ان کے جذبات وخیالات و احساسات کو بھی نمایاں کیا گیا۔ اس لئے اس دور کی شاعری کو سماجی اصلاح کے لئے استعمال کیا گیا۔ اور نظم نگاری کے اسلوب میں موضوع ومواد در حقیقت سماجی مسائل ہی ہیں۔

۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد ہندوستانی سماج خاص طور سے مسلمانوں میں عدم تحفظ، دنیاوی تعلیم سے بے گانگی اور سرکاری نوکریوں کے ذریعہ معاشی مسائل کے حال کرنے کی غرض سے انگریزی تعلیم کا حصول اور حکومتِ وقت سے تعاون کرنے کی سعی کی جانے لگی۔ اگر مسلمان اس طرف خیال نہیں کرتے تو آنے والی نسلیں شائد ہی اپنے مستقبل کو سنوار پاتیں۔ اس لئے انگریزی تعلیم کی طرف رغبت دلانے کے لئے سر سیّد احمد خاں اور ان کے رفقاء نے ہر ممکنہ کوششیں کیں۔ اس دور کے شعراء نے تعلیم کی اہمیت وافادیت کو اپنی نظموں کے ذریعہ عوام کے سامنے رکھا۔ اس کی مثال محمد حُسین آزاد کی مقبول نظم ''شب قدر'' ہے جس میں طالب علموں کو یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ رات کی اہمیت وافادیت کیا ہے چوروں کیلئے رات کسطرح کی ہوتی ہے۔ بہر حال رات کی کئی جہتیں اس نظم میں بیان کی گئی ہیں۔

بقول مظہر کوثری:۔

''یہہ شب قدر وہ نہیں ہے جو رمضان المبارک میں آتی ہے اور جسے لیلۃ القدر سے موسوم کیا جاتا ہے۔ دراصل اِس میں رات کی اہمیت اور غرض و

۱۔ الطاف حُسین حالی ص ۲۵

غایت بتائی گئی ہے۔"[1]

اس نظم کا وہ حصہ اہم ہے جس میں ماں کی بے قراری اپنے بچے کے لئے دکھائی گئی ہے

ماں دیکھوں اپنی نیند کو کرتی حرام ہے
دل دے رہا جو شیر محبت کے جام ہے

بچے کو ہاتھ سے ہے برابر تھپک رہی
ہر چند کام کاج سے گھر کے ہے تھک رہی

ایسا نہ ہو کہ یہ کہیں جل کر اچھل پڑے
اور کہتی ہے مجھ کو پڑے یا نہ کل پڑے

ماں کو بھی سوتے جاگتے اس کا دھیان ہے
کروٹ نہیں بدلتی کہ ننھی سی جان ہے

(شب قدر)

دوسرے بند میں شاعر نے رات چوروں کے لئے کسطرح اہمیت رکھتی ہے یہ بتایا ہے۔

روسیا کار بھی ہے اپنی چوٹ میں
اے رات تیرے پردۂ دامن کی اوٹ میں

اور ہاتھ ڈالا اس کے ایں واں میں ہے
بیٹھا نقب لگا کے کسی مکاں میں ہے

ہے چپکے چپکے دیکھ رہا کھول کھول کر
اسباب سب اندھیرے میں گھر کا ٹٹول کر

لے جائے گا جو کچھ کہ غرض ہاتھ آئے گا
دیکھو کمایا کس نے ہے اور کون اڑائے گا

اس طرح یہ نظم اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ سماج میں طالب علم حصول تعلیم کے لئے راتوں کو جاگ کر اپنی زندگی سنوار سکتے ہیں۔ وہیں سماج کا ایک ایسا طبقہ بھی ہے جو صرف چوری کی غرض سے گھات لگائے بیٹھا ہے اس طرح سماج میں اچھے اور برے طبقہ کے نظریات ایک رات کے لئے علیحدہ علیحدہ بتائے ہیں۔ غربت و افلاس کی وجہ سے سماج میں جو بے چینی بے اطمینانی چھا گئی تھی اس کی عکاسی نظم "زمستان" میں کی گئی ہے کہ سردی سے بچنے کے لئے اوڑھنے کو کوئی کپڑا ہے نہ کوئی دوسرا ذریعہ امیر تو خیر سے شال اوڑھے گھومتا ہے۔ لیکن غریب سردی سے ٹھٹھرنے پر مجبور ہے۔

مارے سردی کے جگر سینوں میں تھرتھراتے ہیں
بچے ماں باپ کی بغلوں میں گھسے جاتے ہیں

---

[1] مظہر کوثری۔ جدید نظم ص ۸۳

ہے کوئی چھینٹ کا اوڑھے ہوئے فرغل بیٹھا
پیر پھیلائے ہوئے جیسے کوئی بلبل بیٹھا
اوڑھ بیٹھا کوئی سردی سے لحاف اپنا
کوئی کر بیٹھا بچھونے کو غلاف اپنا
اور کہیں سوں سوں کہیں سی سی ہے کہیں سیٹھی
گرد سب بیٹھے ہیں اور بیچ میں ہے انگیٹھی۱؎

(زمستان)

۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک کی اُردو نظم نگاری کا سماجی نکتہ نظر سے مطالعہ کیا جائے تو یہ بات ضرور سامنے آتی ہے کہ غدر کے بعد جب حالات سنبھلنے لگے تو قوم کے مدبر اور دانشوروں نے سارے معاشرے کو بکھرا ہوا پایا۔ اب ان کے لئے اس بکھرے ہوئے معاشرے کے تانے بانے کو سمیٹا اور نئے سماج کی بنیاد ڈالنا فرض تھا۔ سرسیّد احمد خان نے اسی اہم کام کے لئے سماج میں اصلاحی تحریک چلائی اور اُردو شعر ادب کو نئے فنی نکات سے سنوارنے کے لئے ماحول کو سازگار بنایا۔

ادھر انگریزوں نے بھی اپنی حکومت کو مضبوط اور مستحکم کرنے کے لئے ہندوستانی عوام کو مختلف طریقوں سے یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ وہ ہندوستانی سماج اور عوام کے لئے بہت کچھ کرنا چاہتے ہیں۔ اس لئے ہندوستان کی ترقی اور سماج کی ترقی کے لئے نئی نئی پالیسیاں اور تعلیم و تربیت کے لئے درسگاہیں اور کالجس وغیرہ کے قیام کا انتظام کرنے لگے۔ تعلیم کے میدان میں ہندوستانی سماج کو نئی سمت و رفتار کا موقع ملنے لگا۔

جدید اُردو نظم نگاری میں اسمٰعیل میرٹھی کا نام بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ انہوں نے اپنی نظموں میں نیچرل موضوعات کو اپنایا۔ ان کی نظموں میں روانی، جاذبیت اور اصلیت بہت زیادہ ہے۔ جسطرح کی نظمیں انہوں نے لکھیں ان میں گھریلو اشیاء، ہندوستانی پرندے، جانور وغیرہ موجود ہیں۔ ان نظموں کے مطالعہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ انھوں نے ہندوستانی سماج میں

۱۔ شب قدر محمد حسین آزاد۔ جدید شاعری۔ عبادت بریلوی ۱۴

استعمال ہونے والی اشیاء کا تذکرہ کیا ہے۔ سماج مین جو پرندے یا جانور اہمیت رکھتے تھے۔ ان کا ذکر کیا ہے اس طرح ہندوستانی سماج کی مکمل عکاسی ان کی نظموں میں نمایاں ہے۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اسمٰعیل میرٹھی نے سماج کی ذہنی تربیت اور اخلاق سازی کے لئے نظمیں کہی۔ اور یہ بات اتنی ہی اہم ہے کہ انسان کی تہذیبی وتمدنی زندگی کی سمت سازی اور ذہن انسانی پر اخلاقی عوامل کی چھاپ جتنی آسانی سے شاعری کے ذریعہ نمایاں کی جاسکتی ہے شاید ہی کوئی دوسرا طریقہ اسقدر مفید ہوسکتا ہے۔

بقول سیّد امداد امام اثر:

"ہر زمانے میں شاعری انسان کی تمدنی، اخلاقی اور مذہبی معاملات میں تاثر رساں اور بہ کار آمد ہوتی ہے۔ لاریب شاعری بہترین ذریعہ اخلاق آمیزی کا ہے بغیر سچی شاعری کے انسان کے قوائے اخلاقیہ ترقی نہیں کر سکتے۔ شاعری میں فلسفہ اخلاق ہے۔"[1]

اسماعیل میرٹھی نے اپنی نظموں کے ذریعہ سماجی اور تہذیبی عوامل کو اہمیت دی آپس محبت کی ترغیب، ہمت اور محبت سے کام کرنے کا جذبہ صبر واستقلال وغیرہ کا براہِ راست اظہار کیا۔

بد کی صحبت میں مت بیٹھو اس کا ہے انجام بُرا
بد نہ بنے تو یہ کہلائے بد اچھا بد نام بُرا
راستی سیدھی سڑک ہے جس میں کچھ کھٹکا نہیں
کوئی رہرو آج تک اس راہ میں بھٹکا نہیں[2]

اسماعیل میرٹھی نے اپنی طویل نظم "جریدہ عبرت" میں سماجی محرکات کو بیان کیا ہے اور ذیلی عنوانات کے ذریعہ اظہار خیال کیا ہے۔

۱۔ محرم کے اجتماع پر کھیلے جانے والی پھری گنگا کا بیان (عنوان نہیں ہے)
۲۔ شاعر ۳۔ نمونہ غزل ۴۔ فلسفی علماء ۵۔ معلم ۶۔ طبیب
۷۔ دنیا پرست دیندار ۸۔ مشائخ ۹۔ عوام ۱۰۔ انگریزی فیشن والے

۱۔ محمد حُسین آزاد زمستان

۲۔ تمہید امداد امام اثر۔ کاشف الحقائق ص ۱۰۰

تمام عنوانات سماجی نکتہ نظر سے اہم ہیں اور ہر ایک کا رول سماج کی فلاح و بہبود کے لئے ضروری ہے لیکن سماج کے ہی ذمہ داروں نے سماج کے فرائض سے کس طرح کنارہ کشی کی ہے اس بات کو نظم میں بیان کیا گیا ہے اگر اس دور کی شاعری کو قومی شاعری کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ کیونکہ اس عہد میں قوم پروری حب الوطنی، آزادی اور خود کے لئے خود مختار ریاست کی مانگ بڑھنے لگی تھی۔

بقول علی جواد زیدی

''قومی شاعری کی تاریخ قومی شعور کی بیداری کی تاریخ ہے قوم پروری' وطنیت یا نیشنلزم کا تصور نیشن اسٹیٹ (قومی ریاست) کے تصور سے جڑا ہوا ہے۔''[۱]

تاریخ کے صفحات کی ورق گردانی کرنے سے یہہ بات ثابت ہوجاتی ہے کہ شاعروں اور ادیبوں نے ہمیشہ ہی ظلم وستم اور بیرونی حملہ آوروں کے خلاف آواز بلند کی اور اپنی تخلیقات کے ذریعہ عوام کو آگاہ کرتے رہے۔ نیز عوامی جذبات کی ترجمانی کرنے والا ادب تخلیق کیا۔

۱۸۵۷ء سے ۱۹۱۷ء تک جو ادبی سرمایہ ہے اس میں جدید نظم نگاری کو بھی اہمیت حاصل ہے کیونکہ غدر کے بعد جیسے جیسے انگریزی حکومت کا زور بڑھتا گیا اُسی طرح ان کے حوصلے بلند ہوتے گئے۔ جکڑتا گیا۔ یوروپی سامراج ہندوستانی حکمرانوں سے اقتدار چھنتا رہا۔ اُسی وقت سے ہندوستانیوں کے دلوں میں ایک شدید احساس محرومی اور ڈگمگاتے ہوئے اقتدار کو سنبھالنے کی شدید آرزو بھی پیدا ہوتی گئی جب عوام سے ان کے روزمرہ کے معمولات چھین لئے جاتے ہیں اور ان کے لئے عرصہ حیات تنگ کردی جاتی ہے تو عوام اپنے حقوق کے لئے باغی بن جاتے ہیں غدر کے بعد حالات اسی طرح کے تھے انگریز قوم تجارت کے بہانے اپنا اقتدار بڑھا رہی تھی۔ یوروپی سرمایہ دار ہندوستانی تاجروں، پیشہ وروں اور مزدوروں کی حق تلفی کررہا تھا۔ ساتھ ہی ہندوستانی صنعتوں کو مٹا رہا تھا۔ اور عوام روزی روٹی کیلئے ترس رہے تھے۔

ایسے میں سماجی اصلاح کی تحریکیں چل پڑیں۔ راجا رام موہن رائے اور سرسیّد احمد خان جیسے لوگوں نے سماجی بیداری کا کام کیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ شاعری کے ذریعہ حالیؔ، آزاد، اسمٰعیل میرٹھی، اکبر آبادی وغیرہ نے اصلاحی نظمیں لکھیں۔ انہی شاعروں میں پنڈت دتاتریہ کیفی، لال

۱۔ علی جواد زیدی۔ ہماری قومی شاعری ص ۳۰

چند فلک اور پنڈت نظر سوہانوی وغیرہ بھی شامل ہیں۔ ایک اور بات جو اس زمانے میں منظرِ عام پر آئی وہ تھی عیسائی مشنریوں کی انگریزی تعلیم کے لئے جدو جہد کرنا۔ انگریزی تعلیم کی وجہ سے ہی نئے تصورات نئے خیالات اور غور و فکر میں وسعت در آئی۔ ہندوستانی باشعور طبقہ نے بھی انگریزی تعلیم کی حمایت کی یہاں تک کہ ندوۃ العلماء جیسے عربی ادارے نے بھی انگریزی تعلیم کے حصول کے لئے کوششیں کیں۔ اکرام بلگرامی کی نظم ''اصلاحِ تعلیم عربی'' اس کی مثال ہے انہیں کی دوسری نظم مربع بند اور شیفتہ کشوری کی نظم ''شکایت گردش ایام'' میں احیائے وراثت اور اصلاح دونوں دھاروں سے متعلق افکار کی نمائندگی کی گئی۔ برج موہن دتاتریہ کیفی کی طویل نظم ''بھارت درپن'' اور لال فلک کی ''مسدس فلک'' میں ابھرتے ہوئے خیالات و جذبات اصلاحِ قوم کی نمائندہ نظمیں ہیں۔ سماجی اصلاحوں میں عورتوں کی تعلیم کم سنی کی شادی کا خاتمہ بیواؤں کی دوسری شادی وغیرہ موضوعات پر زور دیا گیا۔ جو سماج کے لئے ایک نیک شگون تھا۔

اصلاحِ تعلیم کے مسئلے میں بھی نئی بیداری کے آثار آرام کے یہاں نمایاں ہیں۔

علم ادیان میں جو فضل خدا سے کامل ماورا ان کے ہوں ہر علم کے عالم فاضل
جس سے ہر عہد کا ممتاز ہو ان کو حاصل پارلیمنٹ میں بھی جا کے وہ اب ہوں داخل
حالِ دنیا میں یہ ہو اور عقبیٰ میں خوشحال
ساتھ حوروں کے پھریں باغِ جناں میں خوشحال

یا یہ بند............

قوم میں سب قوموں سے علم میں ہو انتخاب
صفحہ دنیا پہ کوئی نہ ہو اس کا جواب
ہے ابھی یہ انقلاب اور ہو پھر انقلاب
مجلسِ تعلیم ہو یارِ خدا کامیاب
اس تدبیر کا خلق میں ہو اشتہار

غرض یہ کہ ہندوستان میں تعلیم حاصل کرنے کا رجحان بڑھ رہا تھا۔ ادھر انگریز حکمران ہندوستانی سماج پر مختلف قسم کے ظلم ڈھا رہا تھا۔ نئے نئے ٹیکسوں کے ذریعہ لوٹ کھسوٹ جاری تھی۔ اس کے خلاف دوارکا پرشاد افق نے ۱۸۹۴ء کے قریب برطانوی حکومت کے لگائے ٹکسوں

کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی یہ ٹیکس سواریوں، نوکری، بیوپار، گھر، غلہ اور پانی پر لگائے گئے تھے۔ انہی دنوں تعلیم یافتہ بیروزگاری نے بھی سر اٹھایا۔ اعلیٰ نوکریاں صرف انگریزوں کے لئے وقف تھیں اور ہندوستانیوں کے لئے بقول افق

زیادتی سے ہے اب نوکری کہاں باقی　　جو باقی ہے تو وکالت کا امتحان باقی

اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وکیلوں کی بھرمار ہوگئی۔ اس کا نقشہ بھی اپنی نظم میں افق نے اس طرح کھینچا ہے

سو اس میں ہے یہ خرابی وکیل تو ہیں ہزار　　موکل آگئے گر بھولے بھٹکے دو یا چار
وکیل دس جو ہوئے ساتھ بیس ہوئے افتخار　　چھڑانا کپڑوں کا ان کو غرض ہوا دشوار

اس عہدے کی بھی کچھ اب قدر و منزلت نہ رہی
وہ فائدہ نہ رہا اور وہ منفعت نہ رہی

ہوئے ہیں ایسے بھی مختار اکثر اور وکیل　　ذلیل (ز) سے جو لکھتے ہیں ص سے سبیل
ثبوت 'س' سے لکھتے ہیں اور ت سے طویل　　سکوت 'ث' سے لکھا کرتے ہیں الف عدیل

سوال جرح کریں ایسے ضرر جن سے
فگارانِ سے موکل کا ہو جگر جن سے

انیسویں صدی میں مذکورہ تمام مسائل اور حالات نے سماج کو اپنے تابع کر دیا تھا بیسویں صدی کا زمانہ اور اس دور میں سماجی حالت اور مسائل کو اُردو نظم میں سمو گیا۔

☆ بیسویں صدی کا آغاز

۱۸۵۷ء سے ۱۹۰۰ء تک اُردو نظم نگاری میں پختگی اور بالیدگی آنی شروع ہوگئی تھی اور اس کے بعد اُردو نظم نگاروں میں حساس اور ہوشمندی سے کام لینے والے شعراء کا گروہ متعارف ہوتا ہے۔ انیسویں صدی کے اختتام پر جن لوگوں نے آزادی اور اصطلاح کی مہم چلائی تھی۔ ان میں ظفرؔ، اخترؔ، اشرفؔ اور عیشؔ کے علاوہ سبھی شعراء بہ قید حیات تھے۔ لیکن دوسرے دور کے آغاز سے پہلے حالیؔ، شبلیؔ اور افقؔ دارِ فانی سے کوچ کر گئے تھے۔ اب ایک نئے باب کا آغاز ہوتا ہے۔ انگریزی تعلیم نے ہندوستانی سماج میں بیداری کی لہر پیدا کر دی تھی اور ۱۸۸۵ء میں

انڈین نیشنل کانگریس کے قیام سے ہندوستانی عوام نے انگریزی حکومت سے مطالبات کرنے شروع کردیئے تھے۔ اس دور میں جو نظمیں لکھی گئیں ان نظموں کے خالق بیشتر شعراء وہ ہیں جنھوں نے قومی بیداری اور جذباتی بے چینی کو اپنی تخلیقات میں جگہ دی۔ ایسے شاعروں میں نادر کا کوروی کا نام سب سے نمایاں ہے۔ انہوں نے بیسویں صدی کے آغاز میں پنپنے والی جدید شاعری کو نئی سمت دینے کی سعی کی۔

سماج کا نقشہ اپنی نظم ''دھرتی ماتا'' میں پیش کیا۔ جو انہوں نے ۱۹۰۴ء میں لکھی۔ انگریزی حکومت کی چالبازی اور سماج کو لڑانے کا ذکر اس نظم میں ملتا ہے۔

اب جو میں نے ہوش سنبھالا — خود سے خود کو دیکھا بھالا
کُھل گئی تیری ظاہر داری — دھوکہ بازی اور مکاری
آخر تو نے گرا کر چھوڑا — خاک میں مجھ کو ملا کر چھوڑا
اے مرے جھوٹے وعدوں والی — چکنی چپڑی باتوں والی
جھگڑے پیدا کرنے والی — فتنے برپا کرنے والی
لڑوا دنیا کام ہے تیرا — ڈس بھرا بسوا نام ہے تیرا
تیری ذات کا سارا جھگڑا — آئے دن کا خون خرابا[1]

نادر ہی کی شاعری کے مطالعہ سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ غریبوں اور بے کسوں کے بارے میں قوم وملت کا امتیاز نہیں ہونا چاہیئے اور آفت کے ماروں سے تعصب برتنا ناروا ہے کیونکہ جمہوری کا نظام دستک دے رہا ہے۔

نگاہیں پڑ رہی ہیں آج کل اس داب بیجا پر — وجہ کیا ہے رعایا کی حکومت ہو رعایا پر
خبر بھی ہے تجھے کیا عام راہوں کا خلاصہ ہے — کہ اس نظم ونسق سے انتظام جیل اچھا ہے
لگادے ایک ہی قیمت میں بلور اور پتھر کو — بٹھا دے ایک مسند پر محتاج اور تونگر کو
رہے بس سلطنت نگراں حیات بامشقت کی — وہی مالک رہے ساری زراعت اور تجارت کی
کرے املاک سب ضبط تا عادت ہو محنت کی — رعایا کے لئے حاجت ہی کیا ہے مال و دولت کی
لباس موسمی ملتا رہے ہر ایک کو ششماہی — کرے تقسیم دونوں وقت کھانا مطبخ شاہی

۱۔ آرام دھرتی ماتا بحوالہ ہمارا ہندوستان مرتبہ جان نثار اختر ص ۴۳۔۱

ادھر تیار ہو کر مال جائے غیر ملکوں میں ادھر توڑے کے توڑے آئیں لدلد کے جہازوں میں
چلے جب کاروبار ملک اس خوش انتظامی سے تو بچ جائے رعایا ہم رعایا کی غلامی ہے
مگر اس وقت شاعر آہ کس مد میں آئیں تھے قصیدے کس کے لکھیں گے کسے جا کے سنائیں گے[1]

اس عہد میں ہندوستانی عوام کو ہر طرح سے لوٹا جا رہا تھا۔ ہر طرف مایوسی، ناکامی اور محرومی کا راج تھا اس دور کی عکاسی بھی نادر کے کلام میں ملتی ہے۔

انڈین نیشنل کانگریس کے قیام سے ہندوستانی عوام کے مطالبات حکومتِ وقت تک پہنچائے جا رہے تھے۔ کیونکہ اس میں تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کی تعداد زیادہ تھی۔ اور اس زمانے میں ملک کے مختلف گوشوں سے قومیت کا احساس انگڑائیاں لے رہا تھا۔ اور حکومت سے مطالبات منوانے میں کامیاب بھی ہو رہا تھا۔ پریس ایکٹ کی وجہ سے بھی اخبارات سنبھل سنبھل کر ہندوستانی سماج کے حقوق کے لئے آواز اٹھا رہے تھے ایسے وقت میں مسلمانوں کا غصہ ٹھنڈا پڑا اور انہوں نے اپنے پلیٹ فارموں کی تشکیل شروع کردی۔

نواب عبداللطیف خاں نے ۱۸۸۲ء میں ممڈن لٹریری سوسائٹی قائم کرلی، جسٹس حیدر علی بھی سینٹرل ممڈن نیشنل اسوسی ایشن قائم کی۔ اس کے مقاصد مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لئے کام کرنا تھا۔ سرسیّد احمد خاں نے بھی برٹش انڈین اسوسی ایشن قائم کی۔ اس زمانے میں میونسپل کونسل اور ڈسٹرکٹ کونسل کا قیام عمل میں لایا گیا۔ ان اداروں میں انتخابات مخلوط اور براہ راست ہوتے تھے۔ مخلوطہ انتخاب میں اقلیتوں کے لئے کامیابی کے امکانات کم ہوتے تھے۔ اس کے خلاف سرسیّد احمد خاں نے آواز اٹھائی ان کا خیال تھا کہ:۔

> ''جب تک قوم مذہب کے اختلافات اور ذاتوں کا امتیاز ہندوستان کے سوشل اور پولیٹیکل حالت میں جزو اعظم رہے گا۔ ان معاملات میں جو ملک کے انتظام اور بہبود سے بیشتر متعلق ہیں۔ ان کے باشندوں پر اثر ڈالے گا اس وقت تک الیکشن کا خالص قاعدہ طمانیت کے ساتھ جاری نہیں کیا جاسکتا ہے۔ بڑی قوم چھوٹی قوم کے مطالب پر بالکل غالب آجائے گی۔''[2]

ہندوستان میں بے چینی کی لہر دوڑ رہی تھی اور اس کا احساس حساس انگریزوں کو بھی

۱۔ ایضاً
۲۔ خطبات سرسیّد احمد خاں (جلد اوّل) صفحہ نمبر ۱۴۱ تا ۱۴۲

تھا۔ چنانچہ منرو نے یہ وضاحت کی کہ:

"پہلے بھی غیر ملکی فاتح آچکے ہیں لیکن کسی نے بھی نہ تو ہندوستانیوں سے ایسی دلی نفرت کا اظہار کیا تھا اور نہ پوری قوم کو نا قابلِ اعتبار قرار دے دیا تھا۔" [1]

انڈین نیشنل کانگریس کا قیام اور مسلمانوں میں مختلف اداروں کے قیام سے دونوں قومیں ایک دوسرے کے قریب آنے لگیں انگریزوں کو اس سے خطرہ محسوس ہوا اور اب انھوں نے پھوٹ ڈالو اور ا۔

حکومت کرو کی پالیسی اپنائی۔ اسی کے تحت ۱۹۰۵ء میں بنگال کی تقسیم کا واقعہ پیش آیا۔ جس کے خلاف بغاوت کی آگ بھڑک اٹھی۔ ہڑتالیں ہوگئیں۔ جگہ جگہ جلسے ہوئے ہندو مسلم جوق در جوق ان جلسوں میں شریک ہوئے قومی یک جہتی اور جذباتی ہم آہنگی کے اس جوش و خروش سے سامراجیوں کا سنگھاسن ڈالنے لگا۔ حکومت نے کانگریسی رہنماؤں کو گرفتار کرلیا۔

اُردو شعراء نے سامراجی حکومت کے ان اقدامات کی سخت مخالفت کی۔ سرور جہاں آبادی نے بنگال کو مخاطب کرتے ہوئے نظم لکھی۔

ملک گیر احتجاج کی وجہ سے تقسیم بنگال کا منصوبہ منسوخ کر دیا گیا۔ اور اس کے بعد کانگریس کے اجلاسوں میں سوراج، سودیشی اور بائیکاٹ اہم پروگرام بن گئے ان تمام تحریکوں نے غلامی کے احساس کو اجاگر کیا اور آزادی کے لئے جدوجہد کرنے کے لئے اُکسایا۔ قومی ہمدردی کے اس جذبے کو بھی اُردو شعراء نے اپنی نظموں کا موضوع بنایا۔ ان میں لال چند فلک، امام الدین خان راقب، تلوک چند محروم وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

ہندوستان کی جدوجہد کی تاریخ دراصل سماج میں بدلتے ہوئے فکر و میلانات کی عکاسی ہے۔ کانگریس کے ساتھ ساتھ مسلم لیگ نے بھی اپنے وجود سے مسلمانوں کے مسائل کا اعادہ کیا اور انگریزوں کے خلاف تحریکیں چلائیں یہ دونوں سیاسی جماعتیں علیحدہ علیحدہ سوچ ضرور رکھتی تھیں۔

لیکن حصول آزادی کے لئے ایک دوسرے کو مدد بھی کرتی تھیں۔ لیکن اقتدار کی رسہ کشی میں آخر کار ہندوستان تقسیم ہوگیا اور دو ملک وجود میں آئے جو برصغیر کی تاریخ کا المیہ بھی کہا جاسکتا ہے۔

۱۔ مہاتما گاندھی بی آر آنند مترجمہ علی جواد زیدی ص ۱۵۰

☆ پہلی جنگ عظیم اوراس کے اثرات :

پہلی جنگ عظیم یوروپ میں برطانیہ اوراس کے اتحادیوں نے ترکی پر یلغار کی خلافت عثمانیہ پر چاروں طرف سے فوجیں ٹوٹ پڑیں۔ یوروپی ممالک اس کے حصے بخرے کرنے پر کمربستہ ہوگئے۔ اٹلی نے لیبیاء پر ۱۹۱۲ء میں حملہ کردیا۔ اور اُسے قبضہ میں لے لیا۔ بلقان کی ریاستیں خلافت سے کٹ کر آزاد ہوگئیں۔ اٹلی کے بادشاہ نے اعلان کیا کہ ہمارے ہوائی جہاز مسلمانوں کے کعبہ سے بھی نمٹ سکتے ہیں۔

اس دھمکی کی وجہ سے برصغیر کے مسلمانوں کے دلوں میں زبردست ہیجان پیدا ہوگیا۔ شبلی نے اپنے اشعار میں اس اضطراب کی جھلک پیش کی ہے۔

کہیں اڑ کر یہ دامانِ حرم کو بھی نہ چھو آئے
غبارِ کفر کی یہ بے محابا شوخیاں کب تک
حرم کی سمت بھی صد افکنوں کی جب نگاہیں ہیں
تو پھر سمجھو کہ مرغانِ حرم کے آشیاں کب تک
جو ہجرت کرکے بھی جائیں تو شبلی اب کہاں جائیں
کہ اب امن و اماں شام و نجد و قیرواں کب تک

حکومت ترکی کے کمزور پڑتے ہی کعبہ کی حفاظت اور سلامتی کے لئے لکھنو میں مولانا عبدالباری فرنگی محل کی صدارت میں انجمن خدام کعبہ کی بنیاد رکھی گئی۔ یہ غیر سیاسی تنظیم تھی لیکن انگریزوں کی مخالف تھی پہلی جنگ عظیم کے نتیجہ میں مسلمانوں اور ہندوؤں میں زبردست اتحاد وجود میں آیا اور قومیت کے احساس کو فروغ حاصل ہوا۔

☆ تحریک خلافت:

پہلی جنگِ عظیم کے موقع پر یوروپی قوموں نے ترکی کے اقتدار کو کمزور کردیا۔ علاقے چھین لئے اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کئی ملک جو خلافت کے رشتے سے بندھے تھے۔ وہاں بغاوت کی آگ بھڑکانے کی کوشش کی جانے لگی ہندوستان کے مسلمانوں میں بھی اضطراف کی کیفیت پیدا

ہوگئی۔ جگہ جگہ احتجاجی جلسے ہونے طرابلس اور بلقان کی جنگوں میں مسلمان شہیدوں کے لئے غم و الم کا اظہار کیا جانے لگا۔ اور انگریزی حکومت سے مقامات مقدسہ عرب، بیت المقدس، فلسطین اور بغداد و نجف وغیرہ کو خلیفہ کے زیر نگین رکھا جائے۔ اس کے لئے آل انڈیا مسلم کانفرنس کے عنوان سے ۱۸/ستمبر 1919ء کو لکھنو میں جلسہ منعقد ہوا جس میں ملک کے گوشے گوشے سے ہر طبقہ کے علماء شریک ہوئے۔

تحریک خلاف کی وجہ سے ہندو مسلم اتحاد کی راہ ہموار ہوئی بقول قاضی عدیل عباسی

"ہر باشندہ ملک نے خودداری و خود اعتمادی کی فضاء میں اپنے کو ہندوستانی کہنے پر شرم نہ کرنا دریافت کیا۔ تحریک خلافتِ ایک مشعل تھی جس نے ہندوستان کے ضمیر کو روشن کیا۔ اور اس اجالے میں اس نے اپنے آپ کو دیکھا اور پالیا۔"

تحریک خلافت ہندوستانی عوام کی سماجی زندگی کو پوری طرح متاثر کر رہی تھی کیا ہندو کیا مسلمان سبھی نے اس تحریک میں حصہ لیا۔ اور قومی یکجہتی کا مظاہرہ کیا۔ سماج میں سبھی طبقہ کے لوگ ایک سوچ اور فکر کو اپنائے ہوئے تھے۔

گاندھی جی کے ساتھ ساتھ پنڈت موتی لال نہرو، سی۔ آر۔ داس پپن چندر پال، لالہ لجپت رائے، برج موہن دتاتریہ کیفی وغیرہ نے خلافت تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ مسلمانوں کے سیاسی رہنماؤں میں حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر مختار انصاری، مولانا ابوالکلام آزاد، شوکت علی، محمد علی جوہر، حسرت موہانی جیسے شعراء نے سماجی نکتہ نظر سے اپنے خیالات پیش کرنے میں کامیابی حاصل کی کہا جاسکتا ہے کہ ہندوستانی سماج کے پیشِ نظر تمام قومیں ایک جسم ایک روح جیسی ہوگئیں۔

اُردو ادب پر بھی اس تحریک کے اثرات مرتب ہوئے۔ لیکن لاکھ جتن کے باوجود خلافت تحریک کامیاب نہ ہوسکی۔ اور آہستہ آہستہ وہ دم توڑنے لگی۔ لیکن جو لیڈر شپ اس دوران ابھری اس نے اپنے آپ کو مختلف اصلاحی کاموں میں لگالیا۔ اس تحریک کا سب سے اہم اثر یہ ہوا کہ ہندوستانیوں کے دل سے انگریزوں کا خوف ختم ہوگیا۔ اور خود کو انگریزوں کی مرعوبیت سے باہر نکالنے کے لئے عوام پر تولنے لگا اور گاندھی جی کی قیادت میں حب الوطنی کے جذبہ سے سرشار ہوکر عزم و ہمت اور استقلال کے ساتھ سرفروشی کے لئے کمر کس لی۔

عوام میں ایک قسم کی بے چینی اور عدم اعتماد کی فضاء پروان چڑھنے لگی۔ سودیشی مال کو

اپنانے اور ودیشی مال کا بائیکاٹ کرنے کا چلن عام ہو گیا تھا۔ اسی دوران بیسویں صدی کے اہم مجاہد جمال الدین افغانی کی تحریک نے ہندوستان میں اتحاد پیدا کرنے میں اہم رول ادا کیا۔ اور پان اسلامیزم کی تحریک شروع ہوئی۔ ابوالکلام آزاد، محمد علی جوہر نے اپنے اپنے اخبارات کے ذریعہ اتحاد اسلامی کے تصور کو عام لوگوں کی زندگی میں داخل کیا اور برطانوی استعمار کی بنیادوں کو ہلا کر دکھ دیا۔

قومی تحریکوں کے دانشوروں کی دلی خواہش یہ تھی کہ آزاد ہندوستان میں جو جدید ہندوستانی سماج وجود میں آئے وہ عالمی تہذیب کا حصّہ ہو۔ عالمی تہذیب کا یہ ڈھانچہ سیکولر اور سائنسی انداز جمہوری

اور اشتراکی طرزِ زندگی کا نصب العین ہو۔ اسی دوران ۱۹۱۷ء میں روس اور لینن کی قیادت میں انقلاب آیا۔ کارل مارکس کے اشتراکی نظریات کی روشنی میں مزدوروں اور کسانوں کی ہمدرد حکومت قائم ہوئی اس تحریک کا اثر ہندوستانی سماج پر بھی پڑا۔ پنڈت نہرو، علامہ اقبال، اور حسرت موہانی جیسے دانشوروں نے اس انقلاب میں ترقی کی کرن کو محسوس کیا۔ انھیں یہ امید بندھی کہ شاید انسانیت کو ظلم و جبر سے نکال کر یہ تحریک آزادی اور خوشحالی لائے گی۔ اسی نقطہ نظر کو اقبال نے اپنی نظم میں بیان کیا۔

بند ملاحظہ ہو۔

قوموں کی روش سے مجھے ہوتا ہے یہ معلوم
بے سود نہیں روس کی یہ گرمیٔ گفتار
اندیشہ ہو شوخیٔ افکار پہ مجبور
فرسودہ طریقوں سے زمانہ ہوا بیزار [1]

دھیرے دھیرے ہندوستانی سماج میں مذہب سے دوری کا اندیشہ بڑھنے لگا۔ اور سماج کے مروجہ ڈھانچے میں شگاف پڑنے کے آثار نظر آنے لگے۔ ہندوستان کی دو بڑی قوموں نے اپنے اپنے تشخص کو برقرار رکھنے کے لئے سوجتن شروع کر دیئے۔ اکبر الہ آبادی نے دہلی دربار پر نظم لکھی۔

۱۔ قاضی عدیل عباسی۔ تحریک خلافت ص ۳

جو انگریزوں پر طنز بھی ہے اور سماج میں طبقاتی کشمکش کو ظاہر بھی کرتی ہے۔

ایک کا حصہ من سلوا

ایک کا حصہ تھوڑا حلوا

ایک کا حصہ بھیڑ و بلوا

میرا حصہ دور کا جلوہ

ساتھ ہی جمہوری طرزِ حکومت اور ہندوستان میں ہونے والے انتخابات کے پیش نظر اکبرالہ آبادی نے کچھ اس طرح طنز کیا ہے۔

ہر سمت مچی ہوئی ہے ہلچل
ہر در پہ شور ہے کہ چل چل
ٹم ٹم ہے کہ گاڑیاں یا موٹر
جس پر دیکھو لدے ہیں ووٹر

سماج میں بے چینی اور بے اطمینانی کی کیفیت پیدا ہو چکی تھیں اور آزادی کی مانگ کرنے والے رہنماؤں کو گرفتار کر کے جیلوں میں بند کیا جا رہا تھا ۱۹۱۴ء میں جب اینی بسنت گرفتار کر لی گئیں تو چکبست نے کچھ اس طرح نظم لکھی۔

قوم غافل نہیں مانا تیری غمخواری
زلزلہ ملک میں ہے تیری گرفتاری سے
آگ بھڑکی ہے تیری آہ کی چنگاری سے
خاک حاصل نہ ہوا تیرے دل آزاری سے

اُردو کے شعری سرمایہ کے مطالعہ سے بات سامنے آتی ہے کہ ہندوستان میں ترقی پسند تحریک نے سماجی سطح پر ہونے والی ناانصافیوں کے خلاف آواز بلند کی اس تحریک کے زیر اثر پروان چڑھنے والی شاعری ۱۹۳۵ء کے قریب منظر عام پر آئی۔ یہ وہ زمانہ ہے جب آزادی کی جنگ اپنے آخری مرحلے میں تھی۔ اس بے اطمینانی اور انقلابی دور میں فنکاروں نے ہندوستان کے سماجی اور معاشی مسائل کو اپنی نظموں کا موضوع بنایا اور لوگوں میں شعور اور سلیقہ پیدا کیا۔ ان شاعروں میں فیض احمد فیض، اخترالایمان، سردار جعفری، ساحر لدھیانوی، مخدوم محی الدین وغیرہ

نے سماجی نقطۂ نظر بیان کر کے اُردو نظموں کو عروج کی بلندیوں پر پہنچا دیا۔ ان تمام شعراء نے سماجی ناانصافی، ناہمواری، سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ مزدوروں، کسانوں اور دبے کچلے عوام کے جذبوں کو نظموں میں بیان کیا۔ ۱۹۴۷ء کے آتے آتے اُردو نظم کا یہ سرمایہ اس دور کی تمام تر سیاسی، سماجی، معاشی اور معاشرتی حالات کو بیان کرنے کے قابل ہو گیا۔ ترقی پسند شاعروں نے سماجی تبدیلیوں اور انسانی رشتوں کی خلیج کے ساتھ ساتھ اقدار کی شکست کے علاوہ اشتراکی نظریات اور جنس کو شعری ذریعہ اظہار بنا کر اُردو نظم کی شاعری میں موضوعات کی وسعت کو شامل کیا۔ بلاشبہ ترقی پسند اُردو شاعری مکمل طور پر سماج کے ہر رویہ کی عکاس اور نمائندہ قرار دی جا سکتی ہے۔
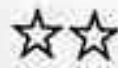
اختتامیہ

ہمارے زندگی میں جس مٹی کی خوشبو رچی بسی ہے۔ وہی خوشبو اُردو شاعری میں بھی نمایاں ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ اُردو شاعری خاص طور سے نظم میں ہماری عوامی زندگی تہذیب، معاشرت، جھلکیاں موجود ہیں۔ یہ بات تو سبھی مانتے ہیں کہ ہمارا نظام حیات معاشرتی اصول و ضوابط اور تہذیبی ورثہ کہیں نہ کہیں ہماری شاعری کو بھی متاثر کرتا رہا ہے اور شاعری بھی ہمارے نظام حیات پر اثر انداز ہوتی رہی ہے یہی بات ہے کہ ہماری شاعری میں انسانی قدروں کا اعلیٰ معیار بھی موجود ہے اور ادنیٰ معیار بھی۔

شاعر یا ادیب اپنے وقت کا نباض ہوتا ہے اُس میں سماج کے میلان کو اپنے باطن میں اتارنے کی صلاحیت موجود ہوتی ہے اس کے فن پارے تہذیب اور تمدن کی حدود کو چھوتے ہوئے محسوس کیے جاسکتے ہیں ٹی۔ ایس ایلیٹ نے کہا تھا کہ فنکار اپنے معاصرین کے مقابلے میں ایک اوائیلی انسان ہوتا ہے لیکن وہ ان سے زیادہ مذہب بھی ہوتا ہے اس لئے شعر وادب میں انسانی سماجی زندگی اور اس پر اثر انداز ہونے والے حادثات سانحات اور خوشی وغم کے لمحات کے ساتھ ساتھ تاریخی واقعات بھی سانس لیتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔

یوں تو نظم نگاری کی تاریخ قدیم ہے جن شعراء نے اپنی نظموں میں سماجی زندگی کو بیان کیا ان میں محمد قلی قطب شاہ سرفہرست ہیں۔ ان کی نظموں میں دکنی زندگی اور اس سے متعلق کئی موضوعات مل جاتے ہیں۔ خاص طور پر فطرت نگاری، تہوار، تہذیبی روایات، آداب عشق وغیرہ۔ اس طرح نظیر اکبرآبادی کی نظمیں دراصل خالص ہندوستانی سماج اور تہذیب وتمدن کی عکاس ہیں ۔ابتدائی زمانے میں اُن کی نظمیں ادبی حلقہ میں کمتر گردانی گئیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ عوامی

شاعری اور عوامی جذبوں کو اُن کی خواہشات اور تمناؤں کو نظیر نے اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ اور
سماجی زندگی کی عکاسی اپنی نظموں میں بیان کی۔

ادب اور سماج کا رشتہ چولی دامن کا ہے۔ شاعر یا ادیب اپنے دور کی پیداوار ہوتے
ہیں جو کچھ اپنے آس پاس ہوتا ہے اُس کا مشاہدہ ہی انھیں اپنی تخلیقات کا موضوع بنانے کا محرک
بنتا ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ ادب میں پورا سماج سانس لیتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ سماج میں ہونے والی
تبدیلیاں، تحریکات، سانحات، حادثات اور خوشی و غم کے لمحات کہیں نہ کہیں ادبی تخلیقات میں در
آتی ہیں ادب کا باریک بینی سے مطالعہ کریں تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ نظامِ جاگیرداریت نے
داستان اور مثنویوں کو جنم دیا کیوں کہ یہ اُس کی ضرورت تھی۔ وقت گذاری ایک بڑا مسئلہ تھا اور
تفریح کے وسائل انتہائی قلیل تھے اس لئے طویل داستانیں اور مثنویوں کی تخلیقات ناگزیر
تھیں۔ دھیرے دھیرے جاگیرداریت کا خاتمہ ہوتا گیا اور انگریزی علمداری کا سورج بڑھنے
لگا۔ ۱۸۵۷ء تک آتے آتے ہندوستان پر انگریزوں کا مکمل قبضہ ہوگیا۔ انگریزوں نے اپنی
حکومت کو استحکام بخشنے کے لئے کچھ اصلاحیں بھی کیں جن میں انگریزی تعلیم کا پھیلاؤ بھی شامل
ہے۔ انگریزی تعلیم کی وجہ سے نئے نئے خیالات ہندوستانیوں پر اثر انداز ہونے لگے۔ لیکن کچھ
لوگ انگریزی تعلیم کے مخالف بھی تھے۔

انگریزی تعلیم کی وجہ سے اُردو شعر و ادب بھی متاثر ہوئے بنا نہ رہ سکا۔ حالی اور آزاد
نے شاعری میں روائتی انداز . سے انحراف کرتے ہوئے نظم نگاری میں فطرت کی عکاسی کو
اپنایا۔ حقیقت کی سرزمین پر زندگی کے مسائل کو موضوع بنایا اور جدید نظم نگاری کی بنیاد ڈالی۔

اگر ہم ۱۸۵۷ء اور اُس کے بعد کے سیاسی، سماجی اور معاشی حالات کا جائزہ لیں تو یہ
بات سامنے آتی ہے کہ ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد ملک میں انارکی کا راج تھا جو صاحب وسائل سے
بے یار و مددگار ہوگئے جاگیریں چھن گئیں اقتدار سے بے دخل ہونے والے رئیس زادوں پر فاقہ
کشی کی نوبت آگئی۔ اس پر انگریزی حکمرانوں کے ظلم و ستم سے مسلمانوں پر مایوسی، بے بسی اور
بے اطمینانی چھا گئی ایسے پر آشوب وقت میں لوگوں نے یا تو مذہبی سایہ میں پناہ لی یا پھر قناعت
کرتے ہوئے تقدیر کا لکھا مان کر اکتفا کرلیا۔ انگریزوں کی نظر میں مسلمان سب سے بڑے گناہ
گار مانے گئے اور اُن پر حیات تنگ کردی گئیں۔

اس انتشار اور پُر آشوب دور میں اصلاح کی ضرورت تھی لوگوں میں خوداری اور خوداعتمادی پیدا کرنا اہم مسئلہ تھا اور اس مسئلہ کو حل کرنے کے لئے سر سیّد احمد خاں نے تعلیمی، ملی، سماجی اور ادبی میدان میں اصلاح کا کام کیا۔ اُنہی کی مرہون منت چند افراد نے خاص طور پر مسلمانوں میں شعور پیدا کرنے کی کوشش کی۔ تعلیم کی اہمیت کو اجاگر کیا انگریزوں سے راہ و رسم بڑھائی انگریزی تعلیم حاصل کرنے کی ترغیب دی۔ ان حالات میں انگریزی ادب اور اُردو ادب ایکدوسرے سے قریب آئے انگریزی ادب کے زیر اثر جدید نظم نگاری کو پروان چڑھنے کا موقع ملا حالی، شبلی، آزاد، اسمٰعیل میرٹھی جیسے شعراء نے اُردو نظم کے لئے راہ ہموار کی اسی ادبی تحریک کو اصلاحی شاعری نیچرل شاعری یا فطری شاعری کے نام سے پہچا جانے لگا۔

غزل جو اُردو شاعری کی مقبول ترین صنف تھی جس میں سوائے عشق و عاشقی کے کچھ نہ رہا تھا اُس سے پرہیز کرتے ہوئے زندگی میں روزہ مرہ کے مسائل اور سماجی، سیاسی، مذہبی، معاشی موضوعات پر نظمیں لکھی جانے لگی۔

کہا جاسکتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے حالات نے ہی اُردو نظم کے لئے ذہنی اور فکری ماحول سازی کے لئے موقع فراہم کیا۔ لوگ اب تعلیم کی اہمیت کو تسلیم کرنے لگے تھے۔ اور انگریزی تعلیم کے ذریعہ دنیا کے دیگر ممالک کے لوگ اُردو ادب سے واقف بھی ہو رہے تھے سماجی اصلاحیں عروج پر تھیں۔ برہمو سماج، آریہ سماج نے ہندوستانیوں میں نئے خیالات اپنانے اور اُن پر عمل پیرا ہونے کی تلقین کی جس کے نتیجہ میں ہندوستان میں بیداری کی ایک لہر اٹھی یہی وہ حالات تھے جس نے اُردو نظم کے پروان چڑھنے میں مدد کی۔

۱۸۵۷ء کے پُر آشوب دور نے سیاسی، سماجی اور معاشی حالات نے لوگوں کو اپنی فکر اور سوچ کو بدلنے پر مجبور کردیا۔ اب تو اسکے عاشق و معشوق کی ناز برداریاں اور مجنوں کے عشقیہ قصہ کے بجائے اپنی سماجی حالات، مسائل اور قدرتی عناصر و فطری موضوع کو اپنی شاعری میں جگہ دینے لگے۔ ادب ان تمام مسائل کے اظہار کا سب سے موثر ذریعہ صرف نظم نگاری ہی تھی۔

ہندوستانی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ اس ملک کی تاریخ بادشاہوں، شہنشاہوں اور امراء کے ساتھ نوابوں اور رئیسوں کی حکمرانی سے بھری پڑی ہیں۔ وقت اور حالات کے ساتھ ساتھ ان حکومتوں کے عروج و زوال کی داستانیں بھی زبان زد ہر عام و خاص

ہے۔ جیسے جیسے حالات بدلے سونچ اور فکر میں تبدیلی آتی گئی۔ نئے معاشرے اور مسائل نے عوام کو متاثر کیا۔ ۱۸۵۷ء تک آتے آتے ہندوستان کے سیاسی، سماجی اور ثقافتی حالات میں زمین و آسمان کا فرق آچکا تھا جنگ پلاسی سے شروع ہونے والی انگریزی حکمرانی مستحکم ہو چکی تھی۔ انیسویں صدی کے آغاز سے ملک کی سیاست زبان وادب کو متاثر کرنا شروع کر دیا تھا۔ تعلیمی اور سماجی انقلاب واصلاحی تحریکیں سر ابھار رہی تھیں سیاسی طور پر انگریزی حکومت کا غلبہ تھا انگریز حاکم ہندوستانی عوام پر طرح طرح کے مظالم ڈھا رہے تھے طاقت کے بل بوتے ایک کے بعد دیگرے دیسی ریاستوں کو انگریزی حکومت میں شامل کر رہے تھے یعنی ہندوستان آہستہ آہستہ غلامی کی زنجیروں میں جکڑتا جا رہا تھا اور عوام انگریزی حکومت کی غلام بنتی جا رہی تھیں سماج میں غلامانہ ذہنیت بھی پروان چڑھ رہی تھی کچھ خوددار لوگ اس غلامی سے نجات حاصل کرنے کے لئے پر تول رہے تھے ہر طرف ایک سیاسی، سماجی، اور معاشرتی بے چینی و بے اطمینانی کا دور دورہ تھا۔ اور انگریزی حکومت سے نجات پانے کے لئے سازشیں بھی ہو رہی تھی۔ انگریزوں نے پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو کی پالیسی اپنائی تھی۔

عوام کو حکومت وقت کے تئیں اپنائیت کا جذبہ فروغ پائے اس لئے کچھ اصلاحی کام بھی کئے جا رہے تھے سماج میں پھیلی ہوئی بری روایتوں کو ختم کر کے سماجی اور اصلاح کی کوشش کی گئی اس میں راجہ رام موہن رائے کی تحریک، سر سید تحریک، برہمو سماج کی تحریک سماج کو منظم کرنے اور نئے سماج کی بنیاد رکھنے کے لئے کی جا رہی تھیں۔

سیاسی آزادی کا جذبہ فروغ پا رہا تھا حب الوطنی اور قوم پرستی کے ساتھ ساتھ آزادی کے لئے سیاسی ماحول بھی گرم ہو چکا تھا۔ نسلی امتیازات کو دور کرنے کی جدوجہد جاری تھی باہمی اتفاق سماج میں امن چین قائم رکھنے کے لئے وقت کی اہم ضرورت تھی اس جذبہ کو فروغ دینے کی ہر ممکن کوشش جاری تھی ہندوستانی سماج کو خوشحال بنانے کے لئے سیاسی راستہ تلاش کیا جا رہا تھا اس میں کچھ انگریز بھی پیش پیش تھے چنانچہ اے۔ ہیوم نے انڈین نیشنل کانگریس کی بنیاد رکھی گئی اس سے قبل بھی برٹش انڈیا سوسائٹی ۱۸۴۳ء برٹش انڈیا اسوسی ایشن ۱۸۱۵ء بمبئی اسوسی ایشن ۱۸۵۰ء بنگال نیشنل لگی۔ سر وجنگ سبھا پونا، مہاجن سبھا مدراس وغیرہ اداروں کے ذریعہ سماجی ضرورتوں کے پیش نظر ارباب مجاز تک اپنی رائے یا خیالات پہنچانے تھے انڈین نشینل کانگریس کے قیام

کے بعد ہندوستانی سماج میں سیاسی بیداری اور آزادی کے لئے جدوجہد کا جذبہ آہستہ آہستہ ابھرنے لگا۔

مسلمانوں میں سر سید احمد خان نے سیاسی، تعلیمی، ادبی اور سماجی اصلاح کے لئے مسلم ویلفر ایجوکیشنل کانفرنس کے ذریعہ خدمات انجام دیں۔ شبلی اور حالی نے اُردو شعر و ادب کو فروغ دینے میں سر سیّد کا ساتھ دیا۔ اکبر آلہ آبادی نے طنز و مزاح کے ذریعہ شاعری میں ایک نئے طرز بیان کو اپنایا اور یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ انگریزی تمدن ہماری اخلاقی اور رومانی، مذہبی اور سماجی زندگی پر اثر انداز ہو رہا لیکن اسلامی تہذیب و تمدن اور مذہبی خیالات انگریزی سے بہتر ہیں۔

۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا جو مسلمانوں کے سیاسی و اقتصادی مسائل کے لئے حکومت وقت سے نمائندگی کرنے کا عزم لئے ہوئے تھی اس دور میں ہندوستانی سیاست اور فکر و نظر پر جن چیزوں نے اثر ڈالا۔ اُن میں ایک تحریک خلافت بھی ہے۔ انیسویں صدی کے آخر میں ترکی کے سلطان عبدالحمید نے پان اسلام ازم کی تحریک چلائی مقصد صرف شہنشائیت کی ٹمٹماتی ہوتی شمع کو بچانا ہی تھا لیکن اس مقصد میں انھیں کامیابی نہیں ملی ترکی نوجوان نے حکومت کا تختہ الٹ کر جمہوری حکومت کا سنگ بنیاد رکھا اور ترکی میں یہ تحریک ختم ہوگئی۔

۱۹۱۲ء میں اسی قسم کی تحریک خلافت کے عنوان سے ہندوستان میں شروع کی گئی لیکن اسی دوران پہلی عالمی جنگ چھڑ گئی اور سارا منظر بدل گیا۔ تحریک خلافت کا مقصد مذہب اور سیاست کو ساتھ ساتھ لے کر چلنا تھا۔ اور مسلمانوں کی گرتی ہوئی اقتصادی حالت اور مذہبی صلاحیت کو سدھارنا تھا ساتھ ہی ہندوستان سے باہر اسلامی حکومتوں کی ہمدردیاں حاصل کرنا تھا۔ ساتھ ہی ملک کو غیر ملکی حکومت کے مظالم سے سے چھڑانا اور مسلمانوں میں حب الوطنی اور جذبہ حریت و حمیت پیدا کرنا اور ملک کو آزاد کرانے کی جدوجہد میں کردار کا غازی بنانے کی کوشش کرنا بھی شامل تھا۔

اس تحریک میں کانگریس نے کندھا سے کندھا ملا کر ساتھ دیا۔ ہندو مسلم اتحاد کی بنیادیں مضبوط ہوئیں۔ ہندوستان کی آزادی کے لئے یہ راہ ہموار ہونے لگی۔ برطانوی حکومت کو محسوس ہونے لگا کہ اب صرف وعدوں کے سبز باغ دکھانے سے کام نہیں چل سکتا بلکہ کچھ عملی اقدامات بھی کرنے پڑیں گے چنانچہ ۱۹۱۸ء میں مانٹیگو چمسفورڈ نے اصلاحات کی تجویز پیش کی تعلیم کی

طرف مزید توجہ دینے، حکومت کے ذمہ دارانہ عہدوں پر زیادہ سے زیادہ ہندوستانی افسروں کو مقرر کرے پر زور دیا گیا اس سے سیاسی طور پر کچھ حالات بہتر ہونے کی اُمید پیدا ہوئی لیکن جلیان والا باغ کے سانحہ نے پھر سے سیاسی استحکام کو نقصان پہنچایا۔ اور آزادی کی لڑائی تیز ہوگئی گاندھی جی نے ستیہ گرہ کا طریقہ اپنایا اور سوراج کی مانگ کر ڈالی اسی دوران مزدور تحریکیں بھی زور پکڑنے لگی اور آہستہ آہستہ ہندوستان انگریزوں کے سیاسی تسلط سے آزادی حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔

۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک ہندوستانی سماج کا باریک بینی سے مطالعہ کیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ ہندوستان جو کہ دیہی ملک تھا اس کا سارا سماج زراعت اور کھیتی باڑی سے جڑی ہوئی چھوٹی چھوٹی صنعتیں جو گھریلو ہوا کرتی تھیں اس پر انحصار کیے ہوئے تھا چوں کہ سماج میں جاگیردار، زمینداروں کا سماجی رتبہ رکھنے والا امیر ترین طبقہ تھا کچھ لوگ سپاہی پیشہ ہوا کرتے اور ایک بڑا سماجی طبقہ کسانوں اور مزدوروں کا تھا۔ معاشی حالت بھی کچھ اچھی نہ تھی ہمیشہ مہاجنوں اور ساہوکاروں کے مقروض رہا کرتے تھے لیکن تعلیم کی اہمیت و افادیت جیسے جیسے بڑھنے لگی اس استحصال سے چھٹکارا حاصل کرنے میں لوگ کامیاب ہو رہے تھے اور سماج دھیرے دھیرے ترقی کی منزلیں طے کرتا ہوا آزادی کی سمت بڑھنے لگا تھا۔

اُردو نظم نگاری یوں تو نہایت قدیم ہے اور جب کبھی شاعری کا ذکر آتا ہے تو نظم کا لفظ یا اصطلاح زبان پر آجاتی ہے جن پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ شعر کے لئے اس اصطلاح کا استعمال زمانہ قدیم سے ہوتا چلا آرہا ہے۔ لیکن بعد میں ایک مخصوص صنف شاعری کے لئے اس کا استعمال کیا جانے لگا۔

نظم فارسی زبان سے اُردو میں آئی اس کے لغوی معنی پرونا، ضبط میں لانا وغیرہ ہیں مختلف لغات میں اس کے معنی واضح طور پر درج ہیں۔ نظم یہ لفظ عربی زبان کا ہے اُردو میں کلام موزوں کے لغوی مفہوم میں استعمال ہوتا ہے اس لفظ کو اُردو شاعری کی ایک صنف بنانے میں انگریزی ادب کا بڑا حصّہ ہے۔

انگریزی تعلیم سے یوروپی ادب اور ادیبوں و شاعروں کے خیالات سے اُردو والے متاثر ہوئے اور اُنھوں نے انگریزی نظموں کے ترجموں کے ذریعہ اس صنف کو رائج کرنے کی کوشش شروع کی انگریزی نظموں کے تراجم کی روایت نے ہی جدید اُردو نظم کو فروغ دینے میں

اہم رول ادا کیا۔

نظم کا فنی لحاظ سے مطالعہ کیا جائے تو اس میں خیال، لاشعوری محرکات اسلوب وغیرہ کو کافی اہمیت حاصل ہے دھیرے دھیرے نظم کا ارتقاء عمل میں آتا گیا۔ حالؔی، محمد حسین آزاد، چکبست، اسمٰعیل میرٹھی وغیرہ نے اسے بڑھاوا دیا۔ علامہ اقبال نے اُسے فن کی انتہائی بلندیوں پر پہونچا دیا اور پھر ترقی پسند تحریک نے نظم نگاری کے ذریعے عام انسانی خواہشوں اور اجتماعوں کو موضوع بنایا اس طرح نظم اپنا ایک اہم مقام بنانے میں کامیاب ہوئی۔ اُردو نظم اور اُس کے فن سے کہیں نہ کہیں اس بات کا اندازہ لگ جاتا ہے کہ اُس کے موضوعات خارجی زندگی کے مظاہر اور داخلی خواہشوں کا اظہار ہے۔ اُردو نظم نے جو موضوعات وراثت میں پائے اُن میں۔ مناظر فطرت کی عکاسی، نسائی معاشرے کے مسائل، فطری جذبے سے پیدا شدہ حالات زندگی، غلامی سے نجات پانے کے لئے آزادی کا جذبہ ہندوستانی شہروں کی عظمت، دیو مالائی شخصیتوں کی عظمت، رہنما اور عام انسانی مسائل، جس میں غریبی افلاس، بے روزگاری وغیرہ ایسے کئی موضوعات ہیں جس کو اُردو نظم نگاری کے دامن میں سمویا گیا۔ حالؔی سے لیکر اقبال تک اور اقبال سے آگے مجاز اختر شیرانی سے ہوتا ہوا یہ سلسلہ قاضی سلیم تک پہونچ جاتا ہے اور قبول عام کا درجہ حاصل کر کے مستقبل کے لئے نئے ہیئتی پیکر میں ڈھل کر لوگوں کے ذہین و دل پر نقش بن جاتا ہے۔

اُردو نظم نگاری کے موضوعات عام فہم، سماجی زندگی کے مسائل کا احاطہ کئے ہوئے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ انسان سماجی حیوان ہے۔ انسان اور سماج کی معنویت، اہمیت وافادیت مسلم ہے فرد سماج کا ایک حصّہ ہے اس کے احساسات، جذبات، ضروریات سبھی کچھ سماج ہی کے مرہون منت ہیں یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ آدمی سے انسان بننے کا سفر وہ سماج ہی میں طے کرتا ہے انسان کی زندگی اور اس کے وجود کی بقاء سب کچھ سماج ہی کے مرہون منت ہے ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک کی اُردو نظم نگاری کا سماجی نکتہ نظر سے مطالعہ کیا جائے تو ایک بات سامنے آتی ہے کہ غدر کے بعد جب حالات نارمل ہوئے قوم کے مدّبر دانشوروں نے سارے معاشرے کو بکھرا ہوا پایا۔ اب اُن کے لئے اس بکھرے ہوئے معاشرے کے تانے بانے کو سمیٹنا اور نئے سماجی نظام کی بنیاد ڈالنا ضروری تھا سر سیّد نے اس کا کو انجام دیا اور اصلاحی تحریک چلائی۔ اُردو شعر وادب کو بے سمتی سے نکال کر فنی نکات سے سنوارنے کے لئے ماحول سازگار بنایا

انگریزوں نے بھی نئی نئی تعلیمی پالیساں بنائی اور عوام کو یہ بتانے کی کوشش کی کہ وہ عوام کے ہمدرد ہیں ۔اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سماجی ترقی کے نئے راستے کھل گئے اُردو شعراء ادب کے ذریعہ ہندوستانی سماج کے اسی تصویر کو نظم میں بیان کیا جانے لگا نئے نئے موضوعات شاعری کے ذریعہ سامنے آنے لگے ۔خاص طور سے قدرتی مناظر کی عکاسی ، سیاسی ، معاشی ، اور معاشرتی زندگی کو نظم میں خوبصورتی سے بیان کیا جانے لگا ہندوستانی رسوم عقائد ، لباس ، وضع قطع وغیرہ نظموں کے ذریعہ عوام کے سامنے آنے لگے ۔جدو جہد آزادی کی تڑپ ملک اور قوم کے جذبہ آزادی کو بیدار کرنے والی نظمیں گونجنے لگی ۔

سماجی برائیوں کو دور کرنے کے لئے سماج میں پھیلی ہوئی غلط روائتیں ورسوم کو بھی اجاگر کیا جانے لگا اور ایک نئے سماج کی بنیاد رکھنے کے لئے اور جدید سائنسی اور تکنیکی باتوں کو بھی اُردو نظم میں بیان کیا جانے لگا ۔کہا جاسکتا ہے کہ اُردو نظم نگاری نے سماج کے اعلیٰ تہذیبی معیار کو اجاگر کرنے اور پروان چڑھانے میں اہم کردار ادا کیا ہے بلکہ یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ جدید اُردو نظم میں جدید ہندوستان کی سیاسی ، سماجی ، معاشی اور معاشرتی تاریخ نمایاں طور پر جھلک رہی ہیں ۔

☆☆

کتابیات

الف) اُردو شاعری کا مزاج — ڈاکٹر وزیر آغا
اُردو نظم پر یوروپی اثرات — حامدی کاشمیری
اُردو غزل کے پچاس سال — عندلیب شادانی
اُردو ادب کی ایک صدی — ڈاکٹر سیّد عبداللہ
المنجد — مرتبہ فرید بکڈپو
اُردو شاعری کا انتخاب — قادری محی الدین زور
اُردو ادب کی تاریخ — نسیم قریشی
اُردو ادب کی تاریخ — محمد حُسین آزاد
اُردو ادب کی تاریخ — رام بابو سکسینہ
ادب پارے — احتشام حُسین
اسٹیزا — آسکر وائلڈ
اردو شاعری پر ایک نظر — کلیم الدین احمد
اُردو میں نظم معریٰ اور آزاد نظم — حنیف کیفی
اُردو شاعری میں ہیت کے تجربے — عنوان چشتی
اُردو شاعری کا فنی ارتقاء — فرمان فتح پوری
اُردو گیت — بسم اللہ نیاز احمد

	ادب اور انقلاب	اختر حسین رائے پوری
	اُردو نظموں میں سیاسی رجحانات کی جھلکیاں	فوزیہ یاسمین
	انڈیا ڈیوائڈیڈ	ڈاکٹر راجندر پرشاد
	اُردو میں ترقی پسند ادبی تحریک	خلیل الرحمٰن اعظمی
	ادب کا سماجیاتی مطالعہ	ڈاکٹر محمد حسن
ب)	بیسویں صدی میں اُردو ادب	
ت)	تجربہ اور روایت	ڈاکٹر ابواللیث صدیقی
	تاریخ فلسفہ اور سیاست	پروفیسر مجیب
	تاریخ ادب اُردو	رام بابو سکسینہ
	تنقیدی جائزے	ڈاکٹر احتشام حسن
	ترقی پسند ادب	علی سردار جعفری
	تاریخ تمدنِ ہند	پروفیسر مجیب
پ)	پیروڈی انتخاب مقدمہ	مظہر احمد
ح)	حسرت کی غزل گوء	مختار حسین
	حیاتِ سرسیّد	نور الرحمٰن
	جدید اُردو شاعری	عبدالقادر سروری
	جدید اُردو نظم حالی سے میراجی تک	مظہر کوثری
	جدید شاعری	ڈاکٹر عبادت بریلوی
ش)	شہرِ آشوب آغاز ارتقاء اہمیت	ڈاکٹر سعداللہ
ک)	کاشف الحقائق	سیّد امداد اثر
ل)	لکھنو کے شعر و ادب کا معاشی و ثقافتی پس منظر	ڈاکٹر سیّد عبدالباری
	لٹریچر اینڈ کریٹیزم	ایچ کومس
م)	مجموعہ نظم حالی	مرتبہ ظہیر صدیقی
	مقدمہ شعر و شاعری	مرتبہ وحید قریشی

میری بہترین نظمیں — محمد حسن
مقالات اقبال — سیّد عبداللہ
مخدوم پانچواں مینار — امیر عارفی
ن) نظیر کی شاعری — مجنوں گورکھپوری
نظیر اکبرآبادی کی نظم نگاری — ڈاکٹر طلعت حُسین نقوی
ھ) ہسٹری آف فریڈم — ڈاکٹر تاراچند
ہماری شاعری — علی جواد زیدی
ہمارا ہندوستان — مرتبہ جاں نثار اختر
ہندوستانی مسلمان — ترجمہ ڈاکٹر صادق حُسین
ہندوستانی مسلمان — ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر

رسائل و جرائد

علی گڑھ میگزین	علی گڑھ
ادب اور نظریہ	دہلی
منزل	لکھنو
ہفت نما تماشا	بہار
مخزن	یو۔ پی
سوغات	بنگلور
سویرا	لاہور
ادبی دنیا	دہلی
شاعر	ممبئی
راشٹریہ سہارا	دہلی
قومی محاذ	اورنگ آباد
ہماری زبان	دہلی
ایوان اُردو	دہلی
عصرِ آگاہی	دہلی
سب رس	حیدرآباد

☆☆☆

AZAADI SE QABAL JADEED URDU NAZM KA SAMAJYATI MUTALEA

by

Prof. Dr. Mumtaz Jahan Siddiqui

ڈاکٹر ممتاز جہاں صدیقی گیانو پاسک کالج، پربھنی (مہاراشٹر) میں صدر شعبہ اُردو کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام دے رہی ہیں اُن کا تعلق مراٹھواڑہ کے ادبی مرکز، وؔلی اور سراؔج کی سرزمین اورنگ آباد سے ہے اُن کی تعلیم و تربیت میں اورنگ آباد کی ادبی تعلیمی اور ثقافتی روایت رچی بسی محسوس کی جاسکتی ہیں۔ انھوں مراٹھواڑہ یونیورسٹی اورنگ آباد سے ایم۔اے اُردو میں گولڈ میڈل حاصل کیا انھیں اس کامیابی پر مہاراشٹر اُردو اکیڈمی اور نہرو میموریل سوسائٹی نے انعامات سے سرفراز کیا۔ گذشتہ پچیس برسوں سے وہ اُردو زبان و ادب کی درس و تدریس سے منسلک ہے ہندوستان کی موقر یونیورسٹیز اور کالجیس کے نیشنل اور انٹرنیشنل سیمناروں میں وہ اپنے تحقیقی مقالے پیش کر کے داد و تحسین حاصل کر چکی ہیں۔

میری نظر میں ڈاکٹر ممتاز جہاں ایک سنجیدہ باوقار، پاکیزہ خیالات و اِسلامی روایتوں کی پاسدار خاتون ہے اُن کے ساتھ کام کرتے ہوئے میں نے انھیں اُردو زبان و ادب سے لگاؤ رکھنے اور اُردو کی ترقی و توسیع دینے کی تڑپ کو محسوس کیا۔ اُن کی مدد کے بناء کالج میں ادبی ماحول بنائے رکھنا ناممکن تھا ہماری رہنمائی میں 45 سے زائد طلبہ و طالبات نے نیٹ اُردو میں کامیابی حاصل کی 17 سے زائد طلبہ مختلف کالجیس میں اُردو لکچرار کی حیثیت سے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

ڈاکٹر ممتاز جہاں کو سوامی رامانند مراٹھواڑہ یونیورسٹی نے اُن کے مقالے آزادی سے قبل اُردو نظم کا سماجیاتی مطالعہ پر .Phd ڈگری تفویض کی اس کتاب میں موصوفہ کی تنقیدی بصیرت، زبان، اسلوب، موضوعات کو آسانی سے محسوس کیا جاسکتا ہے سماجی نکتہ نظر سے ادب کا مطالعہ گرچہ ایک منفرد موضوع ہے لیکن ممتاز جہاں نے اسے ایک نئے زاویہ سے پرکھنے کی کوشش کی ہے اس لحاظ سے اُن کا یہ کارنامہ لائق تحسین ہے اُمید ہے اُن کی یہ کوشش ادب میں قدر کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔

ڈاکٹر حمید اللہ خان
سابقہ صدر شعبہ اُردو، پربھنی

EDUCATIONAL
PUBLISHING HOUSE
www.ephbooks.com

978-93-86624-39-0